NAI ZINDAGI

ANNUAL NUMBER 1944

لکھنے والے

سید عبداللہ بریلوی
ڈاکٹر سید محمود
راجہ گوپال چاری
ڈاکٹر سید عبداللطیف
آرتھر مور
عبدالرحمٰن صدیقی
ہمایوں کبیر
ڈاکٹر رضی الدین صدیقی
ڈاکٹر تارا چند
طفیل احمد منگلوری
ڈاکٹر بینی پرشاد
محمد اجمل خاں
خواجہ احمد عباس
آصف فیضی
ڈاکٹر عبداللہ چغتائی
سوامی سہجانند
ڈاکٹر پی۔ ام جوشی
[illegible]
ڈاکٹر جعفر حسن
عزیز حسن بقائی
فراق گورکھپوری

Published at
ALLAHBAD
U P

208 Pages

Re

سالنامہ

نئی زندگی

نمبر ۱۰	مارچ سنہ ۱۹۴۴ء	جلد ۳

انیس الرحمٰن ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے سلیمی برقی پریس یحییٰ پور الہ آباد میں چھپوا کر دفتر رسالہ نئی زندگی سیلنٹری زیرہ روڈ الہ آباد سے شائع کیا

باب پہلا

موجودہ جمود کیسے دور ہو؟

سید عبداللہ بریلوی (کانگریس)

راجہ گوپال چاری

ڈاکٹر عبدالحمید قاضی (مسلم لیگ)

سجّاد ظہیر (کمیونسٹ پارٹی)

آرتھر مور (یوروپین گروپ)

اس جلاس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس متحدہ صوبوں کی وزارتوں سے مستعفی ہو گئی۔ اسی وقت سے یہ سیاسی تعطل شروع ہوا۔
[illegible] مسلم لیگ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہندو صوبوں میں اقلیتوں کی حفاظت کی خاطر گورنر اختیارات خصوصی کام
میں لائے [illegible] گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا فیڈرل حصہ ہمیشہ کے لئے حذف کر دیا جائے۔ لیکن جب کانگریس نے وزارتوں سے استعفیٰ دیکر
[illegible] مسلم لیگ کی طلب سرد کر دی اور اس دستور ساز اسمبلی کی مخالفت کے درمیان سے ہی پاکستان کا مطالبہ نکلا۔

اس درمیان میں کانگریس اور مسلم لیگ کے تعلقات پیچیدہ ہوتے گئے۔ کانگریسی وزارتوں کے استعفیٰ پر مسٹر جناح نے ملک سے
یوم نجات منانے کو کہا۔ اور مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ نے وہ تجویز پاس کر دی جسے پاکستان کی تجویز کہا جاتا ہے۔
مکمل طور پر ملک [illegible] دو قوم کے نظریہ کی مبلغ ہو گئی۔

سن ۱۹۴۰ء کے اگست کے مہینے میں وائسرائے نے ایک دوسری پیشکش (AUGUST OFFER) کی جس میں یہ
کہا گیا تھا کہ وائسرائے کی مجلس منتظمہ کے اراکین کی تعداد بڑھا دی جائے گی اور اس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندے لئے جائیں گے
لیکن اس پیشکش کو کانگریس نے ٹھکرا دیا اور مسلم لیگ نے بھی منظور نہ کیا۔ لیکن وائسرائے نے بہرحال ان جماعتوں کے علی الرغم اس
پیشکش کے تحت ایک منتظمہ بنالی جو اب تک چل رہی ہے۔ اور گویا اس طرح وائسرائے نے اپنے خیال میں اس جمود کا حل نکال لیا۔

لیکن ۱۹۴۲ء میں جب جاپانی برما تک بڑھتے ہوئے چلے آئے تو برطانوی کابینہ نے سنجیدگی سے ہندوستان سے مصالحت
کے متعلق سوچا اور سر اسٹیفورڈ کرپس کو ایک اعلان کے ساتھ بھیجا۔ کرپس کی تجاویز میں مستقبل کے متعلق جو مواعید تھے ان پر تو کانگریس نے
اعتماد کر لیا تھا لیکن جھگڑا فی الوقت اختیارات کے منتقل ہونے پر ہوا۔ کانگریس کا یہ مطالبہ تھا کہ دوران جنگ تک کے لئے وائسرائے کی منتظمہ ایک
کابینہ کی طرح کام کرے، جس میں ملک کی بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کے نمائندے شامل ہوں۔ اور وائسرائے اس کابینہ کے متفقہ فیصلوں
کے خلاف اپنا ویٹو استعمال نہ کرے۔ کانگریس نے یہ مان لیا تھا کہ کمانڈر انچیف کو رکن جنگ کی حیثیت سے اس کابینہ میں شامل کر لیا جائیگا
اور محاذ جنگ کے احکام آخری تصور کئے جائیں گے۔

لیکن حکومت نے اس شرط کو نہ مانا اور کرپس کا مشن ناکامیاب رہا۔ اس کے بعد کانگریس نے کچھ عرصہ انتظار کیا تاکہ حکومت
کے رویہ میں تبدیلی ہو لیکن جب ہر طرف سے مایوسی ہوگئی تو کانگریس نے ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو سول نافرمانی کی تجویز پاس کر دی۔ کانگریس
کے تمام سربرآوردہ اراکین جیلوں میں بند کر دئے گئے، اور سیاسی تعطل ختم ہونے اور قومی حکومت بننے کے امکانات ایک بڑی حد تک مسدود ہو گئے
۸ اگست سے پہلے ڈاکٹر سید عبد اللطیف نے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مصالحت کی کوششیں کیں لیکن ملک کی بدقسمتی
تھی کہ وہ بار آور نہ ہوئیں۔ بہرحال کانگریس کے بند ہو جانے کے بعد اس جمود کو حل کرنے کی تمام تر ذمہ داری مسلم لیگ کے کاندھوں پر آگئی،
لیکن مسلم لیگ نے اس قومی امانت کے بار کو محسوس نہ کیا، اور اس سلسلے میں کسی قسم کی کوئی پیش قدمی نہ کی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے پچھلے اجلاس میں کم از کم اتنا سہارا تو تھا کہ مسٹر محمد علی جناح نے گاندھی جی سے خط لکھنے کی خواہش
ظاہر کی تھی، لیکن اس سلسلے میں جو تلخ تجربہ ہوا اس کے بعد جناح صاحب نے اس سال کراچی کے اجلاس میں اس قسم کی بھی کوئی پیشکش
نہ کی، بلکہ کانگریس کے QUIT INDIA کے نعرے کی جگہ ایک عجیب و غریب نعرہ ــ یعنی DIVIDE AND QUIT وضع کیا گیا

آئینی تعطل سے یہ مراد لیتے ہیں کہ اس وقت ہندستان کے گیارہ صوبوں میں سے چھ صوبوں میں عوام کے نمائندے نہیں بلکہ گورنر حکومت کر رہے ہیں اور مرکز میں ایک غیر آئینی حکومت برسر اقتدار ہے۔

۱۹۳۵ء میں جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہوا تو اس کے بعد ہندستان کا ایک آئینی حل ہوگیا تھا۔ اس کے تحت صوبوں میں آئینی اور عوامی حکومتیں قائم ہوگئی تھیں۔ حکومت نے بعض مصالح کی بنا پر اس کا فیڈرل (مرکزی) حصہ کچھ عرصے تک ملتوی کر رکھا تھا اور فیڈرل اسکیم کی تیاریوں ہی میں مصروف تھے کہ جنگ چھڑ گئی۔

موجودہ جنگ کے چھڑتے ہی ہندستان کے دستور کا مسئلہ بھی از سر نو چھڑ گیا۔ برطانیہ نے اس جنگ میں ہندستان کی امداد چاہی اور ہندستانیوں نے قدرتی طور پر اس جنگ کے موقعے کو اپنے ملک کی آزادی و دستور سازی کے لئے استعمال کرنا چاہا۔ ہندستانیوں کے مطالبے کے دو پہلو زیر بحث آگئے۔ (۱) جنگ کے خاتمے پر ہندستان کا سیاسی درجہ کیا ہوگا اور (۲) فی الحال مرکزی حکومت میں ہندستانیوں کا کیا حصہ ہوگا۔

چنانچہ برطانوی مطالبات کے بھی یہی دو پہلو ہوئے (۱) جنگ کے بعد ہندستان کا جو آئین بنے گا اس میں اقلیتوں کا کیا حصہ ہوگا اور (۲) فی الحال ایک قومی حکومت کو جو اختیارات منتقل ہوں گے ان کی باہمی تقسیم کس طریقے پر ہوگی۔

ابتدا میں تو لارڈ زٹلینڈ نے فرمایا کہ ایسے وقت میں جبکہ برطانیہ ... اور دشواریوں میں مبتلا ہے ہندستانیوں کے یہ مطالبات شرافت سے بعید ہیں لیکن بعد میں وائسرائے نے ایک "مشاورتی گروہ" بنانے کا اعلان کیا جس میں مشورے کے لئے مختلف جماعتوں کے لیڈر لے لئے جائیں۔ اور ہندستان کے آئندہ دستور کے متعلق لارڈ ارون وائسرائے ہند کے ۱۹۲۹ء کے اس اعلان کا اعادہ کر دیا گیا جس میں ہندستان سے درجہ نوآبادیات کا وعدہ کیا گیا تھا۔ درجہ نوآبادیات ہندستان کو کب ملے گا یہ بات صاف نہ تھی لیکن یہ کہا گیا تھا کہ جنگ کے بعد ہندستان کے نمائندوں سے مشورہ کر کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں ترمیم و تنسیخ کر دی جائے گی۔

یعنی بالفاظ دیگر جنگ کے خاتمے کے بعد ایک گول میز کانفرنس کا وعدہ تھا۔

اس ... کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس ... صوبوں کی وزارتوں سے مستعفی ہوگئی ۔ ... اسی وقت سے یہ سیاسی تعطل شروع ہوا۔
... مسلم لیگ کا مقصد ... مطالبہ تھا کہ ... صوبوں میں اقلیتوں کی حفاظت کی خاطر گورنر اختیارات خصوصی بنام ... ہدایت نامہ ... کیا ... حذف کر دیا جائے۔ لیکن جب کانگریس نے وزارتوں سے استعفیٰ دیکر ... تحریک شروع کردی اور اس دستور ساز اسمبلی کی مخالفت کے درمیان سے ہی پاکستان کا مطالبہ نکلا۔

اس ... کانگریس اور مسلم لیگ کے تعلقات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ کانگریسی وزارتوں کے استعفے پر مسٹر جناح کے ... سے یوم نجات منایا گیا۔ اور ... مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ نے وہ تجویز پاس کردی جسے پاکستان کی تجویز کہا جاتا ہے۔
کھلم کھلا ملک ... دو قوم کے نظریہ کی تبلیغ ہونے لگی۔

سنہ ۱۹۴۰ء کے اگست کے مہینے میں وائسرائے نے ایک دوسری پیشکش (AUGUST OFFER) کی جس میں یہ ... گیا تھا کہ ... کی مجلس منتظمہ کے اراکین کی تعداد بڑھا دی جائے گی اور اس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندے لے لئے جائیں گے لیکن اس پیشکش کو کانگریس نے ٹھکرا دیا اور مسلم لیگ نے بھی منظور نہ کیا۔ لیکن وائسرائے نے بہرحال ان جماعتوں کے علی الرغم اس پیشکش کے تحت ... مجلس منتظمہ بنائی جو ... تک چل رہی ہے۔ اور گویا اس طرح وائسرائے نے اپنے خیال میں اس جمود کا حل نکال لیا۔

لیکن سنہ ۱۹۴۲ء میں جب جاپانی برما تک بڑھتے ہوئے چلے آئے تو برطانی کابینہ نے سنجیدگی سے ہندوستان سے مصالحت کے متعلق سوچا ... میور ڈ کرپس کو ایک اعلان کے ساتھ بھیجا۔ کرپس کی تجاویز میں مستقبل کے متعلق جو مواعید تھے ان پر تو کانگریس نے اعتماد کر لیا تھا لیکن جھگڑا ... الوقت اختیارات کے منتقل پر ہوا۔ کانگریس کا یہ مطالبہ تھا کہ دوران جنگ ... کے لئے وائسرائے کی منتظمہ کیبنٹ کی طرح کام کرے جس میں ملک کی بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کے نمائندے شامل ہوں۔ اور وائسرائے اس کابینہ کے متفقہ فیصلوں کے خلاف ... ویٹو استعمال نہ کرے۔ کانگریس نے یہ ... لیا تھا کہ کمانڈر انچیف کو رکن جنگ کی حیثیت سے اس کابینہ میں شامل کرلیا جائے گا اور ... ان کے احکام آخری تصور کئے جائیں گے۔

لیکن حکومت نے اس شرط کو نہ مانا اور کرپس کا مشن ناکامیاب رہا۔ اس کے بعد کانگریس نے کچھ عرصہ انتظار کیا تاکہ حکومت کے رویہ میں تبدیلی ہو لیکن جب ہر طرف سے مایوسی ہوگئی تو کانگریس نے ۸ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کو سول نافرمانی کی تجویز پاس کردی۔ کانگریس کے تمام سربرآوردہ اراکین جیلوں میں بند کر دئے گئے اور سیاسی تعطل ختم ہونے اور قومی حکومت بننے کے امکانات ایک بڑی حد تک مسدود ہوگئے۔

۸ اگست سے پہلے ڈاکٹر سید عبد اللطیف نے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مصالحت کی کوششیں کیں لیکن ملک کی بدقسمتی تھی کہ وہ بارآور نہ ہوئیں۔ بہرحال کانگریس کے بند ہوجانے کے بعد اس جمود کو حل کرنے کی تمام تر ذمہ داری مسلم لیگ کے کاندھوں پر آگئی، لیکن مسلم لیگ نے اس قومی امانت کے بار کو محسوس نہ کیا اور اس سلسلے میں کسی قسم کی کوئی پیش قدمی نہ کی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے پچھلے اجلاس میں کم از کم اتنا سہارا تو تھا کہ مسٹر محمد علی جناح نے گاندھی جی سے خط لکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی، لیکن اس سلسلے میں جو تلخ تجربہ ہوا اس کے بعد جناح صاحب نے اس سال کراچی کے اجلاس میں اس قسم کی بھی کوئی پیش کش نہ کی، بلکہ کانگریس کے QUIT INDIA کے نعرے کی جگہ ایک عجیب و غریب نعرہ ۔ یعنی DIVIDE AND QUIT وضع کیا گیا

یعنی ملک تقسیم کرنے کا کام قائد اعظم نے انگریزوں سے سپرد کر دیا۔ لیکن شاید ان کی مراد DIVIDE AND RULE تھی۔ مگر رجال جب [illegible] صاحب نے "موڈرن ایکل" کے نمائندے کو بیان دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ تقسیم کے بعد ایک جمہوری [illegible] [illegible] ظاہر ہے [illegible] میں ہو جائے۔

[illegible] سے یہ واضح ہو گیا کہ راجہ جی کی طرح کا کوئی آدمی ان [illegible] [illegible] انہیں کیسے [illegible] نے کہا کہ [illegible] مطلب ہے کہ [illegible] صاحب [illegible] کو تسلیم کر کے حکومت [illegible] ہوگا کہ کانگریس [illegible] حکومت [illegible]۔

بہرحال کسی بات کو سمجھ لینے کے پاکستان کی تجویز نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا [illegible] [illegible] آزادی کی [illegible] شاید پاکستان کو مان بھی لیتے لیکن اب جبکہ [illegible] [illegible] [illegible] لگے۔

[illegible] یہ واقعہ ہے کہ ہندو نہیں بلکہ انگریز بھی [illegible] [illegible] کو کوشش کرنا [illegible] ہیں۔ لیکن بھلا دو پاکستان کا ہوگا جس کے [illegible] امور [illegible] اہم چیزیں [illegible] ہوں گی۔

[illegible] مسلم لیگ نے کانگریس سے ایک قسم کا ترک موالات کر رکھا ہے۔

دوسری طرف حکومت کا جو رویہ ہے وہ ظاہر ہے۔ لارڈ ویول نے حال میں مرکزی [illegible] کے سامنے جو [illegible] ہے اس سے بھی معاملہ الجھتا ہی ہے سلجھتا نہیں۔ ساری تقریر سے انتقام کی بو آتی ہے۔ وہ کانگریسی رہنماؤں کو نہ صرف چھوڑتے نہیں بلکہ انہیں جیل میں بھی مشورے کی اجازت نہیں دیتے۔ اور پھر یہ بھی فرماتے ہیں کہ آئینی تعطل دور کرنے کی ساری ذمہ داریاں ہندوستانیوں ہی پر ہیں۔ جہاں تک اختیارات تفویض کرنے کا تعلق ہے، لارڈ ویول کی تقریر اس حد سے آگے نہیں بڑھی کہ وائسرائے کی منتظمہ میں چند مزید کرسیوں کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

غرضیکہ یہ آئینی جمود اب ناسور کے مرحلے پر پہنچ گیا ہے لیکن آخر اس دلدل سے نکلنے کا راستہ کیا ہے؟ اس کے متعلق آپ حسب ذیل اکابرین کے خیالات ملاحظہ فرمائیں۔

ہم شری راج گوپال چاری، سید عبداللہ بریلوی، مسٹر آر مور، سجاد ظہیر اور ڈاکٹر عبدالحمید قاضی کے مشکور ہیں کہ انھوں نے "نئی زندگی" کی دعوت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اپنی اپنی جماعتوں کے نقطۂ نظر کو واضح کیا۔

انیس الرحمٰن

سید عبداللہ بریلوی —— (کانگریس)

مہاتما گاندھی اور دوسرے کانگریسی رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد سے کانگریس کی پالیسی کے متعلق غلط فہمی پیدا کرنے کی سلسلے وار مستقل کوششیں عمل میں آتی رہی ہیں۔ اگست ۱۹۴۲ء اور اس کے بعد آنے والے چند مہینوں میں جو ملک بھر میں قابل افسوس ہنگامے اور فسادات ہوئے ان کی نوعیت یہ رہی ہے کہ اس کے علاوہ کچھ نہ تھی کہ عوام نے مہاتما گاندھی اور کانگریس کے تقریباً تمام رہنماؤں کے بغیر کسی عدالتی کارروائی کے گرفتار ہو جانے پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا کیا تھا۔ لیکن کانگریس کی مخالفت میں پروپیگنڈہ کرنے والوں نے ان تشدد انگیزیوں کو کانگریس سے منسوب کیا اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہا کہ کانگریس جاپان کے موافق ہے۔ ہندستان کے اخبارات و رسائل نے اس کانگریس دشمن پروپیگنڈہ کی سختی سے مخالفت کی لیکن اس کا منہ بند نہیں ہوا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک خود کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کی طرف سے اس کی تردید نہیں ہوئی۔

مسز سروجنی نائیڈو نے باوجود علالت کے ۲۵ جنوری کو پریس کانفرنس (منعقدہ نئی دہلی) کے سلسلے میں واضح طور پر یہ اعلان کیا: "۱۹۴۲ء کے تشدد اور ہنگاموں کا کانگریس کے کسی پلان سے کوئی تعلق نہیں ہے' اور نہ گاندھی جی اور کانگریس جاپان کے موافق ہیں"۔ انھوں نے پرزور لہجہ میں یہ فرمایا کہ "اگر اب بھی کوئی یہ کہنے پر مصر ہے کہ یہ سب کچھ کانگریس کا کیا ہوا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ سخت قسم کی بیہودہ گوئی اور سراسر جھوٹ سے کام لے رہا ہے"۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبروں میں صرف میں اس وقت جیل سے باہر ہوں اور آپ کو پورے اختیار کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ ہم نے جاپان کی موافقت تو الگ، ہمیشہ ہر قسم کے بیرونی حملہ کی سختی سے مخالفت کی ہے۔ چاہے وہ حملہ کسی رنگ میں پیش کیا جائے۔ اس لئے کہ ہندستان کو بیرونی حملوں کا ضرورت سے زیادہ تجربہ حاصل ہے۔ اس معاملہ پر ورکنگ کمیٹی کے ممبروں میں قطعی کوئی اختلاف نہیں ہے"۔

تاباروتوں ممبر ہیں جو جیل سے باہر ہیں اور انھوں نے کانگریس اور گاندھی سے متعلق بڑی بڑی غلط فہمیوں کو اپنے بیانات سے مٹا دیا ہے۔ اور جو لوگ کانگریس اور گاندھی جی پر جاپان دوستی کا الزام عائد کرتے ہیں۔ انھیں جھوٹا ثابت کر دیا ہے۔ سروجنی نائیڈو کے بیانات نے اس وقت موجودہ تعطل کو دور کرنے کا ایک باعزت راستہ پیش کیا ہے۔ لیکن اگر اس کے باوجود حکومت موجودہ انتقامانہ اور غیر مدبرانہ پالیسی پر مصر رہنا چاہتی ہے تو اس سے ہندوستان اور غیر ممالک صرف یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ حکومت موجودہ تعطل کو ختم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی اس لئے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اختیارات کو جانے دینا نہیں چاہتی۔

راجہ گوپال چاری

اس مسئلے کے جتنے حل تجویز کئے جاتے ہیں سب آخر کار ایک نقطہ کی طرف لے جاتے ہیں یعنی کیا برٹش گورنمنٹ اس کے لئے پوری طرح تیار ہے کہ ملک کی سیاسیات میں جو رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے اسے ختم کر دیا جائے گورنمنٹ کی رضامندی سخاوت اور خیرات کے جذبات سے پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ صرف آئے سیاسی لحاظوں سے پیدا ہونا چاہیے جو انگلستان کی پبلک کو متاثر کر سکے ہم یہ صورت حال کیسے پیدا کر سکتے ہیں جب تک کہ ہم دوران جنگ کے لئے ایک گورنمنٹ بنانے کی قابل اطمینان تجویز نہ پیش کریں۔ تجویز ایسی ہونی چاہیے کہ لڑائی میں فتح حاصل کرنے کا کام آگے بڑھانے میں وہ مدد کرے، خاص کر مشرقی لڑائی کو کامیاب بنانے کا کام اور اس تجویز کی مضبوط بنیاد مسلم لیگ سے سمجھوتے پر رکھی جانی چاہیے۔

لیگ سے سمجھوتہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ لیگ کا مطالبہ ہے کہ اس کو الگ حکومت قائم کرنے کا حق دیا جائے۔ یہ مطالبہ ناقابل عمل نہیں ہے۔ کیونکہ ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے لئے الگ الگ حکومتیں قائم کرنے کا حق لیگ نہیں مانگ رہی ہے۔ بلکہ ملک کے خاص ان محدود خطوں میں الگ حکومت قائم کرنے کا حق مانگ رہی ہے۔

جہاں مسلمان کافی اکثریت میں ہیں۔ اور جو خطے جغرافیائی حیثیت سے ملے ہوئے ہیں۔ لیگ چاہتی ہے کہ یہ علٰحدگی بھی اس وقت تک عمل میں نہ آئے جب تک ان خطوں کی آبادی اس علٰحدگی کے لئے کھلی ہوئی رضامندی نہ ظاہر کرے۔ اس مطالبے میں ایسے پیچیدہ مسائل نہیں ہیں جن کی تفصیل بحث مباحثے اور سمجھوتے کے بعد طے نہ کی جا سکے۔

ہندوستان میں اچھی اور مضبوط حکومت کی دو ہی شکلیں ممکن ہیں۔ مرکزی حکومت کو تقویت پہنچ سکتی ہے یا تو باہر سے یعنی برطانیہ سے یا اندر سے یعنی ہندوستانیوں کے اتحاد اور میل ملاپ سے۔ ایک مضبوط مرکزی حکومت جس کے پیچھے برطانیہ کی طاقت ہو اور جس میں برطانیہ کا اثر جاری و ساری ہو۔ ضرور ممکن ہے لیکن ہم ایسی حکومت ہرگز نہیں چاہتے۔ بجائے اس کے ہم ایک ایسی ہندوستانی حکومت چاہتے ہیں جس میں ایسے خطے کو جس کی آبادی ایک طرح کا رہن سہن رکھتی ہے اپنا مستقبل طے کرنے کا حق دیا جائے۔ باہمی جنگ کا تو سوال اٹھتا ہی نہیں، صرف اس لئے نہیں کہ ہم باہمی جنگ چاہتے ہی نہیں بلکہ اس لئے کہ بغیر باہمی سمجھوتہ اور رضامندی کے برطانوی حکومت کا یہاں سے ٹلنا ناممکن ہے۔ اور برطانوی حکومت باہمی جنگ کو کبھی روا نہیں رکھے گی۔ خواہ وہ باہمی ان بن اور مفسدانہ جذبات کو روا رکھے

یا ان کو ہوا دیتی رہے۔ ہر خطے یا ملک کے ہر حصے کو اپنا مستقبل طے کرنے اور اپنی حکومت قائم کرنے کی آزادی۔ دیگر اس بات سے ناامید نہیں ہو جانا چاہئے کہ شاید علیحدگی کے حق میں کوئی حصہ آخر کار فیصلہ نہ کرے۔ لیکن اگر ملک کا کوئی حصہ علیحدگی چاہتا ہی ہے تو ہمیں اس حقیقت ... کو تسلیم کرنا چاہئے۔ آزادی کا صرف ایسا جذبہ جو ملک کی آبادی کے ہر مختلف حصے کے دل سے اپنے آپ ابھرے پورے ہندوستان کو آزاد بنا سکتا ہے۔ اور پورے ہندوستان کو آزاد رہنے اور بڑا بننے میں مدد دے سکتا ہے۔ جو مشترکہ حکومت ہم چاہتے ہیں اس میں مل کر رہنے کی قوت ان اکائیوں (UNITS) سے آئے گی جو مل کر ایک مشترکہ حکومت بنائیں گے۔ یہ اتحاد کسی بیرونی دباؤ یا زبردستی سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

روس کی حکومت نے گزشتہ فروری میں جو کچھ کیا اس سے ہمیں سبق لینا چاہئے۔ روس کا طریقہ ہمارے لئے مشعل ہدایت ہے۔ ۱۹۲۱ء کے دسمبر میں آئرستان کے لیڈروں نے کوئی ایسا سمجھوتہ نہیں کیا تھا کہ شمالی آئرستان چاہے تو علیحدہ حکومت قائم کرے اور جب چاہے تو جنوبی آئرستان سے مل جائے۔ اسی وجہ سے آج تک پورا آئرستان ایک نہیں ہے۔

ڈاکٹر عبدالحمید قاضی —— (مسلم لیگ)

ہر محب وطن کے دل میں یہ خواہش موجود ہے کہ کسی نہ کسی طرح موجودہ سیاسی جمود کو ختم ہونا چاہئے لیکن خیالات میں اس قدر انتشار موجود ہے کہ کوئی واضح راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ بعض راہ نما اور مفکر ایک حل پیش کرتے ہیں لیکن ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم کوئی حل اس جمود کو ختم کرنے کا بتائیں ضروری ہے کہ ہم ان متنازعہ فیہ مسائل کو یہاں بیان کر دیں جن کے باعث ملک میں یہ جمود پیدا ہو گیا ہے۔

اہل ہند چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان اس کے خواہش مند ہیں کہ ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے یا کم از کم مکمل آزادی کا اس وقت حتمی وعدہ کر لیا جائے اور جنگ کے بعد اس وعدہ کو فوراً عملی جامہ پہنا یا جائے۔ چنانچہ جمود کو دور کرنے کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کی آزادی کا مکمل وعدہ کرے۔ اس قسم کا ایک وعدہ سر اسٹیفورڈ کرپس کی تجاویز میں بھی موجود تھا۔ اٹلانٹک چارٹر کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ اس کا اطلاق ہندوستان پر بھی ہوگا۔ لیکن برطانوی سیاست دان مثلاً وزیر ہند مسٹر ایمری اور وزیر اعظم مسٹر چرچل بعض وقت اس قسم کی باتیں کرتے رہتے ہیں کہ ان وعدوں پر شک ہونے لگتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ صرف دوران جنگ کے لئے دل خوش کن باتیں کہی جا رہی ہیں لیکن بعد میں برطانوی شہنشاہیت اسی طرح باقی رہے گی جس طرح کہ اس وقت موجود ہے۔ بہرحال اس تمام انتشار اور شکوک کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک صاف اور غیر مبہم وعدہ کیا جائے کہ ہندوستان کو جنگ کے بعد مکمل آزاد کر دیا جائے گا اور اس آزادی کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہندوستان نہ صرف داخلی طور پر آزاد ہوگا بلکہ یہ اس کی اپنی مرضی پر موقوف ہوگا کہ وہ چاہے تو برطانوی اقوام کی دولت مشترکہ میں رہے یا نہ رہے۔ اس کو اپنی دفاع کے لئے ہر قسم کی افواج اور بحری بیڑا رکھنے کا اختیار ہوگا۔ اس کو دیگر اقوام سے بھی ہر قسم کے خارجی تعلقات رکھنے کا اختیار ہوگا۔

غرضیکہ اُس کو جنگ کے بعد وہی اختیارات حاصل ہوں گے جو کنیڈا یا جنوبی افریقہ یا آسٹریلیا کو ہوں گے۔

برطانیہ جب یہ وعدہ کرے تو پھر اہلِ ہند کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ حکومت کو سنبھال کر خود اپنے ملک کی آزادی کے لئے دیگر اقوام کے ساتھ دوش بدوش لڑیں۔ چنانچہ مرکزی حکومت کی ذمہ داریوں کو اہلِ ہند کو قبول کر لینا چاہئے اور اُن صوبوں میں جہاں تعطل ہے وہاں بھی قومی صوبائی حکومتوں کی تشکیل ہو جانی چاہئے۔

لیکن مرکزی قومی حکومت یا صوبائی قومی حکومتیں اُس وقت تک نہیں بنائی جا سکتیں جب تک کہ ہندو اور مسلمان اُن پر مشترکہ طور پر متفق نہ ہو لیں۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ کو اس وقت حل کر لیا جائے۔ ہندو مسلم مسئلہ کا حل صرف اسی صورت میں ہے کہ مسلمانوں کے متفقہ قومی مطالبہ پاکستان کو جس کی ترجمانی مسلم لیگ بحیثیت مسلمانوں کی سب سے زیادہ نمائندہ جماعت کے کرتی ہے تسلیم کر لیا جائے۔ مسلم لیگ ہی دراصل اس وقت مسلمانوں کی سیاسی نمائندہ جماعت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تقریباً تمام مسلمان اُس کے ساتھ ہیں۔ سرحد کے مسلمانوں پر کانگریس کا اثر تھا لیکن اوّل تو دس کروڑ مسلمانوں میں سے سرحد کے مسلمانوں کی آبادی بمشکل پچاس لاکھ ہے۔ دوم گذشتہ صوبہ اسمبلی کے انتخابات پر چار [illegible] نشستوں کے مقابلہ میں لیگ نے کانگریس کو شکست دے دی اور صوبہ سرحد پر اپنی حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ پنجاب میں احرار [illegible] کوئی اثر باقی نہیں رہا ہے اور اب تو انھوں نے حکومت الٰہیہ کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے جس کے لئے آزاد اسلامی [illegible] کا وجود ضروری ہو گیا ہے۔ اس طرح وہ بھی اب پاکستان کو تسلیم کرتے ہیں۔ غرضیکہ اس وقت پانچ صوبوں پر مسلم [illegible] کی حکومت ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہاں مسلم لیگ حاوی ہے۔ اقلیت کے صوبوں میں بھی اکثر منتخب شدہ نمائندے لیگ ہی کے ساتھ ہیں۔ غرضیکہ جس نقطۂ نظر سے بھی غور کیجئے مسلم لیگ ہی دراصل مسلمانوں کی سیاسی نمائندہ جماعت ہے

مسلم لیگ کا مطالبہ ہے کہ ہندوستان کے ایک چوتھائی حصہ کو مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے جہاں اُن کی اکثریت ہے آزاد کر دیا جائے۔ مسلمانوں کی اکثریت کے یہ حصے صوبہ سرحد، پنجاب، صوبہ سندھ، بلوچستان اور صوبہ بنگال ہیں۔ مسلم لیگ کا یہ مطالبہ اس بنیاد پر ہے کہ مسلمان ایک علٰحدہ قوم ہیں۔ ایک جداگانہ قومیت کے لئے جن عناصر کا ہونا ضروری ہے وہ مسلمانوں میں موجود ہیں۔ مثلاً یہ کہ اُن کی تہذیب و تمدن، اُن کا ادب و شاعری، اُن کے فنون لطیفہ، اُن کی تاریخ، اُن کے سماجی، سیاسی اور معاشی تصورات، اُن کے اخلاقی اور مذہبی اعتقادات ہندوؤں سے علٰحدہ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ازمنہ متوسطہ پر ہندوؤں اور مسلمانوں نے بعض معاملات پر اشتراک کیا۔ لیکن یہ اشتراک اُسی طرح کا تھا جس طرح کہ دو اقوام میں ہوتا ہے جب وہ ایک حکومت پر مجبوراً زندگی گذاریں۔ مثلاً آئرستان کے لوگوں کو بھی انگلستان کے ساتھ اشتراک کرنا پڑا تھا جب آئرستان انگلستان کے ماتحت تھا۔ لیکن یہ دونوں قومیں کبھی بھی ایک نہ ہو سکیں۔ اسی طرح کا اشتراک ہنگری اور آسٹریا میں بھی ایک مشترکہ ریاست میں تھا مگر دونوں اقوام نے اپنا علٰحدہ وجود ہمیشہ باقی رکھا اور موقع ملتے ہی گذشتہ جنگ عظیم کے بعد وہ آزاد ہو گئیں۔ اگر مغلیہ سلطنت ہندوستان میں چند صوبوں میں باقی رہتی تو اس کا امکان تھا کہ شاید ہندوستان میں ایک قوم پیدا ہو جاتی لیکن اُس کے خاتمہ کے بعد بلکہ اُس کی موجودگی ہی میں ہندوؤں کو اپنی علٰحدہ

قومیت کا احساس پیدا ہو گیا اور ایک علحدہ آزاد ہندو ریاست قائم کرنے کی انھوں نے شیواجی کی سرکردگی میں جدوجہد شروع کر دی تھی جس میں بالآخر وہ کامیاب ہوئے۔ گو کہ اس ریاست کا بعد میں انگریزوں نے خاتمہ کر دیا۔ بعد میں بھی ہندو قومیت کا مطمح نظر ہمیشہ ہندو تہذیب و تمدن کا ہی رہا اور وہ ہمیشہ ایک ایسی حکومت بنانے کے لئے ساعی رہے جس میں ہندو غلبہ اور تسلط ہو۔ چنانچہ لوکمانیہ تلک اور گاندھی جی وغیرہ اسی ہندو تحریک قومیت کے علمبردار ہیں۔ گاندھی جی نے اپنے آپ کو ایک قومی راہ نما بنانے کی کوشش کی۔ سنہ ۱۹۲۰ء کی تحریک میں وہ ایک قومی راہ نما ہو بھی گئے تھے لیکن بعد میں بہت جلد اُن پر ہندویت کا رنگ غالب آگیا اور وہ صرف ایک ہندو راہ نما ہو کر رہ گئے۔ ہمارے بمبئی میں چند اصحاب نے اکبر کی یاد کو زندہ کر کے دوبارہ ازمنہ متوسطہ کی بنیادوں پر ہندی قومیت کا احساس پیدا کرنا چاہا تھا۔ اس میں چند روشن خیال مسلمان اور چند پارسی حضرات شریک تھے مگر فوراً ہی اکبر کے مقابلہ میں بھی جو واقعی صحیح معنوں میں ایک قوم پرست انسان کہا جا سکتا ہے "اکھنڈ بھارت" کے مبلغ مسٹر منشی اور لیبرل پارٹی کے لیڈر مسٹر جیاکر نے بکرماجیت کو لا کھڑا کیا جس کی نہ صحیح تاریخ کا پتہ ہے اور نہ صحیح حالات زندگی کا۔ ہندو مہاسبھا والوں کا تو تذکرہ ہی فضول ہے۔ وہ تو ایمانداری سے صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ وہ ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جب کانگریسی اور لیبرل راہ نماؤں کا یہ حال ہے تو مسلمانوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ باوجود دس کروڑ ہونے کے اور پانچ صوبوں میں اکثریت ہونے کے اپنی جداگانہ قومیت کا احساس چھوڑ دیں گے اور ہندو تہذیب و تمدن میں گم ہو جائیں گے، ایک ناممکن امر ہے۔ پھر مسلمان اپنے تہذیب و تمدن کو اس لئے بھی چھوڑنا نہیں چاہتے کہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے جو بہترین اقدار ہیں وہ سب اسلامی تہذیب میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً عقیدۂ توحید، اخوت انسانیہ، جمہوریت، معاشی عدل، مشاہدہ کے ذریعہ علوم فطرت کا مطالعہ وغیرہ۔ ان کو قائم رکھنے سے اُن کو یقین ہے کہ وہ نہ صرف ہندی مسلمانوں کی ترقی کر سکتے ہیں بلکہ ہندوستان اور بحیثیت مجموعی تمام انسانیت کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ پھر وہ اپنی تہذیب و تمدن کو کیوں ترک کریں جو ایک عالمگیر انسانی نصب العین کا حامل ہے اور ایک ایسے تہذیب و تمدن کے اثرات کو حاوی کر لیں جس کا طرۂ امتیاز چھوت چھات ہے اور جو چھ کروڑ خدا کی مخلوق کو اب تک غلام بنائے ہوئے ہے۔

بہر حال مسلمانوں نے اب حتمی طور پر طے کر لیا ہے کہ وہ ہندوستان میں ایک علحدہ قوم کی طرح زندگی گذاریں گے جو بہترین انسانی نصب العین کی حامل ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ دوسروں کے مخالف ہیں یا اُن کے حقوق کو پامال کرنا چاہتے ہیں، بلکہ وہ دوسری اقوام کے ساتھ اشتراک عمل کے لئے بھی تیار ہیں لیکن اپنی ہستی اور اپنی قومیت کو فنا کر کے نہیں۔ تہذیب و تمدن کے فروغ کے لئے حکومت اساس کا کام دیتی ہے۔ چنانچہ وہ اُن علاقوں میں جہاں اُن کی اکثریت ہے اپنی آزاد ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا فطری اور حق بجانب مطالبہ ہے کہ مسلمان اس کو کسی قیمت پر بھی ترک نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے علاقوں میں ہندوؤں کو وہ تمام تمدنی اور سیاسی حقوق دینے کے لئے آمادہ ہیں جو ہندو اُن علاقوں میں مسلمانوں کو دیں گے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔

غرضکہ موجودہ سیاسی جمود کو دور کرنے کے ناگزیر شرط یہ ہے کہ انگریز اور ہندو مسلمانوں کے حق پاکستان یا حق خود اختیاری کو تسلیم کر لیں۔ وہ یہ تسلیم کر لیں کہ جنگ کے بعد مسلم اکثریت کے علاقے کے مسلمانوں کو یہ حق ہوگا کہ وہ اپنی آزاد ریاستیں بنائیں۔ آزاد ریاست کا مفہوم یہ ہے کہ نہ صرف ان کو مکمل داخلی آزادی حاصل ہوگی بلکہ وہ اپنی دفاع اور خارجی معاملات میں بھی آزاد ہوں گے۔ اس معاملہ میں ہندوستان اس سے بہت کچھ سبق سیکھ سکتا ہے جس نے اپنی قومیتوں کے مسئلہ کو نہایت کامیابی سے حل کیا ہے چنانچہ اُس کے آئین کی دفعہ ۱۳ کے مطابق روس کی تمام ریاستوں کو آزاد تسلیم کیا گیا ہے اور سب کے حقوق کو مساوی بتایا گیا ہے۔ دفعہ ۱۷ کی رو سے اُن کو روس کی مشترکہ حکومت سے اپنے تعلقات منقطع کرنے کا بھی پورا حق حاصل ہے۔ اور اب تو مسٹر مولوٹوف روس کے وزیر خارجہ کی تقریر اور اُس کے بعد روس کی پارلیمنٹ SUPREME SOVIET کے دونوں ایوانوں نے اپنی سولہ ریاستوں کو نہ صرف دفاع اور علیحدگی کی آزادی دے دی ہے بلکہ خارجی معاملات میں بھی آزاد کر دیئے گئے ہیں۔ وہ جس ملک سے چاہے اپنے سیاسی تعلقات قائم کر سکتی ہیں۔ روس کی ان سولہ ریاستوں میں پانچ ریاستوں پر مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ روس کی بیس کروڑ آبادی میں سے چار کروڑ آبادی مسلمان ہے۔ اگر انگریز مدبرین اور ہندو رہنما مسلمانوں کے حق خود اختیاری کو صاف صاف تسلیم کر لیں تو مسلمان دوران جنگ میں مساوی حیثیت سے مرکزی حکومت میں ہندوستان کے غذائی مسئلہ کو حل کرنے، داخلی حالات کو بہتر کرنے اور ہندوستان کی آزادی کے لئے جنگ میں شریک ہونے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔ تمام صوبوں میں مخلوط حکومتیں بن سکیں گی اور ملک کی فضا صاف ہو جائے گی۔

جنگ کے بعد ہندوستان میں آزاد ریاستیں قائم ہوں گی لیکن دلوں کی صفائی کے بعد یہ آزاد ریاستیں یقین ہے کہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہو جائیں گی بلکہ ہندو اور مسلم دونوں کو آزادی مل جانے کے بعد وہ ایک دوسرے سے قریب تر آئیں گی۔ اور ہندو اور مسلم ریاستیں اپنے خارجی تعلقات، دفاع اور معاشی مفاد کے لئے معاہدہ کے ذریعہ ایک (UNION) قائم کر لیں گی۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں لینن نے روس کی تمام اقوام کو آزاد کر دیا تھا لیکن سنہ ۱۹۲۲ء تک یعنی چار برس کے عرصہ میں مشترکہ مفاد کے لئے تمام ریاستیں ایک دوسرے سے مل گئیں۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کے حق خود اختیاری کو بغیر زیادہ لیت و لعل کے تسلیم کر لیا جائے تو ایک ہندوستانی یونین (UNION) کا ہر وقت امکان ہے جس کو جس قدر زیادہ اس سے انکار ہوگا اُسی قدر تعلقات خراب ہوں گے اور ملک کو نقصان پہنچے گا۔ مختصر یہ کہ ملک کا موجودہ سیاسی جمود مندرجہ ذیل شرائط اگر پوری ہو جائیں تو دور ہو سکتا ہے:۔

(۱) برطانوی حکومت ہندوستان کی مکمل آزادی کا وعدہ کرلے۔
(۲) ہند کی سیاسی پارٹیاں کانگریس، مسلم لیگ وغیرہ جنگ میں حکومت ہند کے ساتھ تعاون کریں۔
(۳) مسلم لیگ کے پیش کردہ مسلمانوں کے حق پاکستان یا حق خود اختیاری کو تسلیم کر لیا جائے۔
(۴) دوران جنگ کے لئے مساوی حیثیت سے ہندو اور مسلمان مرکزی حکومت قائم کریں۔

(د) تمام صوبوں میں مخلوط حکومتیں بنادی جائیں۔

ہم مندرجہ بالا سطور لکھ چکے تھے کہ وائسرائے ہند لارڈ ویول نے مرکزی ایوانوں کے سامنے وہ تقریر کی جس کا ایک مدت سے اہلِ ہند کو انتظار تھا۔ وائسرائے نے دوبارہ اس کا اعلان کیا کہ سر سٹیفورڈ کرپس کی تجاویز اس وقت تک موجود ہیں اور ان کی بنیادوں پر آئندہ گفتگو کی جاسکتی ہے۔ وائسرائے نے کہا کہ ان تجاویز کی رُو سے ہندوستان دولت مشترکہ برطانیہ کا ایک آزاد اور مساوی حصہ دار ہوگا اُسی طرح جس طرح کہ خود انگلستان ہوگا۔ ہندوستان کو یہ بھی حق ہوگا کہ وہ چاہے تو اس دولت مشترکہ میں رہے چاہے نہ رہے۔ اس اعلان کے ذریعہ ہماری اولین شرط جو موجودہ جمود کو دور کرنے کے لئے ہم ضروری خیال کرتے ہیں پوری ہوجاتی ہے۔ دوسری شرط کا پورا کرنا اب کانگریس کے اختیار میں ہے کہ وہ وعدہ کرلے کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے متحدہ اقوام کا جنگ میں ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہے۔ حکومت کو اس پر ضرورت سے زیادہ زور نہ دینا چاہئے کہ کانگریس والے اپنے گذشتہ طرزِ عمل پر افسوس بھی ظاہر کریں بلکہ اگر وہ آئندہ کے لئے مفاہمت پر تیار ہوجائیں تو کافی سمجھنا چاہئے۔ ہمیں یقین ہے کہ کانگریس اگر حکومت کی جنگی مساعی میں مداخلت کی پالیسی ترک کردے گی تو وہ اُنھیں رہا کردے گی۔ کانگریس کے لیڈروں کا اولین فرض پھر یہ ہونا چاہئے کہ وہ مسلمانوں کے حق خود اختیاری کو تسلیم کرلیں تاکہ ہم حکومت کے سامنے ایک متحدہ مطالبہ پیش کرسکیں۔ وائسرائے صاحب کی موجودہ تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ اس متحدہ مطالبہ کو قبول کرلیا جائیگا۔

وائسرائے صاحب کی موجودہ تقریر نے نہ تو ہندوؤں کے پورے مطالبات کو پورا کیا ہے اور نہ مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کو تسلیم کیا ہے لیکن گفت وشنید کے لئے راہ ضرور ہموار کردی ہے۔ اس لئے اب حکومت ہند کا فرض ہے کہ وہ کانگریس کے راہ نماؤں سے جنگ کے متعلق اُن کا رویہ معلوم کرے۔ اگر وہ آئندہ اُس میں مداخلت نہیں کرنا چاہتے ہیں بلکہ اُن کی ہمدردی متحدہ اقوام کے ساتھ ہے جس طرح کہ وہ کہا کرتے ہیں تو انھیں یا تو حکومت رہا کردے اور کانگریس اور لیگ کے لیڈروں کو یکجا جمع کرکے ایک سمجھوتہ کی کوشش کرے یا اگر حکومت فی الحال ایسا نہیں کرنا چاہتی تو کم از کم مسلم لیگ کے لیڈروں کو کانگریس کے لیڈروں سے جیل ہی میں گفت وشنید کا موقع دے تاکہ اگر کانگریس والے حکومت اور مسلمانوں سے سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں تو معلوم ہوجائے۔

اس سمجھوتہ کی جزئیات تو بعد میں طے ہوسکتی ہیں لیکن وہ صرف مندرجہ ذیل اصولوں پر مبنی ہوسکتا ہے ہندوستان کو بعد از جنگ آزاد تسلیم کیا جائے چاہے پھر وہ دولت مشترکہ برطانیہ میں رہے یا نہ رہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ متحدہ اقوام کا جنگ میں ساتھ دیں۔ پاکستان کے اصول یعنی بعد از جنگ شمال مغرب اور شمال مشرق میں آزاد مسلم ریاستوں کو تسلیم کیا جائے جنھیں اپنے دفاع اور امور خارجہ کا اختیار بھی ہو اور وہ اگر چاہیں تو ہندوستان میں رہیں یا اس سے علیحدگی اختیار کرلیں۔ ہندوستان کی آزاد مسلم ریاستیں اور آزاد ہندو ریاستیں دفاع، خارجی امور اور معاشی معاملات کے لئے باہم آزادانہ ریاستوں کی حیثیت سے ایک طویل عرصہ کے لئے معاہدہ کرلیں اور اس طرح ہندوستان کا ایک یونین (UNION) قائم کرلیں جس میں ان ریاستوں کو یونین (UNION) سے علحدگی کا ہر وقت حق باقی رہے۔ اور روس کی

ستوں کی طرح اِن ریاستوں کو اِس کا بھی حق ہو کہ وہ اگر دوسری ریاستوں سے خارجی تعلقات قائم کرنا چاہیں تو کر سکیں۔ جنگ
بعد آزاد پاکستان اور آزاد ہندوستان وجود میں آئے فی الحال مسلم لیگ اور کانگریس مساوی حیثیت سے مرکزی حکومت میں
عارضی مخلوط حکومت بنائیں اور تمام صوبوں میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مشترکہ حکومتیں بنادی جائیں۔
موجودہ جمود کو دور کرنے کی راہ میں اب سب سے بڑی رکاوٹ ہندوؤں کی طرف سے ہے۔ وہ اگر مسلمانوں کے حق خود
ختیاری کو تسلیم کر لیں تو کانگریس اور لیگ میں سمجھوتہ ہو سکتا ہے اور حکومت کو اس متحدہ مطالبہ کو ماننے پر مجبور کیا جا سکتا ہے
ہندو راہنما اس خیال میں ہیں کہ مسلم لیگ سے سمجھوتہ کئے بغیر وہ سیاسی ترقی کر سکتے ہیں تو اب وائسرائے صاحب کی موجودہ تقریر
سے اس خیال کو دور ہو جانا چاہیئے جس میں صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ ہندوستان سیاسی حیثیت سے نہ اس وقت اور نہ
ئندہ اس وقت تک ترقی کر سکتا ہے جب تک کہ ہندو اور مسلم آپس میں مل کر ایک متحدہ سیاسی مطالبہ نہ پیش کریں جس قدر جلد
رسے ابنائے وطن اس ضرورت کا احساس فرمالیں یہ اُن کے لئے بھی مفید ہے اور بحیثیت مجموعی تمام ملک کے لئے بھی اور اس میں
نے والی ہندو اور مسلمان دونوں اقوام کے لئے بھی۔ بجائے اس کے کہ ہندو راہنما خصوصاً گاندھی جی اپنی طاقت سے تنہا
ومت کو دبانے کی کوشش کریں جس میں وہ ۲۹ بار ناکام ہو چکے ہیں۔ ملک کا مفاد اس میں ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے کر
کومت کے سامنے متحدہ مطالبہ پیش کریں۔ اور یہ متحدہ مطالبہ صرف اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آئندہ ہندوستان کا آئین
یسا بنے جس میں ہندو قوم بھی آزاد ہو اور مسلمان قوم بھی۔ گو کہ بحیثیت مجموعی دونوں اقوام کے مفاد اور ہندوستان کی ترقی کے لئے
دونوں اقوام کی آزاد ریاستیں دفاع، امور خارجہ اور معاشی معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ مکمل تعاون کریں۔

سجاد ظہیر ——— (کمیونسٹ پارٹی)

کانگریسی محبان وطن کی ایک بڑی تعداد میں یہ ایک عام خیال پایا جاتا ہے کہ مسلم لیگ اور اُس کے قیادت کرنے والے فرقہ پرست
ہیں جو اپنے ذاتی اور فرقہ وارانہ مفاد پر تمام ملک کے تمام مفاد کو قربان کر دینے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ مسلمانوں کے مطالبہ
پاکستان کو صرف ترقی کے راستہ میں ایک رکاوٹ۔ یا اس سے بھی بدتر۔ برطانوی سرمایہ داری کی ایجاد، سمجھا جاتا ہے۔
جس کا مقصد ملک کے اتحاد کو توڑنا، سیاسی غلامی کو بڑھانا اور سرمایہ داری کے ذریعہ ہندوستان کی اقتصادی (استحصال) ہے۔
لیگ اور اُس کے مطالبہ پاکستان کے متعلق یہ نظریہ قائم کر کے کانگریسی محبانِ وطن لیگ کے ساتھ کوئی تعلق رکھنے سے انکار
کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ اتحاد بالکل ممکن نہیں۔
۳۷ سال پہلے لیگ کی بنیاد پڑنے سے اب تک، ہندو مسلم تعلقات کی تاریخ کے خاص واقعات کا ایک ریویو یہ دکھانے
کے لئے کیا جاتا ہے کہ آیا ہندوستانی مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی احساسات کی ترقی کا منطقی
اظہار ہے، اور یہ کہ آیا یہ قدم تمام ہندوستانیوں کے آزادی کی جانب ترقی کے ساتھ اُٹھا ہے۔
مسلم لیگ کی بنیاد ۱۹۰۶ء میں پڑی۔ وہ خاص سیاسی مطالبہ جو اُس نے اُس وقت پیش کیا تھا یہ تھا کہ لارڈ منٹو

کی اصلاحات کی نئی اسکیم میں مسلمانوں کو علاحدہ حلقہ انتخاب دے جائیں اور لیجسلیچر میں اُن کی نشستیں ریزرو ہونا چاہئیں۔ بہت سے قوم پرستوں کا یقین ہے کہ یہی وہ اصول علحدگی ہے جس نے ایک متحد ہندستانی قوم کے نشو و نما کی جڑ کاٹ دی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سرمایہ داری کے خلاف ہندستان کے اتحاد کو روکنے کی یہ ایک سرمایہ دارانہ چال تھی۔

یہ بات کہ لیگ میں سرمایہ داروں کے موافق عنصر تھے اور یہ کہ تقسیم اور نااتفاقی سرمایہ داروں کے مفاد میں ہے۔ اوپر دی ہوئی باتوں کو ثابت کرنے کے لیے ایک استدلال کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں جس چیز کو نہیں سمجھا جاتا وہ یہ ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ سرمایہ داروں کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ یہ چند تاریخی وجوہات کی بنا پر قائم ہے۔ لیکن سرمایہ دار اس کا اسی لئے استعمال کرتے ہیں کہ اس سے اُن کو فائدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمارا فائدہ اس مسئلہ کو حل کرنے میں یہ ہے کہ ہم صورتِ حالات کو اپنے موافق پلٹیں اور سرمایہ داری کو الگ کر ڈالیں۔

جداگانہ انتخاب کیا وہ مطالبہ جو ۱۹۰۶ء میں اور اس کے بعد لیگ نے جداگانہ انتخاب اور نشستوں کے ریزرو ہونے کے لئے کیا نامنصفانہ اور جمہوریت کے خلاف تھا؟ اس سوال کا جواب صرف اسی وقت دیا جا سکتا ہے جبکہ ہم مسلمانوں کی اُس وقت کی حالت سے مُلک کی اُس وقت کی عام سیاسی حالت کے تعلق پر غور کریں۔

ہندستان میں سلطنت برطانیہ کے قائم ہونے اور ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد جن مقامات پر سب سے زیادہ صنعتی۔ تجارتی اور تعلیمی ترقی ہوئی وہ کلکتہ، بمبئی اور مدراس تھے مسلم اکثریت کے خطے نسبتاً پیچھے اور اپنی حالت پر چھوڑ دیے گئے۔ یہ خطے پنجاب مشرقی بنگال، شمالی مغربی سرحدی صوبہ۔ سندھ اور بلوچستان تھے۔ مزید یہ کہ تاریخی وجوہات کی بنا پر مسلمان جدید تعلیم کی آسانیوں سے فائدہ اٹھانے سے رہ گئے۔ سر سید احمد خاں نے اندازہ لگایا کہ ۱۸۹۳ء میں جبکہ ہندو گریجویٹ ۴،۸۹۷ تھے، مسلم گریجویٹوں کی تعداد ۵۴۶ تھی۔

اب اگر ہم یہ خیال رکھیں کہ اُس زمانہ میں ووٹ دینے کے حق کی بنیاد جائداد پر تھی اور صرف تعلیم یافتہ حضرات چناؤ کے لائق سمجھے جاتے تھے تو یہ واضح ہے کہ صرف ایک ہی طریقہ جس سے کہ نئے تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کے مسلمان اپنی قوم کی خدمت بجا لا سکنے کی اُمید کر سکتے تھے، جداگانہ انتخاب کا مطالبہ ہماری سیاسی ترقی کے اس درجہ پر ایک بالکل منصفانہ مطالبہ تھا کیونکہ وہ ایک ہی جمہوری طریقہ تھا جس کے ذریعہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال مسلم متوسط طبقہ مسلمان قوم کے مفاد کی حفاظت کر سکتا تھا۔

وہ ترقی اور خود اظہاری کے لئے ہمارے ہموطنوں کے اس طبقہ کا مطالبہ تھا جو اقتصادی اور سیاسی طور پر ہمارے ملک کے اُن باشندوں سے پیچھے تھے جن کے جوشِ آزادی کی نمایندگی انڈین نیشنل کانگریس کرتی تھی۔

حکومت خود اختیاری کا مطالبہ

بہر حال مسلم لیگ کی پیدائش کے پانچ سال کے اندر (۱۹۱۲ء میں) اُس کے مقصد کو برطانوی تاج کے ماتحت ہندوستان کے لائق حکومت خود اختیاری حاصل کرنے میں بدل دیا گیا۔ ترکستان کا

شار زار کے روس کا ایران پر حملہ اور طرابلس میں مسلمانوں کی تکلیفات نے ہندوستانی مسلمانوں میں سرمایہ داری کے مخالف جذبات کو جنبش دی۔ اُردو ہفتہ وار "الہلال" کے ذریعہ ابوالکلام آزاد اور انگریزی ہفتہ وار "کامریڈ" کے ذریعہ محمد علی مسلمانوں کو آزادی کے لئے کمر بستہ ہونے کا پرچار کر رہے تھے۔ ایم۔ اے۔ او کالج علیگڑھ میں ایک زبردست سیاسی ہلچل تھی اور ڈاکٹر ایم۔ اے۔ انصاری کی قیادت میں ایک مسلم میڈیکل مشن ترکستان بھیجا گیا تھا۔

لیگ کا اسی حکومت خود اختیاری کے مطالبہ کا اختیار کر لینا جس کو کہ کانگریس نے ۱۹۰۵ء میں منظور کر لیا تھا، اِن دو بڑی سیاسی تنظیموں کو باہم بہت نزدیک لے آیا۔ جنگ عظیم کے واقعات نے اس عمل کو اور بھی بڑھایا کانگریس اور لیگ کے لیڈر ایک دوسرے سے ملے اور اسی زمانہ میں کانگریس اور لیگ کے ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں ایک ہی وقت میں اجلاس ہوئے۔

لیگ کے صدر بہار کے مشہور کانگریسی مسلمان مسٹر مظہر الحق تھے اور ہندو مسلم سوال کے سمجھوتہ کے لئے دونوں تنظیموں میں گفت وشنید جاری کی گئی تھی۔ یہ گفت وشنید کانگریس اور لیگ میں ایک سمجھوتہ کی صورت میں ختم ہوئی اور اُس کو دونوں جماعتوں کے کھلے ہوئے اجلاسوں میں تسلیم کر لیا گیا جو کہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں منعقد ہوتے تھے۔ یہ اسی معاہدہ کا نتیجہ تھا کہ جب مسٹر مانٹیگو ۱۹۱۷ء میں ہندوستان میں آئے تو کانگریس اور لیگ اُن کے مقابلہ میں ایک متحد محاذ پیش کرنے کے قابل تھیں۔ رجعت پرست اس اتحاد سے چوکنے ہوئے۔ لارڈ سڈنہیم نے اُس کو ایک خطرناک چال کے نام سے پکارا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ جرمن ایجنٹوں کی بنائی ہوئی تھی۔

کانگریس لیگ کا ۱۹۱۶ء کا سمجھوتہ

اب اگر ہم کانگریس لیگ کے ۱۹۱۶ء کے سمجھوتے کے خاص عناصر کو جانچتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ پنجاب اور بنگال کی مسلم اقوام کے بڑھتے ہوئے حقوق مرکزی حکومت میں حصہ اور غیر مسلم خطوں میں آباد مسلم اقلیتوں کا پورا تحفظ ہیں جو نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ طے ہوا تھا کہ مسلمانوں کو علیحدہ حلقہائے انتخاب ملیں گے اور مرکزی لیجسلیچر میں اُن کی نشستیں مقرر کی جائیں گی۔ پنجاب میں اُن کو کل چنی ہوئی نشستوں میں سے آدھی اور بنگال میں آسی کی۔ ۴۰ فی صدی ملنی تھیں۔ مرکزی لیجسلیچر میں اُن کی تعداد کل چنے ہوئے ممبران میں ایک تہائی ہونی قرار پائی اور مسلمانوں کے مفاد پر اثر ڈالنے والا کوئی ایسا قانون پاس نہیں کیا جا سکتا تھا جس کی مسلم ممبروں میں سے تین چوتھائی مخالفت کریں۔

یہ مسلم مطالبات جو کانگریس نے تسلیم کر لئے تھے یہ دکھاتے تھے کہ ——

اوّلاً —— پنجاب اور بنگال کے مسلم باشندوں کا اپنے وطنوں کی سیاسی زندگی میں ایک نمایاں حیثیت تک ترقی کرنا —— یہ سمجھتے ہوئے کہ لیجسلیچر کے لئے حلقۂ انتخاب ابھی تک محدود اور صحیح بنیادوں پر تھا۔ اور پوری جمہوری آزادی کا درجہ حاصل نہیں کیا گیا تھا معاہدہ کے اِس نکتہ نے اُس موقعہ پر اِن مسلم خطوں کی سیاسی ترقی کا پورا اظہار کیا۔

دوئم —— ایک تہائی نشستوں کا مرکزی لیجسلیچر میں دیا جانا اور مسلمانوں کے لئے مضر قانون کے خلاف تحفظ کے متعلق (PROVISION) ایک فیڈرل دستور میں چھوٹی اقوام کے لئے مساوات کے پہلے جذبہ کا اظہار ایک بڑی

اور زیادہ ترقی یافتہ قوم کے واحد وفاق (فیڈریشن) سے کمزور اور چھوٹی اقوام جمہوری تحفظ کا مظاہرہ ہیں۔

باہمی مقصد کے لئے جد و جہد

ہندو مسلم اتحاد سے لکھنؤ کے معاہدہ کے بعد والے دور کو مسلم لیگ کے مورخ محمد نعمان نے اِن الفاظ میں ادا کیا ہے۔

"لیگ اور کانگریس کچھ برسوں تک ایک ہی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو کر ایک باہمی مقصد کے لئے لڑیں جو کہ تمام مادر وطن کے افراد کی خاطر تھا۔"

کانگریس لیگ اتحاد جو کہ ۱۹۱۶ء میں حاصل کیا گیا تھا بڑھتا نہ ہوا اس حد تک کہ جب رولٹ ایکٹ پنجاب میں مظالم اور سخت اقتصادی تباہیوں کے ساتھ جنگ کے بعد آیا تو ہندوستانی بحیثیت مجموعی جاگ اُٹھے۔ ہندوستان کے باہر کے واقعات۔ انقلاب روس مشرقی ممالک میں تحریک آزادی اور سلطنتِ ترکستان کی سرمایہ دار طاقتوں میں تقسیم۔ ہندوستانیوں پر بڑا اثر ڈال رہے تھے۔ کانگریس کے مہاتما گاندھی۔ موتی لال نہرو۔ اور سی آر۔ داس وغیرہ اور مسلم لیگ کے علی برادران۔ ڈاکٹر انصاری مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کی قیادت میں عوام کی ایک زبردست تحریک ہندوستان میں پھیل گئی۔

تحریک کے تین نعرے۔ سوراج۔ رولٹ ایکٹ کی بدلی اور خلافت یعنی مشرق قریب اور عربی مسلم ممالک کی آزادی تھے، ہندوستان کی آزادی کے لئے جد و جہد کی تاریخ کا کوئی دور سوراج خلافت کے دور سے زیادہ شاندار نہیں۔ ہندو اور مسلم لیڈر ایک ساتھ ایک ہی پلیٹ فارم پر آئے اور ہزاروں ہندوؤں اور مسلمانوں نے کانگریس۔ لیگ اور خلافت کمیٹی کی چلائی ہوئی تحریک میں باہم حصّہ لیا۔

یہاں ہم کو پھر جانچنا چاہیے کہ وہ کیا چیز تھی، جس نے مسلم عوام کو ہلایا؟ اُن کی اُمیدیں اور آوازیں کیا تھیں اور وہ کیا چیز تھی جس کے لئے وہ لڑ رہے تھے؟ صاف طور پر وہ دو ہی چیزیں تھیں۔ اوّلاً یہ کہ وہ سرمایہ داری کو ہندوستان سے نکال دینے۔ اور سوراج حاصل کرنے کے لئے لڑ رہے تھے۔ دوئم اور اس پر بھی بالا تر وہ ابھی تک ایک نامعلوم اور متحد طریقہ پر مسلم باشندوں کی آزادی کیلئے ہندوستان کی مسلم اقوام کے لئے لڑ رہے تھے۔

سوراج و خلافت کا اصل اندرونی مقصد جو مسلم محبانِ وطن کے سامنے تھا یہی ہے۔ یہ مانا کہ تحریکِ خلافت ایک مذہبی جیسی چیز تھی لیکن یہ چیز نہیں تھی جس نے مسلم عوام کو حرکت دی۔ اُن کو جس چیز نے ہلایا وہ اُن کے مسلمان بھائیوں کی سرمایہ داری کے خلاف تحریک اور ان کا اپنا سرمایہ داری کے خلاف قومی احساس تھا۔

اور صرف اسی وجہ سے کہ مہاتما گاندھی اور کانگریسی لیڈروں نے اِس کو سمجھا اور خلافتی بازو کے ساتھ انصاف کو کانگریس کی جد و جہد کے مقاصد میں سے ایک سمجھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے طوفانی دروازے کھل گئے اور سرمایہ داری کی جڑیں ہل گئیں۔

نا اتفاقی غائب ہو جاتی ہے۔

لیکن عدم تعاون کی تحریک ناکامیاب رہی خاص اسی وجہ سے کہ تحریک کی قیادت عوام کے سامنے ایک واضح جمہوری پروگرام رکھنے کے قابل نہ تھی سوراج بغیر تعریف کے رہا اور

مزدوروں اور کسانوں کے جمہوری مطالبات۔ ہندستانی اقوام کا حق خود ارادیت، ہندستان
آزادی کی بڑی جدوجہد کے ایک حصّہ کی حیثیت سے سامنے نہ رکھے گئے۔

پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں کانگریس کا سوراجی بازو مرکزی لیجسلیچر میں داخل ہوا اور وہاں پر اُسی وقت
اہر حکومت کی تبدیلی کے لئے سوال اُٹھایا گیا۔ مسٹر جناح اور اُن کی پارٹی نے مرکزی لیجسلیچر میں تمام خاص سیاسی امور پر کانگریس
ـ تھ دیا۔ اسی وقت کانگریس نے ہندو مسلم سمجھوتہ کی ضرورت کو تسلیم کیا تاکہ حکومت برطانیہ کے سامنے ایک متحد قومی مطالبہ رکھا
جاسکے۔ دسمبر ۱۹۲۴ء میں مسلم لیگ نے ایک ریزولیوشن پاس کرکے ایک کمیٹی دوسری پارٹیوں سے سمجھوتہ کرنے کے لئے
مقرر کی۔

اب تو کانفرنسوں اور ہندو مسلم سمجھوتہ کے لئے کوششوں کا ایک طوفان آگیا۔ گو کہ ہندو مسلم اتحاد اب بھی ایک دھوکے
کی ٹٹی ہی رہی۔ ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے تقرر کے اعلان کے ساتھ ملک میں ایک غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی کانگریس اور مسلم
لیگ دونوں نے اُس کو بُرا بھلا کہا اور باہمی سمجھوتہ کے لئے ایک مرتبہ پھر کوششیں ہوئیں۔

مسلم مطالبہ نے اپنے آپ کو مسٹر جناح کے چودہ نکتوں کی صورت میں، جن کے پیچھے تمام خاص مسلم سیاست دانوں۔
لیگ اور مسلم کانفرنس والوں۔ مولانا محمد علی کی قیادت میں خلافت والوں کی خاص جمعیت اور جمعیت العلماء متحد تھے، اپنے
آپ کو واضح طور پر ظاہر کیا۔ صرف ڈاکٹر انصاری اور مولانا آزاد کی قیادت میں قوم پرست مسلمانوں نے اس میں حصّہ
نہیں لیا لیکن وہ بھی دوسرے مسلمانوں سے سمجھوتہ کرنے کے موافق تھے۔ کانگریس کی طرف سے نہرو رپورٹ مرتب
کی گئی۔

اِس جگہ اِس وقت کے خاص مسلم مطالبات، وہ نکات جن پر کہ وہ نہرو رپورٹ کے خلاف تھے اور کلکتہ میں منعقد کردہ
آل پارٹیز کانفرنس کے کسی سمجھوتہ پر نہ پہنچنے کے وجوہات سب کو جانچنا ضروری ہے۔

نہرو رپورٹ

نہرو رپورٹ نے ایک وفاقی طریقہ حکومت کے لئے سفارش کی جس میں بچی کھچی طاقتیں مرکز کے قبضہ میں تھیں
مخلوط انتخاب اور مسلمانوں کے لئے اُن صوبوں میں جہاں وہ اقلیت میں تھے نشستیں ریزرو ہوں اور
مسلمانوں کے لئے مرکز میں کوئی ریزرویشن (تحفظ) نہ ہو اور وہاں پر اُن کو کل نشستوں میں سے کم و بیش ایک
چوتھائی ملیں۔

دوسری جانب مسلم مطالبہ کی خصوصیات یہ تھیں کہ بچی کھچی طاقتیں صوبجات کے قبضہ میں ہوں۔ سندھ، بلوچستان اور
اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ بحیثیت علیٰحدہ صوبجات کے بنیں۔ اور اُن کو ایک ہندستانی صوبہ کے تمام سیاسی حقوق ملیں۔ پنجاب
اور بنگال میں مسلم اکثریتیں قائم رکھی جائیں اور مسلمانوں کے لئے تب تک جداگانہ انتخاب قائم رکھا جائے جب تک کہ وہ
اُن کو ترک کر دینا پسند نہ کریں۔ مسلم مذہب اور تمدن کو مستقبل کے نظام حکومت میں کافی قانونی تحفظ ملے مرکزی لیجسلیچر میں
مسلم نمایندگی ایک تہائی سے کم نہ ہونے پائے۔

اب یہاں پر ہم پہلے سے زیادہ صاف طور پر مسلم اقوام کو سندھ، شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان کے مسلم باشندوں کی علیحدگی اور برابری کے لئے اور پنجاب اور بنگال کے مسلم باشندوں کے آزاد وجود کے لئے مطالبہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

اُس وقت جبکہ ہندستانی باشندوں کے نمائندے ایک آزاد ہندستان کے لئے نظامِ حکومت بنا رہے تھے، مختلف مسلم اقوام اُٹھ آتی ہیں اور آزادی کے اس ڈھانچہ میں مکمل اور بے روک ٹوک جمہوری آزادی کا مطالبہ کرتی ہیں . . . یہ مطالبہ کہ ہندو بھائیوں کی [illegible] DOMINATI[illegible] اقوام کو یہ واضح کر دینا چاہئے کہ ہندستان کی [illegible] حیثیت [illegible] کیا مطلب ہوگا؟ اُن کے الفاظ میں اس کا کس طرح ترجمہ کیا جائے گا۔ وہ [illegible] نشوونما کے لئے [illegible] امکانات پیدا کرے گی۔

کیا یہ وہی جمہوری آزادی نہ تھی جس کے لئے کانگریس لڑ رہی تھی؟ کیا کانگریس نے خود بحیثیت ایک ایسی بڑی سیاسی تنظیم کے، جو ایک بہت بڑی حد تک ہندستان کے مسلمانوں میں یہ جمہوری بیداری پیدا کرنے کی ذمہ دار تھی، [illegible] بیداری پیدا نہیں کی؟ جس طرح ہندستان کے مختلف باشندوں میں ایک بالائی احساس [illegible] اور ابھی تک [illegible] ہوئے علوم نئی ترقی یافتہ آندھرا والے، تامل والے، مہاراشٹری، کناری وغیرہ بڑے بڑے [illegible] UNITS میں تبدیل ہو جاتے ہیں [illegible] طرح سیاسی [illegible] کی ترقی [illegible] مسلم باشندوں کے اس مطالبہ کی صورت میں ظاہر ہو رہی تھی۔

اور صرف اس [illegible] جمہوری ترقی کو تسلیم [illegible] مکمل آزادی کا حق [illegible] باہمی امداد حاصل [illegible] مجموعی [illegible] اور قدم آگے بڑھانا [illegible] یہ [illegible] کا نتیجہ تھا کہ جب کانگریس نے اپنی سول نافرمانی کی جدوجہد سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۳۲ء میں جاری کی تو تمام مسلمان اُس سے متاثر نہ ہو سکے۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے وقت [illegible] اور اس کے بعد اتحاد کے لئے دوبارہ کوشش کی گئی لیکن وہ بھی [illegible] ثابت ہوئی۔ سنہ ۱۹۳۶ء تک حالات اسی طرح چلتے رہے جبکہ نیا نظامِ حکومت بنایا گیا۔

الیکشن اور اُن کے بعد

الیکشن میں کانگریس کی زبردست فتوحات اور کانگریس اکثریت کے صوبوں میں ایک جماعت کی وزارتیں بننے کے بعد، کانگریس کی امید کے قطعی برخلاف واقعات رونما ہوئے۔ کانگریس کے اندر ہندو مسلم اتحاد قائم ہو جانے کے بجائے مسلم عوام کانگریس سے دُور اور زیادہ دُور ہٹتے چلے گئے۔

مسلم لیگ میں اب نئی زندگی آگئی۔ مسلم عوام کے سرمایہ داری کے خلاف جذبات نے اپنے آپ کو مسلم لیگ کے نئے [illegible] کی صورت میں ظاہر کیا جو آزاد جمہوری حکومتوں کے فیڈریشن کی صورت میں [illegible] آزادی کا

حاصل کرنا جس سے نظام سلطنت میں مسلمانوں کے حقوق ٹھیک اور موثر طریقہ میں محفوظ ہوں"۔ ... ہوگیا۔
یہاں پر ہم پھر یہ دیکھتے ہیں کہ جب ہندستان کی آزادی کا سوال حکم الیوم کی صورت میں رکھا جاتا ہے تو مسلم اقوام کا مطالبہ بھی مقصد کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے کہ ہندستان کا مستقبل ایک آزاد جمہوری حکومتوں کا فیڈریشن ہوگا۔

کانگریسی وزارتوں کے زمانہ میں نہ صرف کوئی ہندو مسلم مسئلہ کا حل ہوا بلکہ وہ اور بھی بدتر حالت پر پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ جب ستمبر ۱۹۳۹ء میں جنگ کا اعلان ہوا اور کانگریسی وزارتوں نے دسمبر میں استعفیٰ دے دیا تو لیگ اس حد تک گئی کہ یوم نجات منایا۔

جنگ نے ہندستان کی آزادی کے سوال کو ایک فوری امر بنا دیا۔ پھر بھی کانگریس اور لیگ ۱۹۱۶ء کی طرح متحد ہونے کے قابل نہ ہوئیں۔ جس وقت کانگریس نے فوری آزادی اور مجلس انتظامیہ کو بنانے کا مطالبہ کیا مسلم لیگ نے اپنا مشہور پاکستان ریزولیوشن ۱۹۴۰ء میں لاہور میں پاس کیا۔ جس کی رو سے ہندستان کے شمالی مغربی اور مشرقی مسلم اکثریت کے خطوں میں ذاتی حکومت کا مطالبہ کیا گیا۔ جنگ جاپانی خطرہ اور فاشسٹوں کے حملے کا یہ تقاضا تھا کہ ان دو بڑی سیاسی تنظیموں میں فوراً اتحاد ہو جائے۔ لیکن وہ کرپس گفت و شنید کے زمانہ میں بھی متحد ہونے میں کامیاب نہ ہوئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرمایہ دار رجعت پرست ہندستان کو کوئی طاقت دینے سے انکار کرنے کے قابل ہو گئے۔

تب سے اب تک حالت متواتر بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ سخت اقتصادی تباہی قحط اور بیماریاں ہندستانیوں کو برباد کئے ڈالتے ہیں۔ نوکر شاہی ہمارے سروں پر یکے بعد دیگرے تباہی پر تباہی لادتی چلی جا رہی ہے۔ لیکن ہماری نااتفاقی کی وجہ سے ہندستانی اور اُن کی قیادت کرنے والی کانگریس اور لیگ اپنی قوم کی خدمت کرنے کے موقع سے اس سخت خطرہ کے زمانہ میں محروم کردی گئی ہیں۔

آزادی کا راستہ

پھر ہمارے لئے اس سے نکلنے کا کیا راستہ ہے؟ کس طرح ہماری دونوں قومی تنظیمیں یک زبان ہو سکتی ہیں؟ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اُس کو ثابت کرنا چاہئے کہ مسلمانوں اور مسلم لیگ کے مطالبات کی جداگانہ انتخاب اور علیحدہ نمایندگی سے خود اختیاری اور مسلم صوبوں کے لئے بچی کھچی طاقتوں۔ خود ارادیت اور "پاکستان" کی حد تک ترقی کو رجعت پرستی اور فرقہ بندی کی ترقی نہ سمجھنا چاہئے۔ لیکن یہ سرمایہ داری کے خلاف ترقی کا قدم اقوام کے قومی جمہوری جذبہ کا بڑھتا ہوا اظہار ہے۔

یہ مطالبہ بڑھا ہے اور ہندستانی قومی تحریک کی آزادی کی جانب ترقی کے ساتھ زیادہ واضح اور زیادہ مضبوط ہوگیا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس کو عام قومی تحریک کے راستہ میں ایک رکاوٹ سمجھا جائے۔

جیسا کہ اُردو کے زبردست شاعر ڈاکٹر اقبال نے اپنے ۱۹۳۳ء کے مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں کہا:۔

"اگر اس اصول کو کہ ہندستانی مسلمان اس وطن میں ذاتی تمدن اور اپنی روایات کے ساتھ مکمل اور آزاد ترقی کا مجاز ہے، ایک مستقل فرقہ وارانہ سمجھوتہ کی بنا تسلیم کر لیا جاتا ہے تو وہ اپنا سب کچھ ہندستان کی آزادی کے داؤں پر لگانے کے لئے تیار ہو جائے گا۔

اگر اس روشنی میں دیکھا جائے تو یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ بنیادی طور پر کانگرس اور لیگ آج ایک دوسرے سے بہت نزدیک ہیں۔ حالانکہ ظاہرا وہ بہت دور معلوم ہوتی ہیں دونوں ہندستان کی آزادی چاہتی ہیں اور دونوں کو خود ارادیت کے اصول پر اعتقاد ہے۔ دونوں اُن مختلف اقوام کے بہترین اور اعلیٰ جذبات کی نمایندگی کرتی ہیں۔ جو کہ ہمارے مُلک میں موجود ہیں۔

اب اگر کانگریس پاکستان کے مطالبہ کو اس روشنی میں دیکھیں اور اگر مسلم لیگی اپنی تنظیم اور وزارتوں کے لئے ایک ترقی پذیر عام پسند اور جمہوری پروگرام قبول کر لیں تو ایک ایسی حالت پیدا ہو جائے گی جس میں ان تنظیموں کے درمیان اتحاد کو روکا نہ جا سکے گا۔

اس اعلیٰ مقصد کے لئے ہر ہندستانی محبِ وطن کو اپنی تمام کوششیں صرف کرنی چاہئیں۔

مسٹر آرتھر مور —— (یورپین گروپ)

اگست ۱۹۴۲ء کی سیاسی بے چینیوں کے بعد میری نظر میں موجودہ تعطل کو دور کرنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ وائسرائے مسٹر جناح کو ایک قومی حکومت کی تشکیل کرنے کی دعوت دے ——— ایک ایسی قومی حکومت جس کی تمام تر کوشش جاپان کو شکست دینے کے لئے وقف ہو۔ جاپانیوں کے اندر قربانی کا وہ جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے جس سے آج ہم یکسر عاری ہیں۔ وہ آج پورے جنوبی مشرقی ایشیا اور وہاں کے تمام ذرائع کے مالک ہیں اور ہندستان کی سرحد پر اُن کا وجود خطرات سے پُر ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تک سوویٹ علاقہ جرمنوں سے خالی نہیں ہو جاتا اور روس ادھر سے نجات پا کر مشرق کی طرف نہیں متوجہ ہوتا اُس وقت تک جاپان پر مہلک حملہ کرنا دشوار ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں لندن کی حکومت سے بیزار ہیں اور اس سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ برطانیہ سے جدا ہو کر جاپان کے چنگل میں پھنسنا نہیں چاہتے۔ جاپان سے جنگ کرنے میں ہندستانیوں ہی کا زیادہ فائدہ ہے، اس لئے کہ برطانیہ کی اصلی جنگی طاقت تو لازمی طور پر جرمنی کو شکست دینے کے لئے وقف ہے۔ گاندھی جی بین الاقوامی امن وسکون کے پُرخلوص حامی ہیں، چنانچہ فرانس کی شکست کے بعد اور ہٹلر کے "جنگ برطانیہ" چھڑنے سے پہلے اُنھوں نے تمام اہل برطانیہ کے نام ایک پیغام ارسال کیا تھا جس میں اُن سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ ہٹلر اور مسولینی کے سامنے پورے طور پر ہتھیار ڈال دیں۔ پھر جب جاپانی ملایا اور برما میں داخل ہو گئے تو اُنھوں نے ہندستانیوں کو بھی یہی رائے دی۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص زمانہ جنگ میں ہندو یا مسلمان کسی کی بھی رہنمائی کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اور گاندھی جی اس رہنمائی کے خواہش مند بھی نہیں ہیں۔ اگرچہ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اپنی رائے کے رد ہونے کے بعد بھی گاندھی جی اس بات پر مسرور تھے "جنگ برطانیہ" میں ہٹلر نہیں بلکہ برطانیہ کی فتح ہوئی

باب دوسرا

مسئلۂ پاکستان اور حقِ خود ارادیت

ڈاکٹر سید عابد لطیف
مولانا طفیل احمد
سوامی سہجانند سرسوتی

ہندستان کا آئندہ دستورِ اساسی اور پاکستان

از: ـــــــــ ڈاکٹر سیّد عبداللطیف (حیدرآباد)

ہندستان کے آئندہ دستور اساسی اور پاکستان کے موضوع پر جناب ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے مسٹر محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر راجندر پرساد اور پنڈت جواہر لال نہرو سے جو خط و کتابت کی تھی اُسے شیخ محمد اشرف پبلشر کشمیری بازار لاہور نے حال ہی میں کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں جو انگریزی میں ہے، ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کا ایک پیش لفظ بھی شامل ہے جس میں اُنھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کی تجویز پاکستان کے مضمرات (جسے سنہ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے اجلاس میں منظور کیا گیا تھا) اور آئندہ دستور اساسی میں پاکستان کے لئے موزوں مقام کے تعین کی ضرورت پر بحث کی ہے۔ اس پیش لفظ میں جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان کی سب سے پہلی اسکیم جو آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے سامنے غور و خوض کے لئے پیش کی گئی وہ ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب ہی کی مجوزہ تھی۔ اور لیگ کی تجویز اُسی اسکیم کی ترمیم صورت تھی۔ دونوں کا باہمی فرق اس بات میں مضمر ہے کہ جہاں ڈاکٹر صاحب پاکستانی مملکتوں کو ایک کل ہند یونین میں دیکھنا چاہتے ہیں وہاں مسٹر جناح اُن مملکتوں کی مکمل علٰحدگی پر مصر ہیں۔

اس کتاب کو نواب ڈاکٹر ناظر یار جنگ ایم۔ اے، ایل ایل۔ ڈی، بار ایٹ لا سابق جج حیدرآباد

ہائی کورٹ، ممبر کورٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے مرتب فرمایا ہے چنانچہ وہ اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"اس وقت جب کہ مسلم لیگ نے ارادۃً ایک بالکل الگ تھلگ پاکستان کی پالیسی سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لیگ کے رہنما ان مسلسل کوششوں کی قدر و قیمت کا کھلم کھلا اعتراف نہ کریں جو ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کی جانب سے کی جاتی رہی ہیں۔ جن کا مقصد مسلم لیگ کو ایک ناممکن العمل پوزیشن سے بچانا اور پاکستان کو بقیہ ہندستان سے منسلک کر کے لیگ کے زاویۂ نگاہ میں ارتباط و ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ لیکن وہ وقت بہت قریب آرہا ہے جب کہ لیگ اپنے طرزِ عمل پر نظر ثانی کر لے اور اپنے مطالبہ کو ایسی شکل دینے پر مجبور ہو گی کہ مسلمانان ہمہ ایک زیادہ وسیع اور مکمل زندگی میں حصہ لینے کے قابل رہیں جو ایک الگ تھلگ پاکستان میں ممکن نہ ہو گا۔ اس نازک وقت کے لئے جو بہر صورت آئے گا ڈاکٹر سید عبداللطیف نے بہت کافی انتظام کر دیا ہے۔"

ایڈیٹر

ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب اپنے پیش لفظ میں فرماتے ہیں:-

"آخر میرا نقطہ نظر کیا ہے؟ میں پاکستان کا یا شمال مشرق اور شمال مغرب میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں خود مختار مملکتوں کے قیام کا مخالف نہیں ہوں اس کے متعلق کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے خود لیگ کے قائدین کے اعتراف کے بموجب پہلی مرتبہ ہر تہذیبی منطقے کے لئے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلم خود مختار وحدتوں کا تصور پیش کیا اور جس نے سب سے پہلی مرتبہ اس اساس پر دستور ہند کا خاکہ تجویز کیا پاکستان کی مخالفت کرے۔ مجھے مسلم لیگ یا زیادہ متعین طور پر لیگ کے صدر مسٹر جناح کے نقطۂ نظر سے اختلاف ہے جو میری رائے میں قرار دادِ لاہور کی اسپرٹ کے منافی ہے —— مسٹر جناح مصر ہیں کہ پاکستانی مملکتیں الگ تھلگ ہوں اور بقیہ ہندستان سے ان کا کوئی دستوری تعلق نہ ہو۔ برخلاف اس کے میرا یہ خیال ہے کہ یہ صورت حال پاکستانی مملکتوں کے لئے خودکشی کا باعث ہوگی۔ میرا یہ ادعا ہے کہ ان مملکتوں نیز ہندو علاقوں میں جو اقلیتیں پھیلی ہوئی ہیں ان دونوں کا دوامی مفاد اسی میں ہے کہ پاکستانی مملکتیں داخلی طور پر بالکل آزاد اور خود مختار رہتے ہوئے بقیہ ہندستان سے منسلک رہیں اور چند اقل ترین امور کے اہتمام میں جو پورے ہندستان کے لئے مشترک ہیں دیگر مملکتوں کے ساتھ مساویانہ طور پر شریک ہوں —— میں نے علٰحدگی کے مضمرات بالخصوص اس کے جغرافی اور معاشی پہلو پر نہایت احتیاط سے غور کیا ہے اس غور کے بعد مجھے اس نتیجہ پر پہنچنا پڑا کہ مجوزہ مملکتیں بقیہ ہندستان سے علٰحدہ ہونے کے بعد جلد یا بدیر اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے قابل نہیں رہیں گی۔ اور نتیجۃً یا تو کسی بیرونی قوت کی دست نگر بن جائینگی یا عاجز آکر ہندستانی اتحاد میں واپس آنے پر مجبور ہوں گی۔ جس کے تصور ہی سے مجھے روحانی تکلیف ہونے لگتی ہے —— قرار دادِ لاہور کے

اصول کے تحت آپ پاکستانی مملکتیں صرف انہی رقبوں میں قائم کر سکتے ہیں جہاں مسلمان حقیقی اور نمایاں اکثریت میں ہیں۔ اس اصول کے لحاظ سے آپ کو پنجاب کے نصف حصہ یعنی انبالہ ڈویژن اور وادی کانگڑہ سے دست بردار ہو کر لاہور کے مغرب میں محدود ہو جانا پڑے گا۔ شمال مشرق میں آپ مشرقی بنگال اور آسام کے ضلع سلہٹ سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اگر آپ کسی وجہ سے اس سے بڑی مملکتیں قائم کرنا چاہیں تو اس کی صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ کہ تبادلہ آبادی کے ذریعے شمالی رقبہ کے ملحقہ مسلمانوں کو اپنے رقبہ میں جذب کرنا پڑے گا اور اس بنا پر مزید رقبہ مانگنا پڑے گا یا ملحقہ غیر مسلم رقبوں کی رضامندی سے ان کو اپنی پاکستانی مملکتوں میں شامل کرنا ہو گا تبادلہ آبادی کو تو آپ پسند نہیں کرتے۔ آپ قدیم مسلمانوں کے برخلاف زمین پیوست ہیں ایسی صورت میں صرف آپ کے لئے صرف ایک ہی چارہ کار رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ آپ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے غیر مسلموں کی رضامندی حاصل کریں۔ اگر آپ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تو یقیناً آپ کو مجوزہ مملکتیں مل جائیں گی۔ لیکن ان مملکتوں میں صحیح معنوں میں مسلم مملکت کی لابدی خصوصیات موجود نہیں ہوں گی۔ یہ مخلوط مملکتیں ہوں گی نہ کہ پاکستان۔ ان کی حکومتیں بھی مخلوط ہی ہوں گی۔ جیسا کہ آپ کی خواہش ہے آپ ان مملکتوں میں "حکومت الٰہیہ" کے نفاذ کی توقع نہیں کر سکتے۔ نہ غیر مسلم رعایا کو ذمی یا زیر اماں رعایا قرار دے سکتے ہیں۔ اور یہ آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ یہ مخلوط مملکت چھوٹے پیمانے پر بجائے خود ایک ہندوستان ہوں گی جس میں آپ انھیں قدیم فرقہ داری مسائل سے دوچار ہوں گے جو قرارداد لاہور کے مجوزہ حل سے ہٹ کر کسی اور حل کے متقاضی ہوں گے۔

لیکن اگر مسلم لیگ حقیقی پاکستان کی خواہاں ہے تو پھر اس کو شمال مشرق اور شمال مغرب کے ان رقبوں پر حکومت کا خیال ترک کر دینا چاہئے جہاں غیر مسلم بڑی اکثریت میں ہیں۔ ایسا مطالبہ دوسری جماعتیں ضرور کریں گی جب آپ حق خود ارادیت کا استعمال کرنے لگیں۔ اس حق کے تحت آپ کو دو فلاکت زدہ قطعات سے زیادہ کچھ نہیں ملے گا جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اور جس میں مسلمان فی الحقیقت اکثریت میں ہیں۔ یعنی وہ دو قطعے جن کو بحر و بر کے فاصلوں نے جدا کر دیا ہے اور جو ایک متحدہ زندگی یا وفاقی نظم و نسق پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔ لیگ کے بعض دانشمند حضرات نے پاکستان کے ان دو نقطوں کے درمیان ایک زنجیر کے قیام کا مشورہ دیا ہے یعنی وہ چاہتے ہیں کہ غیر مسلموں کے اکثریتی رقبوں کے درمیان سے ایک طویل زنجیرہ مسلمانوں کے لئے قائم کیا جائے۔ کیا یہ مطالبہ درست ہے؟ کیا قرارداد لاہور اس کی اجازت دیتی ہے؟ یہ صحیح ہے کہ سمندر خدا کی ایک ملک ہے اور یہ دو پاکستانی مملکتوں کو ملا سکتا ہے جیسا کہ سلطنت برطانیہ کے مختلف علاقوں کو ملاتا ہے کیا آپ ایک طاقتور بحریہ قائم کر کے اس تعلق کو بالخصوص جنگ و جدل کے زمانہ میں برقرار رکھ سکتے ہیں؟

علاوہ ازیں کیا آپ اپنے اس قدر محدود اور غیر ترقی یافتہ معاشی ذرائع کے ساتھ ایک عصری مملکت قائم کر سکتے ہیں؟ کیا جدید حالات کے تحت بغیر امداد کے مدافعت کے مصارف برداشت کر سکتے ہیں؟ کیا آپ کے پاس اہم صنعتوں کے لئے خام اشیاء موجود ہیں یا آپ وہ قدرتی ذرائع رکھتے ہیں جو آپ کو خود مکتفی بنانے کے لئے ضروری ہیں؟ اور پھر کیوں آپ خود کو ہندوستان کے عظیم تر ذرائع سے محروم کرتے ہیں جن پر آپ کو پیدائشی حق حاصل ہے۔

جغرافیائی اور معاشی محوظات سے ہٹ کر آپ کا الگ تھلگ پاکستان اُن کروڑ ہا مسلمانوں کے کیا کام آئے گا جو آزاد ہندو علاقوں میں دائمی یتیموں کی حیثیت سے چھوٹ جائیں گے۔ لاہور قرار داد میں ان مسلمانوں کے لئے ابتدائی تحفظات (MALDATORY SAFEGAURDS) تجویز کئے گئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان ابتدائی تحفظات کو کونسی طاقت (MAUDATORY AUTHORITY) عملی جامہ پہنائے گی۔ کیا برطانیہ؟ کیا پاکستان؟ اور پھر تعزیرات (SANCTIONS) کیا ہوں گی۔ جب کبھی بھی مسلم اقلیتیں مصیبت میں مبتلا ہوں کیا وہ نافذ کئے جائیں گے؟ کیا ایک خود مختار ہندو مملکت خارجی احتساب EXTERNAL MAUDATE کو قبول کرے گی۔ لیگ کے بعض پرجوش افراد انتقامی کارروائی تجویز کرتے ہیں ان کا منشا یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں مسلم اقلیتیں جب کبھی کچلی جائیں تو پاکستان میں بھی ہندو اقلیتوں کو کچل دیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ پاکستان کے ہندو پابند آئین و قوانین اور وفادار شہری ہیں۔ کیا آپ ایسی صورت میں اُن پر جبر کریں گے؟ کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے؟

منفرد کی ایک مذہبی [illegible] ضرورت کو لیجئے۔ ہم ہندوستان میں ایک مسلم قوم کے وجود کے مدعی ہیں۔ یہ ایک قوم کہاں باقی رہے گی جب [illegible] آزاد [illegible] ریاستوں میں جن کا آپس میں کوئی تعلق نہ ہوگا منقسم کر دیا جائے؟ کیا ہم اُس وقت اپنی تہذیبی وحدت برقرار [illegible] باقی رکھ سکیں گے؟ کیا ہم میں سے وہ جو ہندو منطقوں میں رہ جائیں گے ایک طاقتور غیر مسلم کا شکار ہو کر [illegible] اسلامی زندگی کے اصل دھارے سے کٹ نہیں جائیں گے؟ کیا اس صورت میں مولانا حالی کی یہ پیشین گوئی جو انھوں نے اپنے درد بھرے شکوہ ہند میں کی ہے پوری نہیں ہوگی؟

گو یقیں ہے رفتہ رفتہ یاد ایام سلف　＋　دل سے چھوڑے گی مٹا کر گردشِ دورِ زماں
بھول جائیں گے کہ تھے کن ڈالیوں کے ہم ثمر　　ٹوٹ کر آئے کہاں سے اور بکے آ کر کہاں

کیا ہندوستانی [illegible] دیسی ریاستوں کے مواضعات میں جہاں ہمارے قائدین کا بہت کم گزر ہوتا ہے خود اب یہ حال نہیں ہے کہ [illegible] ہمارے مسلمان بلباس، عادات و اطوار، طرز زندگی یہاں تک کہ اعتقادات میں بھی ہندوؤں کے پست طبقہ سے کچھ زیادہ متفاوت نہیں ہیں؟ کیا ایک مطلق آزاد ہندو مملکت کی تخلیق اور مسلم پاکستان سے اس کی بالکلیہ علحدگی اس صورت حال میں شدت نہیں پیدا کر دے گی؟

اور پھر مسلم دیسی ریاستوں کا کیا حشر ہوگا جو ہندو منطقوں سے محصور ہیں۔ اور جن میں ہندوؤں کی اکثریت ہے؟ کیا وہ ایک طاقتور ہندو مملکت کے ماتحت رہیں گی یا اُن کو ہندوستان کی دولت عام میں کوئی باعزت مقام عطا کیا جائے گا؟

یہ چند ملحوظات ہیں جو لیگ کے غور کے محتاج ہیں۔ انہی ملحوظات کے مد نظر میں نے ۱۹۳۹ء میں اپنا پہلا دستوری اسکیم میں جو کل ہند مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے روبرو پیش کی گئی تھی ہندوستان کے لئے ایک ایسے یونین کے قیام کا مشورہ دیا تھا جو با اقتدار مملکتوں پر مشتمل ہو اور جس کی مملکتیں چند مشترکہ امور کو ایک ایسے مرکز کے تفویض کر دیں جو [illegible] اور ہندوستان کی مسلم اقلیتوں اور مسلم دیسی ریاستوں کے لئے قابل قبول ہو۔ کسی نہ کسی مرکز کی ضرورت [illegible]

ممکن ہے کہ یہ سنجیدہ مسائل کے حل کا صحیح یا جائز طریقہ نہ ہو لیکن یہ بات صاف ہے۔ اگر ہندستان کی سیاسی جماعتیں آئندہ دستور کے متعلق از خود کسی سمجھوتے پر نہ پہنچیں اور برطانیہ کو ثالثی بننا پڑے تو وہ علی الاعلان وفاق کی تائید ہی میں فیصلہ کریگا۔ ممکن ہے کہ یہ وفاق مروجہ طرز کا نہ ہو۔ جس میں اکثریتی حکومت اور پارلیمنٹری عاملہ ہوتی ہے لیکن اس کی حیثیت بہرحال کسی نہ کسی قسم کی یونین کی ہوگی۔ لیگ کو اس بارے میں کوئی مغالطہ نہ ہونا چاہیئے۔ والیان ریاست کو لارڈ لنلتھگو نے جو وداعی خطبہ دیا تھا وہ بظاہر نوشتۂ تقدیر معلوم ہوتا ہے۔

ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ اگر یونین ناگزیر ہے تو دانشمندی اسی میں ہے کہ اس کو گرفت میں لاکر اپنے مقصد کے مطابق بنایا جائے، ورنہ ایک طرف حکومت برطانیہ اور دوسری طرف غیر مسلم جماعتوں سے جنگ کرنی ہوگی۔ کیا ایک الگ تھلگ پاکستان کے لئے جو ہمارے لئے ایک خواب پریشاں ہوگا جنگ کرنی چاہیئے؟ یہ تو حق خودکشی کے لئے جنگ کرنا ہے۔ کوئی ایسا بلند اور عظیم تر مقصد یا نصب العین ہونا چاہیئے جس کے لئے جنگ ضروری ہو۔ مناسب ہوگا کہ لیگ خود مختار مملکتوں کے یونین کی ایک اسکیم خود مرتب کرے اور ایسے مرکز کے خصوصیات کا تعین کرے جس میں ہمارے لئے کوئی خوف نہ ہو۔ جہاں سے ہم مسلم اقلیتوں اور مسلم دیسی ریاستوں کے مفادات کی حفاظت کرسکیں۔ دوسروں کے ساتھ مساویانہ حیثیت کے ساتھ شریک ہوکر ہندستان کے مشترکہ امور کا انتظام کریں۔ اور اس طرح ایک عظیم تر اور کامل تر زندگی میں حصہ لینے کے قابل ہوں۔ صفحات ۵۰ تا ۵۷ پر جس دستوری اسکیم کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اور جسکی نسبت اس کتاب میں بہت کچھ مواد بشمول مراسلت مسٹر جناح دقائدین دیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ جدید اسکیم کی ترتیب میں مفید ثابت ہو اور اس کو جلد سے جلد مرتب کرلینا چاہیئے اس میں وقار کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اگر مسلم لیگ ایسا کرے تو وہ دراصل قرارداد لاہور کے آخری فقرے کی تکمیل کرے گی جس پر اب تک توجہ نہیں کی گئی تھی۔ اگر یہ ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ ہم نے آدھی جنگ جیت لی۔ اس وقت دنیا آپ کے ساتھ ہمدردی کرے گی کیونکہ آپ ایک استحکام کا نقشہ پیش کریں گے نہ تقسیم اور افتراق کا۔ ہمیں اپنے شرائط گنوانے چاہئیں۔ احتراز و گریز کی پالیسی کوئی مردانہ پالیسی نہیں ہے۔ اگر ہم معقول طریقہ پر اپنی پوری ضروریات کو پیش کریں تو ہم ہر اس قوت سے لڑسکیں گے جو ہم کو اُن سے عمداً محروم رکھنا چاہیگی۔

موجودہ صورت حال کیا ہے۔ ہندستان کی سب سے بڑی جماعت یعنی کانگریس ایک ایسی یونین کے قیام پر آمادگی ظاہر کرچکی ہے جس کی وحدتوں کو اقتدار اعلیٰ کے اہم اجزا حاصل ہوں یعنی زیادہ سے زیادہ خود مختاری، اختیارات غیر مصرحہ، اور حق علٰحدگی، چھوٹی جماعتیں بالخصوص ہندو مہا سبھا اور لبرل پارٹی آخری دو شرائط پر آمادہ نہیں ہیں۔ لیکن ان کی آواز ثانوی اہمیت رکھتی ہے۔ برطانوی ذہن خود مختار وحدتوں

قومی اتحاد کس طرح پیدا ہو سکتا ہے اور موجودہ سیاسی گتھی کس طرح سلجھ سکتی ہے

از ـــ طفیل احمد منگلوری

مندرجہ بالا عنوان موقر رسالہ "نئی زندگی" کی طرف سے ایک سوال ہے جس کا مجھے جواب دینا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی سیاسی گتھی بغیر قومی اتحاد کے نہیں سلجھ سکتی۔ ۱۹۱۶ء میں جب ہندوستان کو مزید اصلاحات دیے جانے کا مسئلہ درپیش تھا تو خوش نصیبی سے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مشہور سمجھوتہ ہوا اور اسی کی بدولت کونسلوں میں ہندوستانی وزیروں کو انتظامی اختیارات کا ایک حصہ ملا جو اس سے پہلے کبھی نہ ملا تھا۔ بالخصوص اسی وقت سے اہلِ ہند اس بات کی تمنا کرتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں میں مستقل اتحاد ہو تاکہ کل ملک کی انتظامی باگ ان کے ہاتھوں میں آ جائے مگر ہوتا یہ ہے کہ جب ہندوستانیوں کو کچھ حقوق کے ساتھ اختیارات مل جاتے ہیں تو تقسیم اختیارات پر اوپر کے طبقہ کے لوگوں کے درمیان کشاکش ہوتی اور کشاکش پھر لڑائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس کا خمیازہ عوام کو بھگتنا پڑتا ہے۔ بالخصوص اب تو یہ حالت ہو گئی ہے کہ مزید اختیارات ملنے سے پہلے ہی تقسیم اختیارات پر باہمی جوتی پیزار ہونے لگتی ہے جس کی وجہ سے عوام کی زندگی تلخ ہے اور فی الجملہ اہلِ ہند کا قدم بجائے آگے بڑھنے کے پیچھے ہٹتا چلا جاتا ہے ——— اس رجعت قہقری کے وجوہ و اسباب تلاش کرنے اور موجودہ سیاسی گتھی سلجھانے کے لئے ضروری ہے کہ اول ملک کے گذشتہ حالات کا جائزہ لیا جائے اور اس ذریعہ سے مرض کی صحیح تشخیص کی جائے جس کے بغیر کوئی علاج کارگر نہیں ہو سکتا۔

سیاسی احساس حکام کے ذریعہ سے

ہندوستان میں اہلِ ہند کی حکومت کے خاتمہ پر انگلستان کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی حکومت ۱۷۵۷ء سے شروع ہوئی۔ ہندوستانیوں کی بدقسمتی سے اس کمپنی کے لوگوں نے ہندوستان کو اپنا گھر نہ بنایا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف کمپنی کا منافع انگلستان جاتا بلکہ کمپنی کے ملازم جو کچھ کماتے وہ اپنے گھر لے جاتے اور کمائی کرنے کے لئے ہندوستانیوں پر طرح طرح کی زیادتیاں کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کو ان دست درازیوں سے بچانے کی

کوشش انگلستان کی حکومت کرتی رہتی تھی۔ چنانچہ کمپنی کے سب سے پہلے گورنر جنرل لارڈ کلایو پر اس جرم میں مقدمہ قائم کیا گیا کہ انھوں نے علاوہ ۲۴ لاکھ روپیہ اپنے گھر بھیجا تھا اور [illegible] ہزار روپیہ سالانہ آمدنی کی جائداد پیدا کی تھی۔ مقدمہ قائم ہونے کے صدمہ میں لارڈ موصوف نے خودکشی کر لی۔ اسی طرح دوسرے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز پر ہندوستانی رعایا پر ظلم کے قصور میں مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمہ کے سلسلہ میں ایڈمنڈ برک اور دوسرے قابل ممبران پارلیمنٹ کی تقریریں جب ہندوستان میں شائع ہوتی تھیں تو اُن سے ہندوستانیوں میں سیاسی احساس پیدا ہونے کے ساتھ تاج برطانیہ کی عظمت اور ہمدرد انگریزوں کی محبت کے جذبات موجزن ہوتے تھے۔ اس قسم کے مقدمات کا اعادہ ہر بیس سال بعد اس وقت ہوتا رہتا تھا جبکہ کمپنی کے چارٹر کی تجدید کے سلسلہ میں ہندوستان میں کمپنی کے انتظامات کی خامیاں دکھائی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ معزول اور مظلوم راجاؤں اور نوابوں اور عوام کی اپیلیں انگلستان کی اعلیٰ عدالتوں میں پیش ہوتی رہتی تھیں۔ چنانچہ [illegible] میں گورنر مدراس نے مذہب عیسوی کی اشاعت کی غرض سے جب انجیل کی تعلیم گورنمنٹ اسکولوں میں جاری کی تو اہل ہند کے احتجاج پر کورٹ آف ڈائرکٹران نے گورنر مدراس کے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ غرضکہ باوجود حکومت انگلستان کی نگہداشت کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدت دراز یعنی ایک صدی تک جاری رہی یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں کمپنی کے خلاف رعایا نے سخت ہنگامہ برپا کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۸ء میں تاج برطانیہ نے کمپنی کا ٹھیکہ توڑ کر ہندوستان کی حکومت کا براہ راست چارج لے لیا۔ اُس وقت بکثرت سول اور فوجی افسروں نے عام ناراضی کی وجوہ کی تحقیقات کر کے کمپنی کی طرز حکومت کے خلاف اس غرض سے کتابیں لکھیں کہ تاج برطانیہ کی حکومت میں اُن غلطیوں کا جن کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ واقع ہوا اعادہ نہ ہو۔ اسی مضمون پر (سر) سید احمد خاں نے جو اُس وقت منصفی کے عہدہ پر ممتاز تھے اور حکومت کے مسلم خیر خواہ تھے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر کمپنی کی بد انتظامیوں کو طشت از بام کیا اور اس کا ترجمہ اپنے دوست مسٹر آکلینڈ کالون سے جو بعد میں صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر ہوئے انگریزی میں کرا کر جملہ ممبران پارلیمنٹ کے پاس نام بنام بھیجا۔ اُسی زمانہ میں ہندوستانیوں کے فائدے کیلئے انگلستان میں "انڈین ایسوسی ایشن" اور اس کی شاخیں ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کے نام سے قائم کی گئیں، جن کے ممبر انگریز اور ہندوستانی عہدہ دار اور زمیندار ہوتے تھے۔ اُس کی ایک شاخ (سر) سید احمد خاں نے اپنی سب ججی کے زمانہ میں علیگڈھ میں قائم کی۔ اُس کے ذریعہ سے ہندوستانیوں کی عام تکالیف براہ راست پارلیمنٹ تک پہنچائی جاتی تھیں۔ اس وقت یہ سب سیاسی کام حکام وقت انجام دیتے تھے۔

کانگریس کا اہم مقصد

کمپنی کے عہد میں ملک کی حکومت میں رعایا کا کوئی حصہ نہ تھا۔ برخلاف اس کے تاج برطانیہ نے ہندوستان کا چارج لینے کے تین سال کے اندر ۱۸۶۱ء میں وائسرائے کی کونسل میں تین ہندوستانی ممبر نامزد کر کے امور سلطنت میں اُنھیں رازدار بنایا۔ اور ہندوستانیوں کو بڑے بڑے عہدے دینے شروع کئے۔ اور لارڈ رپن وائسرائے نے ہندوستانیوں کا مرتبہ بلند کرنے میں ایک اور قدم بڑھایا۔ وہ یہ کہ لوکل بورڈوں میں طریقہ انتخاب جاری کر کے ہندوستان کو سیاسی تربیت کا سبق دینا شروع کیا۔ مختصر یہ کہ ہندوستانیوں میں سیاسی احساس پیدا کرنے کی ابتدا پارلیمنٹ اور حکومت برطانیہ کے عہدہ داروں اور انگریز بہی خواہان ہند کے ہاتھوں سے ہوئی۔

کونسل وزیر ہند توڑنے کی تجویز

اب دیکھنا یہ ہے کہ کانگریس نے ابتدا میں اپنے منصوبہ کے تحت میں کس قسم کی تجاویز پاس کیں اور ان کا ماحصل کیا تھا؟ ان کے ملاحظہ سے معلوم ہوگا کہ سب سے پہلے اجلاس میں یہ اہم تجویز پاس کی تھی کہ انگلستان کے وزیر ہند کی کونسل توڑ دی جاے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ لندن کی جگہ کلکتہ برٹش حکومت کا مرکز بن جاتا اور اس سے انگریزوں اور ہندستانیوں کے مادی منافع مشترک ہو جاتے اور دونوں قوموں کی باہمی کشاکش کا خاتمہ ہوکر ان میں یکجہتی پیدا ہو جاتی اور نہ صرف ہندو مسلمانوں میں بلکہ ہندو مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد قائم ہوکر ہندستان پر صحیح معنوں میں "تبلیغی حکومت" قائم ہو جاتی اور ہندستان کے اتحاد ثلاثہ پر شہنشاہ اکبر کے زمانہ کی مانند یہ شعر صادق آتا ہے

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

کونسل وزیر ہند ٹوٹنے کے فواید

وزیر ہند کی کونسل ٹوٹنے کے بعد یہ نتیجہ ہوتا کہ ہندستان کا وائسرائے انگلستان کے وزیر ہند کی حکومت سے آزاد ہوکر ہندستان پر ہندستان ہی کے نفع کی غرض سے حکومت کرتا نہ کہ انگلستان کے تاجروں اور سرمایہ داروں کے نفع کے لیے۔ ہندستان میں جب مسلمانوں کی حکومت تھی تو اسلامی ممالک کے امیر المومنین سے سند حاصل کیے بغیر ہندستان کا کوئی بادشاہ حکومت نہ کر سکتا تھا مگر اس کے باوجود حکومت کا مرکز ہندستان میں ہونے کے باعث وہ مجبور تھا کہ خاص ہندستان کے نفع کے لیے یہاں حکومت کرے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کٹر مسلم اور پکا مسلمان تھا۔ ایک بار شریف مکہ نے اس کو لکھا کہ حجاز کے مسلمانوں کی امداد کے لیے کچھ روپیہ بھیجیے اس کا جواب اورنگ زیب نے یہ دیا کہ ہندستان کے غربا اس ملک کا روپیہ پانے کے زیادہ مستحق ہیں۔ ہندستان کو گھر بنا لینے ہی کی وجہ سے مسلمان بادشاہوں کی حکومت یہاں آٹھ سو سال تک امن ہر دلعزیزی کے ساتھ قائم رہی باوجود غیر مذہب رکھنے کے ہر قوم کے لوگ اپنے بادشاہ کو خدا کا نائب سمجھ کر اس کے درشن کرتے تھے اور اگر ان میں کوئی بادشاہ تامل کرتا تو لوگ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے۔

"ہائکسس" قوم نے حضرت عیسیٰ سے اٹھارہ سو سال قبل مصر کے تخت پر قبضہ کرکے ۵۰۰ سال حکومت کی۔ یہ لوگ سامی نسل سے تھے اور غیر ملکی تھے مگر کامیاب حکومت کرنے کے لیے انھیں مصر کو اپنا وطن بنانا اور مصریوں کا طرز معاشرت اختیار کرنا پڑا۔ سکندر اعظم نے ایران کو اپنا وطن بنایا اور اپنے سپاہیوں سے بیاہ کرا کر دنیا میں مشرق اور مغرب کو ایک بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ چین میں تاتاریوں نے جب تخت پر قبضہ پایا تو اس ملک کو وطن بنا کر وہیں کے طریقے اختیار کیے۔ اسی طرح اگر آریوں اور مسلمانوں کی مانند انگریزوں کی حکومت کا مرکز ہندستان میں رہا ہوتا تو اس سے وہ ہندستانیوں کے ساتھ متحد ہو جاتے اور تب دونوں قوموں کے بیچ کے نئے جھگڑے نہ ہو سکتے تھے۔ اس صورت میں اگر ہندستان کا انگریز وائسرائے شخصی سلطنت کے آئین کے مطابق حکومت کرتا تو وہ سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے موجودہ جمہوری طریق حکومت سے ہزار درجہ بہتر ہوتا کیونکہ موجودہ نام نہاد جمہوری حکومت میں سیلاب سرمایہ کی وجہ سے رعایا کی جگت ہو رہی ہے وہ ہرگز نہ ہوتی۔ بہرحال ہندستان کی قسمت اس وقت پھوٹ گئی جبکہ سات ہزار میل دور سے آنے والے انگریز اس بات پر آمادہ نہ ہوئے کہ ہندستان سے صرف دو ہزار میل سے آئے ہوئے مسلمانوں کی طرح وہ ہندستان کو اپنا گھر بنا لیں یا

مثل اُن یورپینوں کے جو امریکہ کینیڈا اور آسٹریلیا میں جاکر آباد ہو گئے اور اُن ملکوں کو اپنے دل و دماغ کے استعمال سے بام ترقی پر پہنچا دیا، یہ لوگ بھی ہندستان کو اپنا دوسرا گھر بنا کر آسے گلزار بنائیں۔ ان لوگوں نے اپنی تنگ نظری سے وزیر ہند کی کونسل ٹوٹنے کی مخالفت کر کے نہ صرف ہندستان کو بلکہ خود سلطنت برطانیہ کو اس قدر سخت نقصان پہنچا یا کہ اُس کی تلافی صدیوں تک نہیں ہو سکتی۔

کانگریس کی اہم تجویز کی مخالفت

جیسا کہ مذکور ہوا وزیر ہند کی کونسل توڑنے کی مبارک تحریک کانگریس نے ۱۸۸۵ء میں اپنے سب سے پہلے جلسہ میں کی تھی۔ کانگریس کی تحریک میں ہندو، مسلمان، اور پارسی نیز ہندستان کے رہنے والے اینگلو انڈین اور عیسائی سب شریک تھے حتیٰ کہ مسلمانوں کے مذہبی پیشوا علمائے کرام نے اُسے لبیک کہا۔ اس کی بدیہی وجہ یہ تھی کہ یہ سب جماعتیں اسی میں ملک و قوم کا نفع سمجھتی تھیں۔ صرف آن انگریز حکام نے اس تحریک کی مضرت محسوس کی جنہوں نے ہندستان کو اپنا گھر نہیں بنایا تھا۔ اور جن کے ذریعہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ کی مانند لارڈ مکالے کے قول کے مطابق ہندستان سے انگلستان تک سونے کے دریا بہنے کا سلسلہ جاری تھا۔ انگریز حکمرانوں کے اس خود غرضانہ طرز عمل سے انگریزوں اور ہندستانیوں کی یک جہتی میں خلل ڈالدیا۔ اور خود ہندستانیوں میں سے کچھ اصحاب کانگریس کی قومی تحریک کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے۔ ان میں سے ایک راجہ شیو پرشاد سی، ایس، آئی پنشنر انسپکٹر تعلیم تھے۔ انھوں نے تعلقہ داران اودھ کے ایک جلسہ میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ دیسی زبان میں فساد انگیز اور بغاوت خیز تقریروں اور تحریروں کی اشاعت کا انسداد کرنے کے لئے حکومت سے درخواست کی جائے کہ وہ کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دے۔ مگر اُس سے زیادہ غضب یہ ہوا کہ سر سید احمد خاں کے پرانے دوست راکلینڈ کالون اور علیگڈھ کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک نے سر سید کو اپنا ہمنوا بنالیا۔ غضب اس لئے ہوا کہ چند سال قبل تک سر سید ہندو مسلمانوں کے ایک قوم ہونے کے دعویدار تھے مگر اب خود اُنھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ "ہمارے ملک میں مختلف قومیں آباد ہیں ایک طرف ہندو دوسری طرف مسلمان تیسری طرف پارسی"۔

کانگریس کی مخالفت کی نوعیت کیا تھی ؟ نوعیت یہ تھی کہ کانگریس کہتی تھی کہ سول سروس کا امتحان ہندستان میں جاری کیا جائے تاکہ غریب ہندستانی، انگلستان جانے کے ناقابل برداشت اخراجات سے بچ جائیں، ہندستانیوں کو فوج کے اعلےٰ عہدوں پر مقرر کیا جائے۔ اُن کے لئے ایک فوجی کالج قایم کیا جائے۔ ملک کے مالیہ سے صیغہ تعلیم پر زیادہ خرچ کیا جائے۔ اس کے مقابلہ میں حکام رس جماعت کی طرف سے ان امور کی مخالفت اس بنا پر کی جاتی تھی کہ اُن کے اجراء سے اکثریت کے لوگوں کو زیادہ نفع پہونچیگا۔ اس کشاکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت سے مزید حقوق حاصل کرنے کی جگہ عام میلان سے ہوئے حقوق کو آپس میں بانٹنے اور اُس پر ایک دوسرے سے لڑنے کی طرف ہوگیا۔ اسی میلان کی وجہ سے مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا وجود میں آئیں اور اُنھیں روز بروز قوت حاصل ہوتی گئی۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ لڑائی پردیسی حکام کے لئے زیادہ طمانیت بخش تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۰۶ء میں لارڈ منٹو وائسرائے کی طرف سے اس بات پر زور دیا گیا کہ مسلم اقلیت کو انتخابی جماعتوں میں جداگانہ حق انتخاب دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء میں اس طریق انتخاب کا اجراء ہوگیا مگر اُسی کے ساتھ لارڈ مارلے وزیر ہند نے کہدیا کہ یہ طریق انتخاب چونکہ

رلیمنٹری حکومت کے منافی ہے اس لئے ہندستان میں پارلیمنٹری حکومت قائم نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ دس سال بعد ۱۹۱۹ء میں جب
ملاحات کا مسئلہ پیش ہوا تو مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے صاف الفاظ میں ظاہر کر دیا کہ ہم "فرقہ وارانہ انتخاب کو حکومت خود اختیاری کے ارتقاء
ں بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں"۔

مذہبی بلووں کے اعداد

"رکاوٹ کیا ہے؟ رکاوٹ یہ ہے کہ جب فرقہ واری کی بنیاد پر ممبر منتخب ہوتے ہیں اور اُن کے ہاتھوں میں انتظامی اختیارات آتے ہیں تو لامحالہ انھیں اپنے ووٹروں کی مرضی کے مطابق عمل کرنا پڑتا ہے۔
س طرح جس جماعت کی اکثریت ہوتی ہے اس کے ممبر بے عنوانیاں کرتے ہیں جس سے انتظامات میں خرابی پڑتی ہے۔ مگر افسوس کہ باوجو
لوا تجربے کے۔ دونوں قوموں کے ممبروں کے دلوں میں مزید اختیارات ملنے کی تمنا تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ
مشہور سمجھوتہ ہوا جس میں جداگانہ انتخاب قائم رکھا گیا اور ۱۹۱۹ء کے قانون میں کونسلوں کو مزید اختیارات دے گئے مگر لارڈ مارلے
ریر ہند نے صاف الفاظ میں لکھا کہ

"فرقہ وارانہ انتخاب سے ہم اژدہا کے دانت زمین میں بو رہے ہیں۔ ان سے جو فصل پیدا ہو گی وہ کڑوی ہو گی"
انچہ یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور ملک میں خوب مذہبی بلوے ہوئے مگر چونکہ اس طریق انتخاب میں ممبروں کو سہولت ہوتی ہے
س لئے وہ برابر قائم رہے۔ چنانچہ ان ہی لوگوں کی مرضی کے مطابق ۱۹۳۲ء میں جب وزیر اعظم نے فرقہ وارانہ فیصلہ دیا تو جداگانہ
نتخاب قائم رکھ کر ۱۹۳۵ء کا قانون وضع کیا گیا۔ راقم الحروف کو سرکاری کاغذات سے صوبہ متحدہ میں چالیس سال کے بلووں کے اعدا
ل ہوئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:۔

	پنجسالہ	تعداد بلوہ جات		پنجسالہ	تعداد بلوہ جات
(۱	۱۹۰۶-۱۰ء	۲	(۵)	۱۹۲۶-۳۰ء	۱۰۳
(۲	۱۹۱۱-۱۵ء	۸	(۶)	۱۹۳۱-۳۵ء	۱۲۱
(۳	۱۹۱۶-۲۰ء	۱۶	(۷)	۱۹۳۶-۴۰ء	۱۷۶
(۴	۱۹۲۱-۲۵ء	۲۸			

اس نقشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پنجسالہ میں جبکہ مخلوط انتخاب تھا صرف دو بلوے ہوئے۔ دوسرے پنجسالہ میں جداگانہ انتخاب
ی ہوتے ہی بلووں کی تعداد آٹھ ہو گئی اور پھر مسلسل بڑھتی رہی حتیٰ کہ ساتویں پنجسالہ میں ۱۷۶ ہو گئی جو ۳۰ سال قبل کی ۸۸ گونہ
داد ہے۔ بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ بلووں کی مصیبت عوام پر پڑتی ہے جو فرقہ وارانہ انتخاب کی وجہ سے جُدا ہو کر ایک دوسرے سے نفرت
تے ہیں برخلاف اس کے کونسلوں اور بورڈوں میں ہندو مسلم ممبران مل جُل کر اپنی مشترک پارٹیاں بناتے ہیں۔ چیرمین وائس چیرمین
کمیٹیوں کی ممبریوں کے لئے بلا معین نشستوں کے مشترک انتخاب کے طریقہ پر ہندو ممبر مسلمان ممبروں کو اور مسلمان ہندو ممبروں کو آزادی
سے ووٹ دیتے ہیں اور اُن سے ووٹ لیتے ہیں اور تین چار سال کے عرصہ میں گہرے دوست بن کر ایک دوسرے کی امداد و معاونت
تے ہیں۔ البتہ ان بڑے لوگوں کے درمیان عہدوں وزارتوں اور ذاتی مفاد کی چیزوں پر جھگڑا ہو جاتا ہے تو اسے فوراً قومی اور مذہبی

مسئلہ بنا دیتے ہیں اور چند روز کی تو تو میں میں کے بعد پھر سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ اور سمجھوتہ کے بعد دونوں ملکر عوام پر حکومت کرتے ہیں اور اس وقت
اس امر کی کچھ پروا نہیں کرتے کہ غریب اقلیت پر کیا گزر رہی ہے۔ مختصر یہ کہ کسی سمجھوتہ کا جو جداگانہ انتخاب پر مبنی ہو نتیجہ اس کے [illegible]
[illegible] طبقہ کے لوگ عوام الناس کو اپنے منافع کا آلۂ کار بناتے ہیں اور تمام بے نواؤں کا [illegible] جمہوری نظام حکومت [illegible]

اس جگہ یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہندستان میں جس طرح آریوں اور مسلمانوں کی حکومتیں اپنے اپنے زمانہ [illegible]
[illegible] میں اسی طرح انگریزوں کی حکومت بھی باعث رحمت و برکت ہوتی اگر اس کا مرکز بجائے انگلستان کے [illegible]
[illegible] ہندستان کے اختیارات نہ آریہ اور نہ مسلمان ملک کے لئے مضر ثابت ہوئے اور نہ انگریز اور ہندستان [illegible]
[illegible] مسلم لیگ کی ابتدائی پالیسی جو غلط فہمی پر مبنی تھی اگر اسی طرح جاری رہی اور اس کے کارکنوں کا اصرار جداگانہ انتخاب [illegible]
[illegible] غلامی [illegible] ہو کر رہیں گے ملک غیر ملکی حکومت کا طوق ابدالآباد تک اہل ہند کے گلے [illegible]
[illegible] مسئلہ باہمی [illegible] کے باعث نہ تعلیم اور نہ [illegible] کا انتظام ہو سکے گا اور نہ باشندوں کو کبھی فارغ البالی [illegible]
[illegible] ہو سکے گی

غلامی اور آزادی سے مراد

گذشتہ صفحات میں متعدد بار غلامی اور اس سے آزادی حاصل کرنے کا ذکر آیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان الفاظ کے معانی کی وضاحت کی جائے۔ اس کے لئے بھی اس ملک کے گذشتہ سیاسی حالات پر نظر ڈالنی پڑے گی۔

جیسا کہ مذکور ہوا کانگریس نے اپنے پہلے جلسہ میں وزیر ہند کی کونسل توڑے جانے کی تجویز پاس کی جو جملہ سیاسی اصلاحات کی بنیاد ثابت ہوتی۔ اور جو اگر کامیاب ہو جاتی تو اسی وقت سے ملک عملاً غیر ملکی حکومت کے جوئے سے نجات پاتا۔ اور اگرچہ وائسرائے انگریز اور عیسائی اور مثل ایک خود مختار بادشاہ کے ہوتا تب بھی انگریزوں کی دماغی برتری کی وجہ سے یہ ملک روز بروز مادی ترقی کرتا چلا جاتا۔ مگر اس اہم تجویز کے ساتھ سال بسال ایسی تجاویز پاس ہوتی گئیں جن سے کونسلوں اور اسمبلیوں میں زیادہ حقوق اور اختیارات اور بڑے عہدے ملتے گئے جن کی تقسیم پر مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا ہمہ وقت لپٹ جھپٹ کرتی رہتی تھیں اس پر زبان اور حروف کے اختلافات کے مسائل کا اضافہ ہو گیا۔ جس سے جملہ اقوام کی تمامتر توجہ اسی قسم کے حقوق کے حصول اور ان کی تقسیم پر رہی۔ اور صوبوں کی وزارتوں اور اگزیکیٹو کونسل کی ممبریوں سے لے کر ملازمت کے بڑے عہدوں تک پر جو ہندستانی قابض ہوئے وہ غیر ملکی حکومت کے آلہ کار بن کر اس کے پنجہ کو روز بروز قوی کرتے چلے گئے۔ باوجود ان موانع کے ہندستان کا سیاسی قدم کچھ نہ کچھ آگے بڑھتا گیا اور غالباً ۱۹۱۱ء میں کانگریس نے اپنے اجلاس میں ہندستان کے لئے سیلف گورنمنٹ یا حکومت خود اختیاری کی تجویز پاس کی اور مارچ ۱۹۱۳ء کے اجلاس لکھنؤ میں مسلم لیگ نے اپنے مقاصد میں "ہندستان کیلئے موزوں (حسب حال) سیلف گورنمنٹ" کے حصول کا اضافہ کیا۔ اور حکومت نے بھی ۱۹۱۷ء کے اعلان میں "حکومت خود اختیاری" کے مطالبہ کو تسلیم کر لیا۔ مگر ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ ہند کے قانون کی رو سے جو کونسلیں اور وزارتیں دی گئیں وہ ہندستان کی توقعات سے کم تھیں اس لئے ۱۹۲۰ء کے اجلاس کانگریس میں "موراج" کو

... العین قرار دیا گیا۔

نصب العین کا ارتقاء

اسی کے ساتھ دسمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس اور جمعیۃ العلماء نے اور دسمبر ۱۹۲۱ء میں مسلم لیگ نے حکومت سے ترک موالات کی تجاویز پاس کی۔ اس کی رو سے سرکاری عدالتوں، ملازمتوں، مدرسوں اور ولایتی کپڑے کا مقاطعہ کیا گیا۔ اس تحریک نے عوام میں اس قدر حرارت پیدا کر دی کہ وہ پولیس کی لاٹھیوں اور بندوقوں کی مار کو شاداں و فرحاں برداشت کرنے اور جیل کی کوٹھریوں کو تفریح گاہیں سمجھنے لگے۔ یہ کیفیت مہینوں جاری رہی۔ یہاں تک کہ ہندوستان کو مزید اصلاحات دینے کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے سائمن کمیشن آیا۔ اس کا عام بائیکاٹ کیا گیا کیونکہ اس کے سب ممبر انگریز تھے۔ البتہ وزیر ہند کی دعوت پر کہ اہل ہند کوئی متحدہ آئین بنا کر پیش کریں آل پارٹیز کانفرنس لکھنؤ کے جلسہ منعقدہ ۲۸ اگست ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کی بنا پر ایک فیصلہ ہوا۔ مگر انجام کار اس میں اس بنا پر اختلاف ہو گیا کہ ایک جماعت نو آبادیات کی قسم کی حکومت کو اپنے ملک کے لئے ناکافی سمجھتی تھی تو دوسری جماعت جداگانہ طریق انتخاب چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ پھر چار سال بعد ۱۹۳۱ء میں ایک اور کوشش باہمی سمجھوتہ کی گئی مگر بنگال اسمبلی میں بعض دو نشستوں کی کمی بیشی پر تمام کھیل بگڑ گیا۔ اسی دوران میں دسمبر ۱۹۲۹ء کے اجلاس کانگریس نے "آزادی کامل" کا اعلان کر دیا۔ اور جب سے اسوقت تک اہل ہند کی طرف سے اس منصوبہ کے تحت میں جدوجہد جاری ہے۔ اس جدوجہد کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان نیز کانگریس اور حکومت کے درمیان سمجھوتوں کے لئے کوششوں کا سلسلہ جاری ہے اور عام خیال یہ ہے کہ اگر مختلف الخیال جماعتوں میں سمجھوتہ ہو جائے تو ہندوستانیوں کی "کامل آزادی" کا منصوبہ پورا ہو جائے گا

پرانے مسلک پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت

مگر حقیقت یہ ہے کہ جبکہ جملہ فریقوں کی ذہنیت اس قدر پست ہے کہ کونسلوں اور اسمبلیوں کی نشستوں اور ادنیٰ درجہ کے حقوق کی تقسیم پر اُن میں جوتی پیزار رہتی ہے تو کوئی امید مستقبل قریب کیا مستقبل بعید میں بھی کامل آزادی درکنار ناقص آزادی ملنے کی بھی نہیں ہو سکتی لیکن اُس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اگر کسی خارجی اسباب کی بنا پر غیر ملکی حکومت کا پنجہ ڈھیلا بھی ہو جائے تو جب تک کہ کانگریس اپنے دو مسلکوں پر نظر ثانی کر کے اُن میں مناسب تبدیلی نہ کرے گی اُس وقت تک ہندوستانیوں کی ادنیٰ قسم کی حکومت کا منصوبہ بھی "خیال است و محال است و جنوں" کا مصداق رہے گا۔ اپنے مسلک پر نظر ثانی کرنا کانگریس کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اُس نے کونسلوں اور سرکاری ملازمتوں کو ترک کر دیا تھا مگر وقت آیا کہ اُس نے کونسلوں میں کام کرنا جائز قرار دے کر وزارتوں اور صوبوں کی حکومتوں پر قبضہ کیا۔ اسی طرح ضروری ہے کہ کانگریس کو جب اپنا کام جاری کرنے کا موقع ملے تو سب سے اوّل وہ اپنے طریق کار کو بدلے۔

اُس کی تفصیل یہ ہے کہ مشین کے کپڑے کے استعمال کا بائیکاٹ ممکن ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے انگلستان کے کارخانہ داروں اور تاجروں کی پریشانی کا موجب ہوا ہو مگر ہمیشہ کے لئے مشین کے استعمال کو خیرباد کہہ دینے کے معنے یہ ہیں کہ جس نسبت سے دنیا میں ترقی ہوگی اُسی نسبت سے ہندوستان ابتدائی تہذیب بلکہ بربریت کی طرف ہٹتا چلا جائے گا اور اُس کے باشندوں کا شمار وحشی اقوام میں ہونے لگے گا۔ اگر مشین کا استعمال ناجائز ہے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہاتھ کی انگلیوں سے سوت کاتنے کی جگہ تکلی یا چرخہ کا استعمال کیوں جائز

سمجھا جاتا ہے جو ادنیٰ قسم کی مشینیں ہیں۔ گذشتہ بیس برس کے عرصہ میں اگر کانگریس اپنی قوت جدید ترین مشینوں کے مقاطعہ پر صرف نہ کرتی تو عجب نہیں کہ آج ہندستان اس قابل ہو گیا ہوتا کہ وہ ایک حد تک اپنی ضروریات پوری کر سکتا یا کم سے کم یہاں کے لوگوں میں کم وقت میں زیادہ مال تیار کرنے کی استعداد پیدا ہوتی جو ملک کے آزاد ہونے پر کام آتی۔

دوسرا قابل غور مسئلہ "ستیا گرہ" کا ہے جس کی رو سے فوجی ملازمتوں کو ترک کیا گیا ہے۔ مانا کہ اس وقت فوجی خدمات کی ادائیگی سے غیر ملکی حکومت کو اپنے تسلط میں مدد ملتی ہے مگر اس سے زیادہ ہندستانیوں کو یہ بڑا نقصان ہے کہ انھیں کافی تعداد میں فوجی تربیت حاصل نہیں ہوتی۔ اخلاقی اعتبار سے جنگ کی خواہ کیسی ہی مذمت کیوں نہ کی جائے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ جو ملک زمانہ حال کے جدید ترین جنگی طریقوں سے ناواقف ہیں وہ اپنی آزادی قایم نہیں رکھ سکتے۔ اہل مصر، ترکستان، ایران، عراق اور دیگر اسلامی ممالک کے لوگ کہیں زیادہ آزاد ہیں مگر فوجی کمزوری کی وجہ سے یورپ کی طاقتور قومیں اُن پر مسلط ہیں۔ اور جدید ترکی محض اپنی جنگی قابلیت کی وجہ سے اُن کی دست برد سے بچا ہوا ہے۔ بالخصوص موجودہ جنگ نے ثابت کر دیا ہے کہ محض ذاتی جوانمردی اور جانبازی کی صفات اُس وقت تک بیکار ہیں جب تک کہ جدید قسم کی فوجی تربیت مکمل نہ ہو اور علم سائنس کے ذریعہ سے فوری ضرورت کے مطابق مشینوں کی فوری ایجاد اور اُن کی تیاری کی قابلیت نہ ہو۔

خلاصہ

مختصر یہ کہ جداگانہ طریق انتخاب کی موجودگی میں نام نہاد سمجھوتوں کے ذریعہ سے قومی اتحاد کی کوشش کرنا تضیع اوقات ہے۔ یہ محض اُن لوگوں کا مشغلہ ہے جو عوام الناس کی آنکھوں میں خاک ڈال کر اور انھیں مذہبی بلووں میں مبتلا کرکے اپنے لئے مزید مراتب اور منافع حاصل کرنے اور انھیں آپس میں بانٹتے رہتے ہیں۔ پس بغیر اس طریق انتخاب کو بدلے ہوئے جو سمجھوتہ ہوگا اُس سے قومی اتحاد کی جگہ قومی نفاق بڑھتا چلا جائے گا جیسا کہ اب تک بڑھتا چلا آیا ہے اور سیاسی گتھی سلجھنے کی جگہ وہ اور زیادہ اُلجھتی چلی جائے گی جیسا کہ اب تک اُلجھتی چلی آئی ہے۔

اسی طرح ملکی آزادی حاصل کرنے کی ابجد یہ ہے کہ مثل تمام ترقی یافتہ ممالک کے ہاتھوں کی جگہ زیادہ سے زیادہ مشینوں کا استعمال کرکے تھوڑے وقت میں زیادہ سے زیادہ مال تیار کیا جائے تاکہ ہندستان اپنی ضروریات کے لئے دیگر ممالک کا دست نگر نہ رہے اور چونکہ ملک کو حقیقی آزادی بغیر جدید ترین فوجی طریقوں کے سیکھے ہوئے نہ حاصل ہو سکتی ہے اور نہ قایم رہ سکتی ہے اس لئے سوائے اس کے چارہ نہیں کہ فوجوں میں داخل ہو کر ان کاموں میں مہارت حاصل کی جائے۔

پاکستان اور حقِ خود ارادیت

از: ——— سوامی سہجانند سرسوتی

ہندو مسلم فسادات کے بے حد پیچیدہ مسئلہ نے پاکستان کے مسئلہ کو جنم دیا۔ اس پاکستان کے مسئلہ نے قوموں کے حق خود ارادیت کے سوال کو زبردست اہمیت دے کر ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ ملک میں کئی حضرات اور مختلف سیاسی جماعتوں کا یہ یقین ہے کہ حق خود ارادیت کا سیاسی علیحدگی کی حد تک تسلیم کر دیا جانا ملک کے اس پریشان کن فرقہ وارانہ مسئلہ کا واحد حل ہے۔ چنانچہ یہ حضرات اور سیاسی جماعتیں ملک میں ایک ایسے سیاسی ماحول کے پیدا کرنے کی جان توڑ کوشش کر رہی ہیں جس میں سب لوگ اس حل کو اختیار کرلیں۔ مجھے ان کے مقصد کی ایمانداری اور نیت کا اعتراف ہے لیکن ضرورت ہے کہ قومی حق خود ارادیت کے اصول کے کچھ اہم پہلوؤں کا ہندوستان کے موجودہ سیاسی اور اقتصادی حالات کی روشنی میں جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان حالات میں اس اصول پر کام کرنا کہاں تک ممکن اور مفید ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں جو کچھ بھی یہاں عرض کروں گا سوچنے والے حضرات اس مسئلہ پر مزید غور و خوض فرمائیں گے تاکہ ہمارے لئے صحیح حل دریافت کرنا ممکن ہو سکے۔

پہلے ہم کو یہ ماننا ضروری ہے کہ ہندوستان کو ابھی ایک اور بڑا جمہوری انقلاب سے گذرنا اور قومی آزادی حاصل کرنا باقی ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے ہندو مسلم تفرقوں کا ایک باثر حل اور ایک پائیدار فرقہ وارانہ اتحاد کا قائم ہونا ضروری ہے۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کے ذریعہ ہندوستان کو جو آزادی حاصل ہوگی اس میں سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کی رفتار بہت تیز ہو جائیگی۔ ہم ایک ایسے دور سے گذر رہے ہیں جس میں قومی سرمایہ دارانہ طبقہ کا ایک مخصوص حصّہ غیر ملکی سرمایہ کو ملک سے نکال کر اس کی جگہ اپنا سرمایہ لگانا چاہتا ہے اور اس مخصوص جماعت نے اس اقلیت پر اکثریت

کے ظلم کے متعلق چیخ پکار مچائی ہے۔ اس لئے اس طبقہ کے دونوں حصے اس امید اور کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ وہ زمانہ جلد سے جلد آئے جب کہ سب سیاسی طاقت اور اختیارات ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آجائیں اور وہ ملک کی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں حاوی اور با اثر حیثیت اختیار کریں اور یہ فرقہ وارانہ مسئلہ دراصل اسی مقصد کے حصول کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ کسی ملک کے قومی مسئلوں کو اس ملک کا اُٹھتا ہوا اور ترقی پذیر بورژوا طبقہ ہی جنم دیتا ہے۔ اس کے متعلق اسٹالین کہتا ہے :-

یہ کہنے کی شاید بالکل ضرورت نہیں کہ پیداوار کے سرمایہ دارانہ طریقوں میں قدرتی دولت اور الگ الگ طبقات ہوتے ہوئے باہمی مساوات حاصل نہیں ہوسکتی کہ جب تک سرمایہ کی طاقت موجود ہے اور جب تک طریقہائے پیداوار پر قبضہ کرنے کے لئے کشمکش جاری رہتی ہے تب تک اقوام میں مساوات قائم نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح جیسے قوموں کے محنت کش عوام میں کوئی اتحادِ عمل نہیں ہوسکتا۔ تاریخ دکھاتی ہے کہ قومی تفریق کو دور کرنے کا ایک ہی طریقہ اور مظلوم اور غیر مظلوم باشندوں میں برادرانہ اتحاد عمل کی حکومت قائم کرنے کا واحد ذریعہ سرمایہ داری کو نکال دینا اور ایک سوویٹ نظام قائم کرنا ہی ہے" (مارکسیت اور قومیت صفحہ ۱۰۲)

وہ اور آگے کہتا ہے "جو کچھ کہا گیا ہے اُس سے یہ واضح ہوگا کہ بڑھتی ہوئی سرمایہ داری کی صورت میں قومی جدوجہد بورژوا طبقہ کی ایک باہمی جدوجہد ہے کبھی کبھی بورژوا طبقہ قومی تحریک میں اپنے ساتھ مفلس طبقہ کو ملانے میں بھی کامیاب ہوجاتا ہے اور تب قومی جدوجہد بظاہر ایک قومی صورت اختیار کرلیتی ہے لیکن یہ صرف بیرونی طور پر ہی ہوتا ہے۔ حقیقت میں وہ ہمیشہ ایک بورژوا جدوجہد ہے وہ خاص طور پر بورژوا طبقہ کے حق میں اور اُن کے مفاد میں ہے (۱۷-)

ایم اسٹالن اس مضمون پر بہترین ماہر سمجھا جاتا ہے اور اُس کے مطابق یہ قومی مسئلہ قوم پر ظلم کی چیخ و پکار بورژوا طبقہ کے حال کے مطابق ہے اور اس کے مقصد کے لئے ٹھیک ہے۔ لیکن کیا پھر اسکو اس کے ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے؟ اور ہمیں ہندستانی بورژوا طبقہ سے ایسا کرنے اور اس مقصد کے لئے ایمانداری سے ایک حل اختیار کرنے کی امید کرنی مناسب ہے؟ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ موجودہ زمانہ میں وہ ملک کی آواز اُٹھانے والا ہے اور اس کی آزادی کی جدوجہد کی قیادت کرتا ہے۔ ان حالات میں اس کو یہ مسئلہ ایک یا دوسری طرح سے اُٹھاتے رہنا اور اس طرح اپنے مقصد کی خدمت کرتے رہنا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا تمام ڈھانچہ طریقہائے پیداوار کی ذاتی ملکیت اور دولت پیدا کرنے والے عوام کے استحصال (لوٹ) پر قائم ہے اور ہندستانی بورژوا طبقہ اس کے حصول کی سخت کوشش کررہا ہے تب اسی بورژوا طبقہ کے دائرہ اختیار اور اس کے مفاد میں اس لوٹ اور ظلم کو مٹانے اور ملک کے مختلف طبقوں کے درمیان ہم آہنگی قائم کرنے کی کس طرح امید کی جاسکتی ہے؟ فرض کیجئے کہ دو ہندستان 'ہندو ہندستان اور مسلم ہندستان' یا پاکستان یا حق خود ارادیت کے اصول کو مان لینے کے نتیجہ کے طور پر قائم ہوتے ہیں۔ تو کیا اس وقت یہ اقلیت پر اکثریت کے جبر و ظلم کی چیخ و پکار بند ہوجائے گی۔ میں تو یہ امید نہیں کرتا تب بھی دونوں ہندستانوں میں مختلف اقلیتیں اور اکثریتیں ہوں گی اور زمیندار اور سرمایہ دار ہوں گے اور وہ کسانوں مزدوروں۔ کم حیثیت متوسط طبقہ اور ہونے والے سرمایہ داروں کو جو کمزور ہوں گے اور بڑے سرمایہ داروں سے مقابلہ نہ کرسکیں گے (exploit) کریں گے۔ یہ ہر جگہ کا قاعدہ ہے اور ہندستان

بن س کے علاوہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ ہم مصطفیٰ کمال کی پالیسی اختیار نہ کریں اور تمام مسلم اقلیت کو پاکستان اور ہندو اقلیت کو ہندوستان بھیج کر پاکستان اور ہندوستان کو مکمل نہ کرلیں تب تک مسلم اور ہندو ہندستانوں میں ہندو اور مسلم اقلیتیں رہیں گی۔ جن کو ایک یا دوسرے فرقہ کا بورژوا طبقہ تنگ کیا کرتا رہے گا۔ بورژوا طبقہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے ہم قوموں کو لوٹنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا ہے وہ اس معاملہ میں لاچار ہے کیونکہ زندگی کی جدوجہد کا اس طبقہ سے یہی مطالبہ ہے ورنہ وہ ختم ہو جائیگا۔ ہندو بورژوا اس بہانے سے کہہ سکتا ہے کہ مسلم ہندوستان میں ہندو اقلیت پر مظالم ہو رہے ہیں۔ یہی مسلم بورژوا طبقہ بھی کہہ سکتا ہے اسی طرح یہ خطرناک دائرہ اپنے آپ کو وسیع کرے گا اور ہماری مصیبتوں کا خاتمہ پاکستان (برائے نام حق خود اختیاری) کے بعد بھی نہیں ہو سکتا۔ جب تک ہم سرمایہ داری کو جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکیں لیکن وہ دور یقیناً ابھی تک نہیں آیا ہے کیونکہ ہم ہندوستان میں عوام کے انقلاب کی حد تک ابھی نہیں پہنچے ہیں۔ اسٹالن نے اس کو مختصراً یوں کہا ہے۔

"سرمایہ دار جمہوریت برسوں سے قومی مخالفت کو اقوام کی آزاد ترقی اور نظام استحصال کے مفاد کو ملا دینے کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن ابھی تک نہ وہ کامیاب ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔ اس کے برخلاف قومی مخالفت کی اسکیم زیادہ اور زیادہ الجھتی چلی جا رہی ہے اور اس سے سرمایہ داری کے خاتمہ کا ڈر ہے۔ صرف یہاں سوویٹ کی دنیا میں سوشلزم کے کیمپ میں قومی ظلم کی جڑوں ہی کو اکھاڑ دینا اور لوگوں میں باہمی اعتماد اور برادرانہ اتحاد عمل قائم کرنا ممکن ہوا ہے۔" (صفحہ ۱۴۷)۔

ہم مسلمانوں پر ظلم کی پکار کو خاموش کرنے اور اس طرح ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کرنے کے لئے خود ارادیت کے روسی علاج کو ہندستان میں کرنے کے لئے بہت گفتگو سنتے ہیں لیکن جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ روس میں بھی وہ اس مسئلہ کا بورژوا حل نہیں تھا۔ لیکن وہ مزدور طبقہ کی شکل کا تھا اور پھر بھی اس کے حل ہونے میں بیس سال سے زیادہ لگے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسٹالن نے اپنی خود ارادیت کی اسکیم کا نچوڑ سمجھاتے ہوئے اس کی بنیاد کی دو چٹانوں کی طرف اشارہ کیا ہے جب اس نے کہا "اور اس کی بنیاد کسانوں کی آزادی اور محنت کشوں کے ہاتھ میں تمام سیاسی طاقت دے دینے پر تھی" (صفحہ ۱۱۸) اور یہ اسی کی وجہ ہے کہ ہم اس کو منشویکوں اور دیگر بورژوا دستوں اور پارٹیوں کے خلاف روس میں اور دوسری جگہوں میں سخت جدوجہد کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جنھوں نے کئی بار خود ارادیت کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے ایک بورژوا پالیسی بنا ڈالا اور اس کو اس اعلیٰ عہدہ سے نیچے گھسیٹ کر گرا دینا چاہا جہاں وہ تھا وہ اس معاملہ میں ذرا سی بھی تبدیلی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس نے چالاکی سے کام لیا اور اپنے آدمیوں کو ہر معاملہ کو اس کی مدد کرنے سے پہلے جانچ لینے کی ہدایت کی۔ اس نے کہا کہ محض ایک اصول کی بنا پر خود ارادیت کے معاملے میں کچھ نہیں کرنا چاہئے اور اگر ضروری سمجھا جائے تو اس کو ایک زیادہ اعلیٰ مقصد یعنی محنت کش طبقہ کے اتحاد اور طاقت کے مفاد کے لئے چھوڑ دینا چاہئے" اس کا یہی اور صرف یہی مطلب ہے جب وہ کہتا ہے:۔

پہلی بات یہ ہے کہ کا مریڈوں کے ایک حصہ نے قومی سوال کو بہت زیادہ ضروری سمجھا ہے۔ اس کو بڑھایا چڑھایا ہے اور قومی سوال کی وجہ سے سماجی سوال۔ مزدور طبقہ کے سوال کو نظر انداز کر دیا ہے...... اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ

قوموں کے خودارادیت کے حق کے علاوہ محنت کرنے والے طبقہ کی طاقت کے مضبوط کرنے کا حق بھی ہے اور خودارادیت کا حق اس آخری حق کے ماتحت ہے۔ ایسے موقعے آتے ہیں کہ جب حق خودداریت دوسرے یعنی محنت کرنے والے طبقہ کی طاقت کو مضبوط کرنے کے حق سے ٹکراتا ہے ایسے موقعوں پر یہ صاف طور پر کہدینا چاہئے۔ خودارادیت کے حق کو مزدور طبقہ کی آمریت کے حق کے راستہ میں ایک رکاوٹ بن کر نہیں رہنا ہوگا۔ پہلے کو دوسرے کے لئے راستہ چھوڑ دینا ہوگا۔ مثال کے طور پر ۱۹۲۰ء میں ایسا وقت آیا۔ مزدور طبقہ کے حق کی حفاظت کرنے کے لئے ہم وارسا Warsaw پر چڑھائی کرنے پر مجبور ہوگئے (صفحہ ۱۶۰)

مجھے اس نقطہ کو کچھ اور آگے سمجھانا چاہئے۔ خودارادیت کے ابھی تک دو معنی سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے مطابق اس کا مطلب سیاسی اور تمدنی خودمختاری ہے۔ سیاسی خودمختاری میں علٰحدگی بھی شامل ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایم اشالن اور ان کے ساتھی اس کو صرف پہلے مطلب میں استعمال کرتے ہیں جبکہ بورژوا ذہنیت والے اس کو دوسرے مطلب میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کے بعد جب یہودیوں کی سیاسی پارٹی نے قومی تمدنی خودمختاری کو تسلیم کرتے ہوئے نہ صرف اسکول۔ بان۔ تقریر۔ پریس۔ مذہبی رسومات وغیرہ کی آزادی کا مطالبہ کیا جو کہ دوسرے مزدوروں کے حقوق کے برابر ہے بلکہ انتہا یہ ہوئی کہ یہودی یونین۔ یہودی کلب یہودی زبان۔ یہودی اسپتال اور یہودی تعطیلوں کا خاص طور پر مطالبہ کیا اور مزدوروں کو اس طرح الگ رکھنے کی کوشش کی جیسے کہ مختلف علیحدہ علیحدہ جماعتوں میں۔ یہ دیہات کے مزدوروں کے بین الاقوامی اتحاد کی بنیاد پر کاری ضرب تھی اور اس کی تنظیمی مضبوطی کے خلاف بھی اس کی کون گارنٹی کر سکتا ہے کہ پاکستان میں بھی اس خودارادیت کے یہ معنے نہ ہوں گے؟ اور اگر ایسا کیا گیا تو اس کو کون اور کس طرح روکے گا! مسلم ریلیف کمیٹی۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن۔ مسلم چیمبر آف کامرس وغیرہ یہ صاف دکھاتے ہیں کہ ہوا کس رخ چل رہی ہے اور چلے گی۔ یہی نہیں بلکہ ہندو ہندستان بھی اس معاملہ میں ہندو بورژوا کے مفاد کے لئے مسلم ہندستان کی نقل کرنے کو سودمند پائے گا اور اس کو کوئی روک نہ سکے گا۔ بلکہ مجھے یہ خوف ہے کہ تاریخ اس جگہ اپنے آپ کو دہرائے گی۔

لیکن یہ بحث کی جا سکتی ہے کہ ایسی صورت میں دو ہندستان نہیں ہو سکتے نہ تو پاکستان اور نہ ہندوستان۔ کیونکہ وہ مفہوم سیاسی علٰحدگی کو نہیں مانتا ہے۔ بلکہ نام پاکستان کا زور صرف علٰحدگی پر ڈالا جا سکتا ہے۔ یہ تعبیر یہاں ہندستان میں ہوتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی

کچھ اور غور و فکر کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ خوف ناقابل تردید بنیادوں پر قائم ہے۔ خودارادیت کے دو معنی نکالے جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ کاکیشیا میں لیکوئیڈیٹرس نے کیا جو پرولتاری (مزدور طبقہ کا) نقطۂ نظر رکھنے کے باوجود قومی وبا سے آزاد نہ تھے اور چنانچہ انھوں نے 'بنڈ' کی نقل کی۔ ایم اشالن نے اس کو انھیں طرح واضح کر دیا ہے جب وہ کہتا ہے۔

"کاکیشیا کے لئے بحیثیت مجموعی خطہ وارانہ خودمختاری اور کاکیشیا میں رہنے والی قوموں کے لئے قومی تمدنی خودمختاری۔ یہ طریقہ ہے جس میں سوشل ڈیماکریٹوں نے جو اتفاق سے روسی لیکوئیڈیٹروں سے ملے ہوئے ہیں، اپنے مطالبوں کو بنایا ہے۔" (۴۶ ۱) اس لئے ہمارے یہ خوف بنیادی طور پر صحیح ہیں کہ خودارادیت کے اس لباس میں پاکستان آخرکار

محنت کشوں کے مفاد کے لئے تباہ کن ثابت ہو۔

یہ اس خطرہ کو سامنے رکھتے ہوئے ہے کہ ایم۔ اسٹالن نے اس معاملہ میں انصاف پر خاص زور دیا ہے اور اپنے پیروں کو تمام اور متفرق قومی تحریکوں کا ساتھ دینے سے منع کیا ہے کچھ قومی تحریکیں ایسی ہیں جن کو اگر سرمایہ داری کے خلاف سیدھا نہ چلایا جائے تو وہ جان بوجھ کر ویسی ہی سرمایہ داری کی مدد کرنے اور اس کو مضبوط کرنے کی طرف رجحان پذیر ہوتی ہیں۔ جبکہ کچھ اور ایسی ہی جو سرمایہ داری کو کمزور کرنے پر رجوع ہوتی ہیں اگر اس کو ان کا نشانہ بنایا جائے اور آزادی کے خواہاں حضرات کا یہ فرض ہے کہ وہ پچھلے کی مدد کریں اور پہلے کی ہمت توڑیں۔ کسی مقصد سے منسوب کئے بغیر لیگ کی قیادت سے یہ پوچھنے کو دل چاہتا ہے کہ کیا گارنٹی ہے کہ پاکستان کے روپ میں ہندستان کی یہ نئی قومی تحریک آخر میں غلط راستوں پر نہ چل پڑے گی اور سرمایہ داری کی ایک ہندستانی چوٹی کا کام نہ دے گی؟ مجھ کو ابھی اس کی موجودہ شکل اور قیادت سے کوئی مطلب نہیں۔ بلکہ مجھ کو جس چیز سے مطلب ہے اور جس سے میں ڈرتا ہوں وہ اس کے امکانات ہیں۔ اس جگہ مجھ کو اسٹالن کا ایک کافی حد تک حوالہ دینے دیا جائے۔ وہ کہتا ہے :-

"اس کا یقیناً یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر جگہ ہمیشہ اور ہر موقعہ پر پرولتاریوں کو ہر قومی تحریک کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اصل نقطہ یہ ہے کہ اُن قومی تحریکوں کی مدد کرنی چاہیئے جن کا رجحان سرمایہ داری کو کمزور کرنے نہ کہ مضبوط کرنے اور بچانے کے لئے ہو۔ ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ جن میں کچھ مظلوم ممالک کی قومی تحریک پرولتاری تحریک کے مفاد کی ترقی سے ٹکر کھاتی ہے ایسے واقعات میں مدد یقیناً سوال سے باہر ہے۔ اقوام کے حقوق علیحدگی اور خود اختیاری کا سوال نہیں ہے لیکن وہ پرولتاری انقلاب کے عام سوال کا ایک حصہ ہیں۔ وہ حصہ جو سب کے ماتحت ہے اور جو کل چیز کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ پچھلی صدی کی چالیسویں میں مارکس نے پولینڈ اور ہنگری والوں کی قومی تحریکوں کی موافقت کی۔ اور زیکوسلواکیا والوں اور جنوبی سلاف کی قومی تحریکوں کی مخالفت کی۔ کیوں؟ کیونکہ زیکوسلواکیہ والے اور جنوبی سلاف اس وقت رجعت پرست تھے۔ جبکہ پولینڈ اور ہنگری والے انقلابی قومیں تھیں جو کمل خود مختاری کیلئے لڑ رہی تھیں۔ کیونکہ اس وقت زیکوسلواکیہ والوں اور جنوبی سلاف کی مدد کرنے کا مطلب زاریت کی براہ راست مدد کرنا ہوتا جو کہ یورپ کی انقلابی تحریک کا سب سے زیادہ خطرناک دشمن تھا"۔ (صفحہ ۱۹۳) اس جگہ اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لئے کافی مصالحہ ہے۔

اور مسلمانوں کو ایک قومی بنیادی طور پر خود ارادیت دینا قوم کے لئے تکلیفوں کے طوفانی دروازے کھول دیگا۔ کیونکہ پھر کئی سو قومی اقلیتیں اس مثال سے تقویت پاکر اُسی حق علیحدگی اور قومی تمدنی AUTONOMY کا مطالبہ کریں گی نتیجہ یہ ہوگا کہ ... اقوام ایک دوسرے سے متواتر لڑنا شروع کردیں گی اور ملک کی سیاسی اور اقتصادی زندگی ایک دوزخ کا نمونہ بنا دیں گی اور سرمایہ دار اس موقع کو خوش آمدید کہتے ہوئے مختلف برائیوں کے ذریعہ قوموں کو ایک دوسرے سے لڑاتے رہیں گے۔ آخر کار ملک پر یہ قبضہ مضبوط ہو جائے گا۔ یہ اس نظریہ کے ساتھ ہے کہ ایم اسٹالن کہتا ہے۔ ہندستان

میں ۸۰۰ سے کم اقوام نہیں ہیں اور برطانیہ عظمیٰ نے یہ طے کیا کہ ۸۰۰ اقوام سے علٰحدہ علٰحدہ حساب کتاب کرنے کے بجائے کچھ قوموں کو چن لینا بہتر ہے جن کو کچھ خصوصیات عطا کردی جائیں اور ان کے ذریعہ سے باقیوں پر حکومت کی جائے۔ کیونکہ اولاً یہ کہ دوسری قوموں کی بے اطمینانی ان چندوں کے خلاف ہوگی نہ کہ برطانیہ عظمیٰ کے خلاف۔ اور دوسرے یہ کہ دو تین اقوام کی پریشانی اٹھانا ۸۰۰ اقوام سے سستا بھی پڑتا ہے (صفحہ ۱۶۲) یہاں پھر اس مسئلہ پر کافی سوچنے کے لئے دماغی معالجہ کے آخر میں ایک ضروری نقطہ ہے۔ ایم اسٹالن کے الفاظ میں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ قومی سوال کو کسان کے سوال سے ملی ہوئی کوئی چیز سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ کسان کے سوال کے ساتھ ساتھ قومی سوال میں قومی تمدن۔ قومی حکومت وغیرہ قسم کے سوالات ہیں۔ لیکن بلاشک وشبہ کسان سوال قومی سوال کی بنیاد اور اس کا اصلی نچوڑ ہے۔ وہی ہے جو ہم کو یہ حقیقت سمجھاتا ہے کہ کسان ہی تو قومی تحریک کی خاص فوج کے نمائندے ہیں کہ کسان فوج کے بغیر ایک طاقتور قومی تحریک نہ ہوئی ہے اور نہ ہوسکتی ہے" (صفحہ ۲۰۲) اس کسوٹی سے جانچنے کے بعد یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ہندستان میں تحریک پاکستان حقیقت میں ایک قومی تحریک ہے۔ اگر مسلم کسان کچھ بھی اس تحریک کے ساتھ ہیں تو وہ مسلمانوں کی حیثیت سے ہیں نہ کہ کسانوں کی حیثیت سے اور اس مسئلہ حقیقت سے مشکل سے ہی انکار کیا جاسکتا ہے اور اگر اس سلسلہ کی اس تشریح کو مان لیا جاتا ہے تو ہندستان میں خودداریت کا نظریہ بالکل نیچے گر جاتا ہے۔ اس لئے جبکہ آپ خودارادیت کی پرولتاری طریقے یا بورژوا طریقے پر تعریف کریں تو ہندستان پر اس کے عائد کرنے میں خطرناک خلیجیں اور بنیادی مخالفتیں ہیں جو مجھ کو اسٹالن اعظم کے الفاظ میں کچھ لفظی تبدیلیوں کے ساتھ یہ اختتام کرنے پر مجبور کردیتی ہیں۔

اس طرح پرانا بورژوا جمہوری طبقہ کے اصول خودارادیت کی تعریف ایک چھوٹا قصہ ہو جاتی ہے۔ اور اپنی غیر معمولی خصوصیت کو چھوڑ دیتی ہے۔ یہ واضح رہے کہ ان حالات میں قومی ظلم کے ختم کرنے یا چھوٹی قومی حکومتوں کی آزادی کا سوال نہیں اٹھایا جاسکتا۔

یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ سرمایہ داری سے پوری علٰحدگی کے بغیر اور ہر ایک کے اپنے قومی بورژوا کو شکست دینے کے بغیر اور محنت کش عوام کے اپنے ہاتھوں میں طاقت لئے بغیر مظلوم اقوام پر منظم لوٹ اور قومی ظلم کو ختم کرنا قیاس سے باہر ہے۔

پاکستان اور حق خود ارادیت

(ہمارے کمیونسٹ بھائیوں کی غلط فہمی اور غلط بیانی)

از: ——— خواجہ احمد عباس

میں کمیونسٹ نہیں ہوں مگر کمیونزم اور سوویت روس کا دلدادہ ضرور ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم دنیا میں انصاف، مساوات اور آزادی کے خواہاں ہیں تو ہمیں کسی نہ کسی شکل میں ایک دن کمیونزم کو اختیار کرنا ہی پڑے گا۔ خواہ اس کی فروعات میں تھوڑی بہت ردّوبدل ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ کمیونسٹ اصولوں اور ان اصولوں کے سانچے میں سوویت روس کی حیرت انگیز ترقی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

میں کمیونسٹ نہیں ہوں مگر میرے بہت سے عزیز دوست کمیونسٹ ضرور ہیں۔ میرا روز کا اٹھنا بیٹھنا کمیونسٹوں کے حلقے میں ہوتا ہے۔ اکثر سیاسی، ادبی اور معاشرتی تحریکوں میں میں کمیونسٹوں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہوں۔ میرے اور ان کے درمیان چند سیاسی مسائل پر اختلاف ضرور ہے۔ مگر وہ مجھے جاپانی ایجنٹ یا "پانچویں دستے" کا غدار نہیں سمجھتے، اور نہ میں ان کو سرکار کا زرخیز آلۂ کار سمجھتا ہوں۔ بلکہ میں ان کے خلوص اور سرگرمی کا ازحد قائل ہوں۔

یہ سب میں اس لئے صاف کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر مجھے ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی اور پروگرام کے بعض حصوں سے اختلاف ہے تو اس کی بنیاد تعصب یا دشمنی پر نہیں ہے۔ پھر بھی ان کی "پارٹی لائن" (یعنی پارٹی کی پالیسی) کی قلابازیوں اور چک پھیریوں پر مجھے کبھی ہنسی آتی ہے اور کبھی غصہ۔ خصوصاً جو طرز عمل انھوں نے مسلم لیگ اور پاکستان کے متعلق اختیار کیا ہے اس کو دیکھ کر میں دنگ رہ جاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ یہ وہی کمیونسٹ ہیں جو کل تک فرقہ پرستی تو کیا خود مذہب کے نام سے بیزار تھے اور آج

رجعت پسندوں، مذہبی متعصبوں اور فرقہ پروروں کے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ کمال ہو گیا کہ کمیونزم کے نام لیوا پاکستان کی تحریک کے سب سے زبردست حامی بن بیٹھے۔

کمیونسٹ پارٹی کو حق ہے کہ وہ جتنی چاہے سیاسی قلابازیاں کھائے۔ اگر کل کے جابر اور شہنشاہیت پرست اس کو آج "عوامی جنگ" کے سورما نظر آتے ہیں تو اس میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اگر جانے بوجھے قوم پرست اور آزادی کے مجاہد کمیونسٹوں کی لسٹ میں "غدار اور" "پانچواں دستہ" کہلانے کے مستحق ہیں تو اس کو غلط فہمی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب پاکستان جیسے نظریئے کے جواز میں مارکس اور لینن اور ستالین کے اصولوں کا حوالہ دیا جائے تو ضرورت ہے کہ کمیونسٹوں کے قول و فعل کی پڑتال کی جائے اور دنیا کو دکھایا جائے کہ کمیونزم کبھی بھی اس قسم کی تحریکوں کو روا نہیں رکھتی۔ اگر میرے الفاظ سے کمیونسٹ بھائیوں کی دل شکنی ہوتی ہے تو مجھے دلی افسوس ہے۔ مگر میں کمیونزم کو کمیونسٹوں سے زیادہ اہم اور ارفع سمجھتا ہوں خواہ وہ پی۔ سی جوشی ہوں۔ یا سجاد ظہیر یا خود کامریڈ ستالین کسی کمیونسٹ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ وقتی سیاسی اغراض کے ماتحت کمیونزم کے اٹل اصولوں یا سوویت روس کی تاریخ کو غلط معنی پہنائے۔ کسی کمیونسٹ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دنیا سے یہ کہے (یا ایسا خیال پھیلائے) کہ پاکستان کا مطالبہ سوویت روس کے "حق خود ارادیت" کے مطابق ہے یا یہ کہ ایسا مطالبہ کسی طرح بھی کمیونسٹ اصولوں کے مطابق جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔

اگر ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے مسلم لیگ کے ناجائز اور غلط مطالبوں کو کانگریس مان بھی لے، پھر بھی کم سے کم کمیونسٹ اصولوں کو تو اس بدنما دھبے سے دامن بچا لینا چاہئے کیونکہ ہندوستان کی نجات نہ صرف آزادی میں ہے نہ پاکستان میں۔ سیاسی آزادی کے بعد سماجی اور اقتصادی کش مکش کا وقت آئے گا اور عوام کو امن چین اور دو وقت کا کھانا اسی وقت نصیب ہوں گے جب کمیونزم یا سوشلزم کو اختیار کیا جائے۔ اس وقت کیا رجعت پسند ہمارے منہ پر کمیونسٹوں کے الفاظ نہ پھینک کر ماریں گے یہ کہہ کر کہ "دیکھو۔ خود کمیونسٹوں نے اعلان کیا تھا کہ پاکستان سوویت اصولوں کے عین مطابق ہے!

لینن کی آواز

تو وہ کون سے اصول ہیں جن کی بنیادوں پر سوویت جمہوری ریاستوں کے اتحاد کی عمارت کھڑی کی گئی تھی؟ اور کیا ان میں اور پاکستان کے نظریئے میں کسی قسم کی مطابقت ہے؟

سب سے بہتر کون کمیونسٹ اصولوں کی تشریح کر سکتا ہے۔ یہ ہیں لینن کے الفاظ:-

"ریاست کو مذہب سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہئے۔ مذہبی گروہ ریاست سے متعلق نہ ہونے چاہئیں۔ ہر شخص کو آزادی ہونا چاہئے کہ وہ جو مذہب چاہے اختیار کرے یا لامذہب رہے جیسا کہ ایک سوشلسٹ عام طور سے ہوتا ہے۔"

لینن کے بعد اس کے اصولوں کا سب سے معتبر مفسر ستالین ہے۔ ستالین نے اپنی ایک کتاب میں "قومیت" کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:-

"ایک قوم ایسا گروہ ہے جو مشترکہ تاریخی روایات رکھتا ہو اور جس کی زبان، وطن، اقتصادی اور نفسیاتی ماحول میں مناسبت اور اشتراک ایک مشترکہ تمدن کی شکل میں ظاہر ہو۔" (مذہب کا کوئی ذکر نہیں!)

ان اصولوں کے پس منظر میں یاد رکھنا چاہئے کہ زار کی سلطنت مختلف علاقوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ زاروں کے عہد حکومت میں ہر علاقہ اور قوم پر روسی زبان اور روسی تمدن کو زبردستی عائد کیا گیا تھا۔ جب زار کی حکومت ختم ہوئی اور انقلاب روس نے دُنیا کی تاریخ میں پہلی دفعہ مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم کی تو صدیوں کے بعد زار کے محکوم علاقوں اور قوموں کو آزادی نصیب ہوئی۔ پہلی عارضی انقلابی حکومت کی طرف سے لینن اور ستالین نے مندرجہ ذیل اعلان شائع کیا:-

"روس کے مسلمانو، کریمیا اور دولگا کے تاتارو، ترکستان اور سائبیریا کے کرغیز اور سارت قوم والو، ماوراء قاف کے ترک اور تاتاریو! تمہارے عقائد اور تمہاری رسوم، تمہارے قومی تمدن اور معاشرت اب آزاد ہیں اور ان کو کوئی ٹھیس نہیں لگا سکتا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارے اور تمام دیگر اقوام کے حقوق اب انقلاب کی حفاظت میں ہیں..... اٹھو اور اس انقلاب کی مدد کرو۔"

تاریخ شاہد ہے کہ لینن اور ستالین نے یہ وعدہ ایفا کیا۔ یکے بعد دیگرے مختلف علاقوں کو حق خود ارادیت دیا گیا اور متحدہ مرکزی سوویت کی نگرانی میں مقامی جمہوری حکومتیں قائم کی گئیں۔ مگر یہ خود ارادیت پاکستان کے مرادف نہ تھی۔ صرف تمدنی، لسانی، مذہبی اور مقامی معاملات میں ان علاقوں اور ریاستوں کو آزادی دی گئی تھی۔ سیاسی اور اقتصادی امور میں متحدہ مرکزی حکومت کو پورے اختیار حاصل تھے اور اب بھی ہیں۔ جب کبھی رجعت پسندوں نے اپنے اپنے علاقوں میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کھڑی کرنی چاہی تو ان کو سختی کے ساتھ دبا دیا گیا۔ اور کسی ریاست کو یہ اختیار نہ دیا کہ وہ اپنی بنیاد مذہب پر رکھے۔ بلکہ اپنی کتاب میں ستالین نے "پان اسلامی" جذبے کی شدید مذمت کی ہے اور "پان اسلامزم" کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:-

"پان اسلامزم ــــ یہ ترکی اور تاتاری اونچے طبقے والوں (یعنی خانوں، تاجروں، زمینداروں اور ملاؤں) کی وہ سیاسی تحریک ہے جو سب مسلمانوں کو ایک مشترک ریاست میں متحد کرنا چاہتی ہے۔"

ظاہر ہے کہ ستالین اس تحریک کا مخالف تھا۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ گو فرداً فرداً روس کے اسلامی علاقوں کو آزادی اور حق خود ارادیت حاصل ہے لیکن مذہب کے نام پر ان کو متحد ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اب یہ آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ پاکستان اور اس "پان اسلامزم" میں کیا فرق ہے جس کی مخالفت ستالین نے کی تھی۔ میری

رائے میں تو ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ صرف "خانوں" کے بجائے "خان بہادروں" پڑھنے کی ضرورت ہے۔
جن بہادروں اور اونچے ارادے والوں نے روس میں انقلابی حکومت کی بنیاد رکھی تھی وہ ہرگز اس کے لئے تیار نہیں
تھے کہ رجعت پسندوں کو موقع دیں کہ وہ جائز خود ارادیت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تمام ملک کی آزادی اور زندگی
کو خطرے میں ڈالیں۔ آج جس طرح ہندوستان کے سرحدی صوبوں کو ہندوستان سے علٰحدہ کرنے کے منصوبے کئے
جا رہے ہیں ایسا موقع سوویت روس کی تاریخ میں بھی آیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں سٹالین نے ان کھلے الفاظ میں اس
افتراق پرور۔ تحریک کی مخالفت کی تھی:-

"ہم سرحدی علاقوں کی علٰحدگی کے مطالبے کو بالکل رد کرتے ہیں۔ ہم اس کے موافق ضرور ہیں کہ ہندستان
عرب، مصر اور مراقش اپنی سلطنتوں سے علٰحدہ ہو جائیں۔ کیونکہ اس علٰحدگی کا مطلب ہوگا، مجبور اور غلام ملکوں کی
آزادی، شہنشاہیت کی طاقت پر ایک ضرب اور انقلاب کی قوت میں اضافہ۔ مگر ہم روس کے سرحدی علاقوں
کی علٰحدگی کے خلاف ہیں کیونکہ یہ سرحدی صوبے شہنشاہیت کے غلام ہو جائیں گے اور اس طرح روس کے انقلابی
طاقت کو دھکا پہنچے گا اور شہنشاہیت کی پوزیشن اور مضبوط ہو جائے گی۔"

علٰحدگی کا قانونی حق

سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے (جیسا کہ مسلم لیگی اور کمیونسٹ اکثر کہتے ہیں) کہ سوویت روس کی جمہوری
ریاستوں کو علٰحدگی کا حق حاصل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔

(۱) ایسا حق "سوویت اتحاد" کی صرف بڑی بڑی ریاستوں کو حاصل ہے۔ ہر چھوٹی موٹی ریاست کو نہیں ہے۔
(۲) ایسی بڑی ریاستیں صرف سولہ ہیں حالانکہ قومیتیں سینکڑوں ہیں۔
(۳) ان ریاستوں کی حکومت پر کمیونسٹ پارٹی حاوی ہے اور یہ پارٹی ایک مرکزی نظام کے ماتحت ہے۔
(۴) علٰحدگی کا حق بیس سال کے کمیونسٹ پروپگنڈا اور کمیونسٹ اصولوں کی تعلیم کے بعد دیا گیا ہے جب یقین کر لیا
گیا کہ اس حق کو سوویت اتحاد کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ یہ حق اس وقت دیا گیا ہے جب سرمایہ داروں، مذہبی
پیشواؤں، زمینداروں اور رجعت پسندوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ جس وقت یہ رجعت پسند طبقے اپنی قوموں
کی طرف سے علٰحدگی کا حق مانگ رہے تھے اس وقت یہ حق نہیں دیا گیا۔

کیا چند لمحوں کے لئے بھی یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ انقلاب کے فوراً بعد لینن اور سٹالین ازبکستان، قزاقستان وغیرہ
کو علٰحدگی کا حق دیدیتے جب اس حق کو ملّا، زمیندار، سرمایہ دار اور قدامت پسند کمیونزم اور انقلاب اور آزادی کے خلاف
استعمال کرتے۔ ہرگز نہیں۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر پاکستان کا مطالبہ منظور کر لیا تو وہ کون سے طبقے ہیں۔ جو اس
"خالص اسلامی ریاست" میں برسر اقتدار ہوں گے۔

پاکستان کی تعریف

پاکستان کیا ہے؟ مسٹر جناح کے الفاظ میں :-

"لاکھوں مسلمان پاکستان کی خاطر اپنا خون بہانے کو تیار ہیں - پاکستان صرف ایک نعرہ نہیں ہے - پاکستان ہی میں مسلمانوں کی نجات ہے، ان کی مدافعت ہے اور ان کی قسمت ہے - ایک دفعہ دنیا پھر اس اعلان سے گونج اٹھے گی کہ ایک اسلامی ریاست قائم ہو گئی ہے جو اسلام کی گزشتہ شان و شوکت کو پھر زندہ کرے گی۔"

اور ایک موقعہ پر مسٹر جناح نے فرمایا تھا :-

"پاکستان ہمیشہ سے ہے ...... ہندو اور مسلمان اگر وہ ساتھ شہروں اور دیہاتوں میں رہتے رہے ہیں، کبھی ایک دوسرے میں نہیں ملے - وہ مختلف قومیں ہیں۔"

غرض پاکستان کی تعریف ہمیشہ ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ "ہندوستانی مسلمان ایک قوم ہیں اور اس لئے اُن کو الگ ایک اسلامی ریاست درکار ہے۔"

یہ وہ مطالبہ ہے جس کو کمیونسٹ سراہتے ہیں اور جس کے متعلق میرے دوست سجاد ظہیر نے لکھا ہے کہ "پاکستان ہندوستان کے جذبۂ آزادی کی پیدائش ہے"!

سیاہ اور سفید

جہاں تک میں سمجھتا ہوں پاکستان اور سوویت روس کے نظام میں سیاہ اور سفید کا فرق ہے -

روس میں حق خود ارادیت قومیتوں کو بلا لحاظ مذہب دیا گیا ہے، پاکستان قومیت کی بنیاد ہی مذہب پر رکھتا ہے - حالانکہ لینن اور ستالین دونوں نے اس نظریئے کی تردید کی ہے -

روس میں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے علاقوں کو ان کی زبان اور تمدن کی بنیاد پر حق خود ارادیت دیا گیا ہے، پاکستان مختلف تمدنوں اور زبانوں والوں (مثلاً بلوچی، سندھی، پنجابی، بنگالی مسلمانوں) کو ایک قومیت اور ایک ریاست کے ماتحت لانا چاہتا ہے -

روس میں پہلے انقلاب ہوا - پھر قدامت پسندوں اور سرمایہ داروں کا خاتمہ کیا گیا، اس کے بعد حق خود ارادیت دیا گیا - پاکستان ان طبقوں کو طاقت بخشنا چاہتا ہے جن کو انقلاب روس نے فنا کیا -

ستالین نے کھلے الفاظ میں سرحدی علاقوں کی علیحدگی کے مطالبے کو رد کیا - کامریڈ جوشی اور سجاد ظہیر ان علاقوں کو یہ حق فوراً دینا چاہتے ہیں -

آخر اس سفید اور سیاہ میں کس طرح مطابقت پیدا کی جاسکتی ہے؟ کیا ہمارے کمیونسٹ بھائی بیوقوف ہیں یا

ہمیں بے وقوف بنانا چاہتے ہیں؟ یا اُنھوں نے اپنے دماغوں کو مسمریزم کے اثر سے اِس امر کا یقین دلا دیا ہے کہ پاکستان اور روسی نظام ایک ہی چیز ہے؟ کیا کمیونسٹ اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے رہے؟

مسٹر جناح "مسلم قوم" کا ذکر کرتے ہیں۔ کمیونسٹ "مسلم قومیتوں" کا راگ الاپتے ہیں۔ مسلم لیگ مطالبہ کرتی ہے کہ ہندوستان کو دو حصوں میں منقسم کیا جائے "ہندو۔ستان" اور "پاکستان"۔ کمیونسٹ ذجانے کس طرح اس کا یہ مطلب نکالتے ہیں کہ ہندوستان کو زبان اور تمدن کے لحاظ سے تقسیم کیا جا رہا ہے اور بلوچی، سندھی، بنگالی، بہاری، تامل، تلنگو، مرہٹہ اور گجراتی قومیتوں کے لئے حق خود ارادیت مانگا جا رہا ہے۔ مسلم لیگ اور مسٹر جناح مذہب ——— اور صرف مذہب کی رو سے ہندوستانیوں کو دو (اور صرف دو) قوموں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ مارکسزم کے کس اصول کے ماتحت کمیونسٹ اس کو روا رکھتے ہیں؟

کانگریس اور سوویٹ

اس کے برخلاف کانگریس نے مختلف صوبوں اور قومیتوں کا حق خود ارادیت تقریباً ان ہی الفاظ میں تسلیم کیا ہے جو لینن اور سٹالین نے اسی سلسلے میں استعمال کئے ہیں۔ لینن نے کہا "ریاست کو مذہب سے کوئی سروکار نہ ہوگا" کانگریس نے کراچی ریزولیوشن میں کہا "آزاد ہندوستان میں حکومت مذہب کے معاملے میں غیر جانب دار ہوگی۔" لینن نے کہا "ہر شخص کو آزادی حاصل ہونی چاہئے کہ وہ جو مذہب چاہے اختیار کرے یا لامذہب رہے" کانگریس نے کہا "آزاد ہندوستان میں ہر شہری کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی" لینن نے مختلف قومیتوں سے وعدہ کیا تھا "تمھارے عقائد اور رسومات، تمھاری زبان اور تمھارا قومی تمدن اور تمھاری معاشرت اب آزاد ہیں اور ان کو کوئی ٹھیس نہیں لگا سکتا" کانگریس نے اعلان کیا کہ "تمدنی علاقوں اور اقلیتوں کی زبان، تمدن، طرز تحریر کی ہر طرح حفاظت کی جائے گی۔"

کانگریس نے نہ صرف ریزولیوشن پاس کئے بلکہ اپنے نظام میں صوبوں کو تمدن اور زبان کے لحاظ سے تقسیم کیا۔ کانگریس نے اپنے دہلی کے ریزولیوشن میں یہ تک مان لیا کہ ہر صوبے اور علاقے کو علیحدگی کا حق حاصل ہوگا۔

پھر کانگریس اور مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹی میں کیا فرق رہا؟

فرق یہ ہے۔ اور یہ بہت اہم فرق ہے۔

کانگریس ملک کی تقسیم تمدن اور زبان کے لحاظ سے کرنے پر تیار ہے۔

مسلم لیگ مذہب کے لحاظ سے تقسیم چاہتی ہے۔

کمیونسٹوں کے اصول کانگریس کی حمایت کرتے ہیں مگر ان کی پارٹی مسلم لیگ کی پشت پناہ ہے۔

کاش ہمارے کمیونسٹ بھائی رات دن دنیا کے سب سے بڑے کمیونسٹ لینن کے ان الفاظ کو دھرایا کریں:۔

"ریاست کو مذہب سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہئے۔ مذہبی گروہ ریاست سے متعلق نہ ہونے چاہئیں۔"

سندھیا اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ
ہندستان میں تجارتی جہازرانی کے پیشرو
ایجنٹ
نروتم مرارجی اینڈ کمپنی
مال اور مسافروں کی سروس
مال اور مسافروں کی بکنگ، اور روانگی کی تاریخوں کے لئے
براہ کرم سندھیا ہاؤس سے خط و کتابت کیجئے۔
کوکن، کراچی اور ساحلی سروس کے لئے۔
ملحق کمپنیاں
دی بنگال اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ
دی انڈین کاپریٹو اینڈ ٹرانسپورٹ کمپنی لمیٹڈ
دی رتناگر اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ
دی ہج لائن لمیٹڈ
دی بمبئی اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ
دی ایسٹرن اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ
ہندستان اور سیلون کی
تمام اہم بندرگاہوں پر
برانچ آفس اور ایجنسیاں
موجود ہیں۔
سندھیا ہاؤس - بلارڈ اسٹیٹ بمبئی
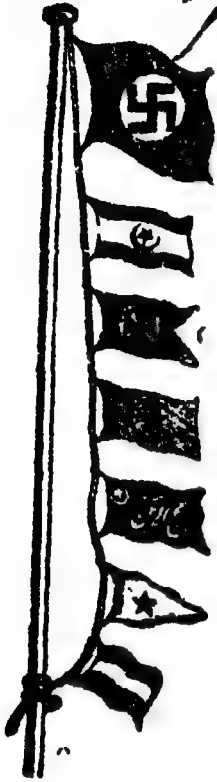
باب تیسرا

قومی زبان کا مسئلہ

ڈاکٹر بینی پرشاد
پروفیسر محمد اجمل خاں
رگھو بیر سرن دواکر

تعلیم اور سماجی تنظیم

از:— ڈاکٹر بینی پرشاد

تعلیم کا معاشرتی زندگی سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ کسی قسم کی سماجی اصلاح اس وقت تک پائدار نہیں ثابت ہو سکتی جب تک اُسی کے مطابق تعلیم کی بھی اشاعت اور اصلاح نہ کی جائے۔ مثال کے طور پر اٹھارھویں صدی میں پرتگال، اسپین اور آسٹریا کے بادشاہ جوزف دوئم کے اصلاحی پروگرام صرف اس لئے ناکامیاب رہے کہ لوگ اتنے تعلیم یافتہ نہیں تھے کہ اُن کو ہضم کرنا تو ایک طرف اُن کی قدر و قیمت بھی سمجھ سکتے۔

بڑے بڑے انقلابات سے سیاسی اور اقتصادی فائدے صرف اس لئے نہیں اُٹھائے جا سکے کہ ان انقلابات کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں وقتی طور پر عنانِ حکومت آئی تھی انہیں تعلیم کی وسیع اشاعت کی اہمیت اور ضرورت کا احساس نہیں تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں جمہوری طرزِ حکومت سے جو بڑی بڑی توقعات وابستہ کی گئی تھیں وہ بھی صرف اس لئے نہیں پوری ہو سکیں کہ تعلیم کا معیار کافی بلند نہیں رہا۔ ہندوستان میں گذشتہ سالوں میں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر دیہات سدھار اور زراعتی ترقی کے بہت سے معمولی معمولی پروگرام زیر عمل لائے گئے لیکن وہ صرف اس لئے بے اثر ثابت ہوئے کہ اُس کے ساتھ ساتھ عام ناخواندگی دور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ہندوستان میں اس حقیقت کی طرف دھیان نہیں دیا گیا ہے کہ کاشتکار صرف تعلیم ہی کے ذریعہ نئے اور ترقی یافتہ ذرائع پیداوار سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکیں گے ورنہ اُن کے تمام فائدے پھر وہی لوگ چھین لے جائیں گے جو اُن کا استحصال کرتے آئے ہیں۔ یہ اِس بات کو بھی اچھی طرح نہیں محسوس کیا گیا ہے کہ صرف تعلیم ہی لوگوں کو ایک بلند معیارِ زندگی کا عادی بنا سکتی ہے۔ عام ناخواندگی جس کے ساتھ عام مفلسی اور غربت لازمی طور پر وابستہ ہے اُور جنتا اور حکومت کے معاملات میں ایمانداری

اور صلاحیت کے معیار کو بہت گھٹا دیتی ہے۔ اُسی طرح تعلیمی اصلاح بھی اُس وقت تک پائداری نہیں حاصل کرسکتی جب تک ہمارا سماجی نظام بھی مواقع کی یکساں فراہمی کے اصول پر کاربند ہونے کے لئے تیار نہ ہو جائے گی۔ این کارور اپنی تصنیف "قوت انسانی کی پیداوار اور تقسیم" (THE ECONOMY OF HUMAN ENERGY) میں سماجی عمل کے متعلق کہتا ہے کہ قوت انسانی پہلے ایک نئے سانچے میں ڈھلتی ہے پھر سماج میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اسی منقلب قوت انسانی کا دوسرا نام تمدن ہے اور اُسی قوت انسانی سے اعلیٰ سے اعلیٰ فائدہ اُٹھانا ترقی کہلاتا ہے۔ لیکن تنظیم اس قوت انسانی کے منقلب مجتمع اور منقسم ہونے کا سب سے اہم ذریعہ ہے اور تعلیم ہی کے ذریعہ اس مجتمع قوت انسانی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ بھی اُٹھایا جاسکتا ہے۔

تعلیم اور سماجی نظام کا یہ باہمی انحصار ہمیں جس عملی نتیجہ پر پہنچاتا ہے وہ یہ ہے کہ تعلیم اور تنظیم دونوں اُسی وقت پورے طور پر کامیاب ثابت ہوسکتی ہیں اور اُسی وقت انھیں بُرے نتائج سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے جب دونوں کے پیش نظر ہر انسانی فرد کے لئے مواقع کی زیادہ سے زیادہ یکساں فراہمی کا مقصد ہو۔ اگر تعلیم کے راستہ میں رکاوٹیں حائل ہیں یا اُس میں خامیاں ہیں تو سیاست داں سماجی زندگی کے معیار اور اُس کی خاصیت کو بلند کرنے سے قاصر رہے گا۔ اگر سماجی تنظیم کی بنیاد مراعات اور نقائص پر قائم ہے تو تعلیم ہمہ گیر نہیں ہوسکتی اور نہ تعلیم کا معیار ہی بلند ہوسکتا ہے۔ اگر تجارت اور کاروبار میں منافع خوری کا خود غرضانہ مقصد کارفرما ہے اور حکومت ناکارہ اور جابر ہے تو صحیح تعلیم کی اشاعت اور ترقی غیر ممکن ہے۔ اعلیٰ ترقی اُسی وقت ممکن ہے جب سماجی زندگی کی ہر سمت اور ہر میدان میں ایک ساتھ ترقی ہو۔ تعلیم دراصل داخلی زندگی کی نشو و نما کرنے اور اس میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے فن کا نام ہے۔ اور سیاست کا فن صرف یہ ہے کہ شخصیت کی ترقی اور نشو نما کے لئے موزوں حالات اور ماحول پیدا کرتی رہے۔ لیکن انسان چونکہ بنیادی طور پر معاشرتی اور سماجی واقع ہوا ہے اس لئے انسان کی داخلی ترقی اور خارجی ماحول کے درمیان ایک باہمی انحصار پایا جاتا ہے۔ جب تک لوگ شخصیت کی ایک خاص بلندی معیار تک نہ پہنچ جائیں اُس وقت تک وہ موزوں خارجی حالات کو نہ تو سمجھ سکتے ہیں اور نہ برقرار رکھ سکتے ہیں۔ سیاست کو چاہئے کہ وہ تعلیم کے لئے فضا موزوں کرے اور تعلیم کا فرض ہے کہ سیاسی شعور اور جذبہ کو تقویت دے یعنی سماجی فلاح و بہبود کے کام کے لئے لوگوں کے اندر جذبہ اور تحریک پیدا کرے۔ یہی دونوں چیزیں مل کر انسان کو اپنی قسمت کا مالک بناسکتی ہیں۔

ایسے ادارے جو تربیت کرسکیں

اعلیٰ اور موزوں نظام تعلیم انسان کی شخصیت کی نشو و نما کرتا ہے۔ جس سے یہ مُراد ہے کہ انسان کے اندر طاقت، ارادہ کی بلندی، تخلیقی صلاحیت اور بہت سے اُمور میں دلچسپی لینے کا مادّہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ صنعتیں اُسی وقت برقرار رہ سکتی ہیں جب سماج اُن کے اظہار کے لئے مواقع فراہم کرتا رہے۔ وہ تعلیم جو ہمیں سوسائٹی سے ملتی ہے اُسے اسکولوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ یعنی سیاسی اور اقتصادی اداروں کی تنظیم ایسی ہونی چاہئے کہ اُن سے تعلیم کے مسلسل مواقع فراہم ہوتے رہیں۔ تجربہ کی قدر و قیمت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو اور سماج میں ترقی کا زیادہ سے زیادہ مادّہ پیدا ہو۔ تمدن، انسانی سماج کی تنظیم کا نام ہے لیکن جو چیز تمدن کی تنظیم کرتی ہے وہ یہی تعلیم ہے۔ تعلیم کا بلند علمی مفہوم یہ ہونا چاہئے کہ بہ یک وقت پورے سماج سے ہمیں تعلیم و تربیت اور آگاہی حاصل ہو۔ اُس سوسائٹی کے ادارے جس میں ایک جماعت مسلسل اور خاموش طور پر دوسری جماعت کے خلاف طاقت کا استعمال جاری رکھتی ہے

خوف یا تکبر جیسی مذموم خصلتوں کو جنم دیتے ہیں۔ اور شخصیت کو یا تو ترقی کرنے سے روک دیتے ہیں یا اُسے معدوم کر دیتے ہیں۔ جب سوسائٹی میں کچھ لوگوں کو مراعات حاصل رہتی ہیں اور کچھ لوگ اپنے حقوق سے محروم کر دیئے جاتے ہیں تو اس سے لوگوں کے اندر بے انصافی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد اپنی صلاحیتوں اور امکانات کو ترقی دینے سے محروم رہ جاتی ہے۔ بے پناہ مقابلہ اور استحصال ہماری اخلاقی قوت کو تباہ کر دیتا ہے۔ سماج میں اگر اس قسم کا نظام مدارج (STRATIFICATION) موجود ہوتا ہے جس سے ایک طبقہ دوسرے طبقہ سے ربط نہیں قائم کر سکتا تو اُس سے سوسائٹی میں ایک ساتھ رہنے کے جو تہذیبی فائدے ہوتے ہیں وہ نہیں حاصل ہوتے۔ جمہوریت سماج کے اندرونی تعلقات کے ذرائع کو لاتعداد کر دیتی ہے اور ایک دوسرے سے جاننے اور دور رہنے کے رجحان کو رد کرتی ہے۔ اُس سماجی نظام میں کہیں نہ کہیں یقیناً کوئی خرابی ہے جس میں ہر شخص کو یہ نہیں محسوس ہوتا کہ میں بھی کچھ ہوں اور پھر بھی سماج کی خیر و فلاح کے کام میں تھوڑا سا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اگر سیاسی جذبہ اور شعور کو اپنے اظہار کے لئے مناسب اور موزوں میدان نہیں ملتا تو وہ سازش میں بدل جاتا ہے۔ یا اس کا اظہار بہت ہنگامی طریقے سے ہونے لگتا ہے اور سیاست خود اپنا مقصد آپ بن جاتی ہے۔ ایسے سماج میں تعلیم ذاتی ترقی اور مال و دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اور نصاب رائج سماجی اور سیاسی نظام کی حمایت کرنے لگتا ہے۔

ایسی حکومت جو ہماری تربیت کر سکے

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو حکومت پر زمانۂ حال کے سب سے طاقتور ادارہ ہونے کی حیثیت سے ایک بے حد اہم فرض عائد ہوتا ہے۔ یعنی حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذمہ اُن امور کو لے لے جن کا تعلق پوری قومی تنظیم سے ہے یا جس میں بین الاقوامی امداد کی ضرورت ہے ان امور کو اس طرح انجام دینے اور دوسرے اداروں کے کام کو اس طرح باربط اور ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر شخص کو اپنی شخصیت کو سنوارنے اور ترقی دینے کا پورا پورا موقع ملے۔ اسی سے ایک ایسی حکومت کا تصور پیدا ہوتا ہے جس کا اساس ہی تعلیم و تربیت کے اصول پر ہو۔ ایسی حکومت میں لوگوں کو اوپر سے دباؤ نہیں ڈالا جاتا بلکہ خود اُن کے اندر خود ضبطی کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ تعلیم دراصل سیاست کا نقطۂ عروج ہے اس لئے کہ اس کا مقصد سماج کے پورے رُخ اور اس کے پورے رجحان کو عقلیت آمیز کرنا ہے۔

اس سے تین عملی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ حکومت کو اس طرح منظم کرنے کی ضرورت ہے کہ لوگوں کے اندر قوت فیصلہ اور عمدہ ارادے پیدا ہوں، تعلیم کی طرف رجحان بڑھے اور سماجی اُمور میں حصہ لینے کا جذبہ وجود میں آئے اور بحث و مباحثہ اور غور و خوض کے مواقع ملیں۔ ایسی حکومت کے لئے جو اپنے تعلیمی فرض کو پورے پورے طور پر ادا کرنا چاہتی ہیں نہ صرف جمہوریت بلکہ عقلی (RATIONAL) اصولوں پر قائم ہونا بے حد ضروری ہے۔ وہ لوگ جو سیاسی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں چھیننا چاہتے ہیں غیر عقلی عناصر پر زور دیتے ہیں۔ چنانچہ ہٹلر کہتا ہے کہ پروپیگنڈا سائنس نہیں ہے۔ اس لئے کہ پروپیگنڈا ایسا ہونا چاہئے کہ اس سے لوگوں کے جذبات بھڑکیں۔ اور دماغ کو صرف ایک محدود انداز میں اپیل کرے۔ اگر سیاسی ذہنی اور بین الاقوامی حالات جمہوری حکومت کے لئے آج موزوں نہیں ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک مکمل تعلیمی نظام کے لئے بھی ابھی فضا موزوں نہیں ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جمہوری حکومت کے قیام کے بغیر تعلیمی نظام کے نامکمل رہنے کا نظریہ غلط ہے۔

دوسرا عملی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پیشہ، مذہب اور کلچر وغیرہ سے متعلق تمام اداروں کو جن میں خاندان بھی شامل ہے، تعلیمی اصولوں پر تنظیم کا کام حکومت کا فرض ہے حکومت کا کام عام طور سے یہی تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ ملک کے مختلف اداروں کے کام میں اتحاد و ہم آہنگی کی صورت پیدا کرتی ہے چنانچہ حکومت کے اس بنیادی فرض کا اصل پہلو یہی اداروں کو تعلیمی اصولوں پر منظم کرنا ہے۔

تیسرے، حکومت کا فرض ہے کہ وہ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کو عام کرے اور بالغوں کی تعلیم و خواندگی کا مکمل انتظام کرے۔ یہی وہ فرض ہے جسے ادا کر کے کسی ملک کی حکومت نہ صرف انسانیت کی خدمت کر سکتی ہے بلکہ اپنی بھی۔ اس لئے کہ تعلیم کے عام ہوئے بغیر خود حکومت کے کام میں خوبی اور تکمیل نہیں پیدا ہو سکتی۔ تمدن جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے ہمارے دماغ پر وزن زیادہ ڈالتا ہے۔ چنانچہ اس وزن اور تناؤ کو برداشت کرنے کے لئے لوگوں کا زیور تعلیم سے آراستہ ہونا ضروری ہے تمدن کا نتیجہ حیات اجتماعی میں اعصاب شکنی کے علاوہ کچھ نہیں۔ تعلیم دراصل تمدن سے ہم آہنگی حاصل کرنے کا نام ہے اس لئے تمدن کے عروج کے ساتھ تعلیم کا عروج بھی لازمی اور ضروری ہے۔ تعلیم ہی کی مدد سے اقتصادیات اور سیاست محض روٹین (ROUTINE) بن کر نہیں رہ جاتی اور تعلیم ہی تمدن کو ایک خاص رُخ اور ایک خاص مقصد عطا کرتی ہے۔ برنارڈ شا نے کبھی اپنے ایک تنے بیچے تلے جملے میں کہا تھا کہ "اسکول ماسٹر ہمیں کوئی راستہ نہیں بتلاتا"۔ لیکن یہ کہنا اس سے زیادہ صحیح ہوگا کہ اسکول ماسٹر کے بغیر ہمیں کوئی راستہ بھی نہیں ملتا۔

چنانچہ تعلیم کو عالی اور اکمل بنانے کے لئے ضرورت ہے کہ ادنیٰ سے اعلیٰ درجہ تک کی تعلیم کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے، تعلیم کو نفسیاتی اصولوں پر قائم کیا جائے اور سماجی اداروں کے فرائض اور کام کو تعلیمی نظام کے مقصد سے ہم آہنگ کیا جائے۔

ان باتوں کا ایک بین الاقوامی پہلو ہے اور اس کی تشریح یہ ہے کہ سماجی اور تعلیمی تنظیم کا مقصد اس وقت بہت گر جاتا ہے جب اس پر شہنشاہیت اور عسکریت کی روح غالب آنے لگتی ہے اس لئے کہ ان چیزوں کی بنیاد دوسری قوموں کی کمزوری پر قائم ہے اور پھر آپس کے حسد اور دشمنی پر جو بجائے خود نتیجہ ہے خود غرضی اور لوٹ کھسوٹ کا۔ چنانچہ جرمنی اور اطالیہ میں تعلیم پر دست درازی کی گئی ہے وہ نتیجہ ہے وہاں کی جارحانہ قومیت کا۔ یہی قومیت وہاں کی آمرانہ سیاست اور حکومت میں بھی متشکل ہوئی جو خارجی سیاست، جذبہ انتقام اور خود غرضی کی پیداوار ہے۔ آسٹریا، پولینڈ، جاپان اور دوسرے ملکوں میں قومیت کے تحت زندگی میں عسکریت پیدا کرنے کے لئے تعلیم سے مدد لی گئی ہے۔ محکوم ممالک میں آج شخصیت کی ترقی اور بھی مشکل ہے اس لئے کہ کروڑوں انسان ناخواندگی، جہالت، مایوسی اور احساس تنزل کے شکار ہیں۔ اقتصادی دنیا کی طرح تعلیمی دنیا میں بھی مختلف قوموں اور ملکوں کی تقدیریں ایک ہی رشتہ میں منسلک ہیں۔ دُنیا کے پچھڑے اور دبے ہوئے ملکوں میں تعلیم کی روشنی پھیلانا نہ صرف وہاں کے باشندوں کے لئے باعثِ رحمت ہوگا بلکہ یہ ساری دنیا کی دائمی اور حقیقی خیر و فلاح کے لئے بھی ضروری ہے۔ موجودہ دور میں سماجی حقائق اور تعلیمی اصولوں کے درمیان جو بے تعلقی اور تضاد کی سی کیفیت پائی جاتی ہے اس کا ہر جماعت اور ہر ملک سے دور ہونا بے حد ضروری ہے۔ وہ ریاست جس کی اساس تعلیمی مقصد پر استوار ہوگی اس وقت تک اپنے یہاں پھل پھول نہیں سکتی جب تک دوسرے ملکوں میں

بھی اُسی قسم کی ریاست موجود میں نہ آجائے تعلیم کا اصول خواہ اس کا وسیع مفہوم لیا جائے یا محدود، ہر حال میں ایک عالمگیر اور ہمہ گیر اصول ہے۔ اس قسم کی تعلیم دنیا پر عقل کی حکومت قائم کر دے گی اور سماجی تبدیلیوں اور انقلابات سے تشدد کے عنصر کو مٹا دے گی۔ اگر تعلیم صحیح اصولوں پر دی جائے تو اس سے نہ صرف یہ کہ انسان کے اندر حالات سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے بلکہ حالات کو بدلنے اور ایک اعلیٰ اور برتر زندگی کے امکانات کی تلاش اور ان کی حقیقی شکل دینے کا مادّہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ ارسطو کا قول ہے کہ ریاست محض اجتماع کا نام ہے اور اس اجتماع کو اگر حقیقی برادری (COMMUNITY) میں تبدیل کیا جا سکتا ہے تو صرف تعلیم کے ذریعہ۔ تعلیم ہی کی مدد سے اقوام عالم کو اُن کی "قدرتی حالت"[1] (STATE OF NATURE) سے باہر نکالا جا سکتا ہے جس میں آج وہ مبتلا ہیں۔ ہابس (سترھویں صدی کا ایک انگریز سیاسی مفکر) کے نکتۂ نظر سے اقوام عالم باوجود مہذب اور متمدن ہونے کے اس لئے "قدرتی حالت" میں ہیں کہ ان کے درمیان جنگ و جدال کی ایک دائمی صورت قائم رہتی ہے۔ آج بنی نوع انسان جہاں کہیں بھی آباد ہو بیسویں صدی قبل مسیح اور بیسویں صدی عیسوی کے درمیان زندگی گزار رہی ہے لیکن اگر تعلیم کو ہمہ گیر کرنے کی ایک مستقل، مسلسل اور جم کر کوشش کی جائے تو پوری انسانیت کو ایک برادری میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ والدین بالکل سامنے کے حالات یا ایک صدی بعد کے حالات کو پیش نظر رکھ کر اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دیتے بلکہ ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے جن کے اولاد کے سن بلوغ میں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اگر ملک میں اصلاح اور تبدیلی کا رجحان ہے تو والدین کی خواہش اپنی اولاد کو اس اصلاح شدہ ماحول کے مناسب حال تعلیم دلانے کی ہو گی۔ نہ کہ پیش نظر ماحول کے بموجب۔ اعلیٰ ترین زندگی کے حصول کے لئے تعلیم کو ایسے اصولوں کی پابندی کرنی چاہئے کہ شخصیت اور انفرادیت کی ترقی کے لئے جس تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے وہ اس تعلیم سے علٰحدہ نہ معلوم ہو جو قومی ضروریات کے پیش نظر دی جاتی ہے۔ تعلیمی سلسلہ میں انفرادی ضرورت اور قومی ضرورت کے درمیان آج جو تضاد و تخالف کا پہلو موجود ہے اسے مٹ جانا چاہئے۔

آج تاریخ عالم عظیم الشان انقلابات کا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے۔ لیکن اس سے غلط راستوں پر چل کھڑے ہونے اور باہمی مناقشوں اور مصائب کے پیدا ہونے کا امکان بھی بہت زیادہ ہے۔ موجودہ صورت حال سے شدید بے اطمینانی اور تبدیلی و انقلاب کے لابدی ہونے کا تیز احساس انسانی دماغ کو مختلف النوع تجربوں اور عجیب عجیب قسم کے ردّ عمل کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ ۱۹۱۴ء کے بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ ذرائع رسل و رسائل کی سہولتوں کی وجہ سے تعلیم کے حامیوں کی اُمیدیں قائم ہیں، لوگوں کے دل و دماغ کو نئے نئے طریقوں سے متاثر کرنے کے ذرائع وجود میں آگئے ہیں۔ چنانچہ ہمہ گیر تعلیم سے انسان کے اندر مختلف چیزوں میں تفریق پیدا کرنے کا مادّہ پیدا ہوگا، اعلیٰ اور برتر زندگی کی طرف ہمارے قدم تیزی سے اُٹھنے لگیں گے اور لاتعداد انسانوں کی خوابیدہ صلاحیتیں کسمسا کر جاگ اُٹھیں گی۔ اسٹینلی ہال کا قول ہے

---

[1] "قدرتی حالت" کی اصطلاح کو یورپ کے سیاسی مفکرین نے ماقبل تہذیب کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

۔ انسان اپنے مستقبل کا خام مواد ہے ۔ لیکن وہ اس وقت تک اپنی صلاحیتوں کے نقطۂ عروج تک نہیں پہنچ سکتا جب تک پوری انسانیت زندگی کی ایک بلند تر منزل پر نہ پہنچ جائے ۔ تمدن ایک ایسے سعی و عمل کا نام ہے جس میں امداد باہمی لازمی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے ۔ چنانچہ اگر دنیا کے ایک خطہ میں جہالت، خامیوں اور ناقص تعلیم کا رواج رہا تو اس سے نہ صرف اس مخصوص خطہ میں بلکہ کم و بیش پوری دنیا میں زندگی کا لب و لہجہ دھیما ہو جائے گا ۔ وہ روائتیں جو ایسے ماحول میں نشو و نما پاتی ہیں زندگی کی عالی مسرتوں کو گرا کر حیوانی تشنگی میں بدل دیتی ہیں، تشدد کو انسانی تعلقات میں ایک اہم حربہ کا درجہ دے دیتی ہیں اور معمولی انسانوں کے لئے عظیم الشان شخصیتوں کے قدم بہ قدم چلنا ناممکن ہو جاتا ہے اس لئے کہ ان کے اندر اس کی صلاحیت ہی نہیں پیدا ہوتی ۔

بنیادی ہندستانی اور رومن خط

از :۔۔۔ محمد اجمل خاں (موجد بنیادی ہندستانی)

اگر ہم دنیا کی قوموں میں ایک ترقی کرنے والی قوم سمجھے جانے کے مستحق ہیں، تو اور دوسری چیزوں کے علاوہ ہمیں دو باتیں فوراً اختیار کر لینا چاہیئے۔ ایک تو بنیادی ہندستانی زبان، اور دوسرے رومن (یعنی لیٹن) رسم خط۔

بنیادی ہندستانی زبان کے متعلق ہم اسی میگزین میں پہلے لکھ چکے ہیں۔ یہ زبان ہندستانی زبان کو مختصر بنا دیتی ہے۔ یعنی بارہ سو لفظوں کے اندر اندر ہر شخص اپنا کام چلا سکتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ زبان بناوٹی ہے۔ بالکل اصلی زبان کا مزہ آتا ہے۔ لیکن بیسک انگلش کی طرح زبان کے قاعدوں کو محدود نہیں کیا گیا۔ تاکہ ہماری زبان جس نیچرل طریقے پر بنی ہے اور ترقی کر رہی ہے اُس میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے۔ بنیادی ہندستانی انسٹی ٹیوٹ الہ آباد نے اس زبان کی کتابیں اور لغت تیار کی ہیں۔ اور ایک رسالہ بھی اسی زبان اور رومن خط میں جلد شائع ہونے والا ہے۔

بنیادی ہندستانی کا سیکھنا بہت آسان ہے ہمارے ملک کے مختلف صوبوں میں ہندستانی زبان کے ہزاروں لفظ بولے جاتے ہیں۔ اگر کوئی پردیسی ہماری زبان سیکھنا چاہے تو دو تین ہفتوں کے اندر سیکھ سکتا ہے۔ لہذا یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ بنگالی یا گجراتی وغیرہ بولنے والے تو اسے دو دن میں سیکھ لیں گے۔ اور دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ ہندستان میں اگرچہ سیکڑوں بولیاں اور زبانیں ہیں لیکن ایک ایسی زبان ہے جسے ہندستان کا بچہ بچہ سمجھتا ہے اور جو اس زبان کو سیکھ لے وہ ہندستان کے کسی حصے میں تکلیف نہیں اٹھا سکتا۔

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زبان کو کس خط میں لکھا جائے؟ ہندستان میں بہت سے

خط جاری ہیں۔ خود ہندوستانی زبان تین خطوں میں لکھی جاتی ہے۔ یعنی اُردو۔ ہندی اور رومن۔ رومن میں لکھنے والے ابھی کم ہیں۔ ہماری تجویز ہے کہ ہندوستانی زبان اگر رومن میں اُسی قدر لکھی جائے جتنی اُردو یا ہندی میں لکھی جاتی ہے۔ تو ہندوستانی زبان پردیسیوں میں زیادہ تیزی سے رائج ہو جائے گی۔ اور خود ہمارے ملک سے اُردو ہندی کا جھگڑا ختم ہو کر ایک ترقی کرنے والی ہندوستانی زبان چل پڑے گی۔ اس چیز کو ہم ذرا تفصیل سے آگے بیان کرتے ہیں۔

جب کبھی ہندی اور اُردو کو ملا کر ہندوستان کی ایک مشترک زبان یعنی "ہندوستانی" بنانے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو ایک رسم خط، لیپی یا SCRIPT کی ایک دیوار بیچ میں آ جاتی ہے۔ اگر یہ پردہ اُٹھ جائے تو تھوڑے دنوں میں ہماری زبان صاف اور بامحاورہ ہو جائے اور راستے سے دو اور مشکلیں بھی ہٹ جائیں۔ یعنی۔

(۱) یہ سوال بھی حل ہو جائے کہ ہمیں اپنے لٹریچر کے لئے کونسی پوشک بھاشا "امدادی زبان" یا FEEDING LANGUAGE اختیار کرنا چاہئے۔ اور۔

(۲) ہمیں کس تمدن یا کلچر کو اپنا نمونہ یا IDEAL بنانا چاہئے؟ یہ دونوں ضمنی سوال ہیں۔ جو رسم خط کے طے ہوتے ہی خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کر سکے تو گویا ہم نے اپنی قومی تعلیم کے مسئلہ کی آدھی مشکلوں کو ایک آن میں ختم کر دیا۔ غرضیکہ اُردو خط یا ہندی کھائی کے علاوہ آپ رومن خط یا رومن لیپی بھی استعمال کرنا شروع کر دیجئے۔ ایک سال کے اندر ہندی اُردو کا جھگڑا مٹ جائے گا

ہندوستان کی زبانیں

آب و ہوا، پیداوار اور نسلوں کے اعتبار سے جس طرح ہمارا ملک ایک چھوٹا سا برّاعظم ہے، اُسی طرح یہاں بہت سی زبانیں اور سیکڑوں بولیاں رائج ہیں۔ لیکن سوائے جنوبی ہند کی تامل، تلنگی، کنڑی اور ملایلم کے باقی جتنی زبانیں ہیں وہ سب آرین خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور زیادہ تر پراکرتوں سے ترقی کر کے اس درجہ پر پہنچی ہیں۔ ان زبانوں میں سے جو زبانیں مغربی ہندوستان میں بولی جاتی ہیں اُنھیں بندیلی، قنوجی، برج بانگرو اور ہندوستانی کہتے ہیں۔ اور جو پورب میں بولی جاتی ہیں اُن کو اودھی، بگھیلی، چھتیس گڑھی، اُڑیہ اور بہاری کہتے ہیں۔ مغربی پنجاب کی زبانوں کو پشاوری، پشتو، ملتانی، شاہ پوری، سندھی، راجستھانی، گجراتی، لاڑی، بلوچی اور پامری میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور مشرقی پنجاب کی زبان کو پنجابی کہتے ہیں۔ ان زبانوں میں سے پامیری، پشتو اور بلوچی کی ماں اوستا ہے۔ یہ زبان مشرقی ایران میں بولی جاتی تھی اور اسی میں حضرت زرتشت کے وہ الہامی گیت ہیں جنھیں گاتھا کہتے ہیں۔ اوستا خود ایرانی زبان سے نکلی ہے۔ اصلی ایرانی زبان سے قدیم فارسی بنی تھی جس میں مقام بہستن دادا کے کتبے پائے جاتے ہیں۔ فارسی سے پہلوی (ساسانی بادشاہوں کی زبان) بنی پھر پارسی (ہزاروش یا پازند) ہوئی۔ جو آخرکار فارسی ہو گئی۔ خود سنسکرت اور قدیم ایرانی زبانیں ایک ہی مرکز سے چل کر اس قدر علٰحدہ ہو گئی ہیں کہ بعض دفعہ پہچاننے میں دقت ہوتی ہے۔

ہندستان کے مختلف حصّوں کو وہاں کے بسنے والوں کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مثلاً جہاں بنگالی قوم آباد تھی اور اُس کی ایک خاص زبان اور طرزِ معاشرت تھی اُسے بنگال کہتے تھے۔ تلنگوں کے ملک کو تلنگانہ، راجپوتوں کے ملک کو راجپوتانہ، روہیلوں کے ملک کو روہیلکھنڈ اور بگھیلوں کے ملک کو بگھیل کھنڈ کہتے تھے۔ چونکہ ہمارا صوبہ ہندوؤں کی قدیم تہذیب و تمدن کا مرکز تھا اس لئے اس کا نام ہندوستان تھا۔ اور یہاں کی زبان ہندستانی۔ ہندی، ریختہ اور اُردو کے مختلف نام پا چکی تھی۔ فارسی میں لکھنے والے اسے ہندی ہندوی یا ریختہ کہتے تھے۔ اور چونکہ یہ علمی زبان نہ تھی بلکہ عام لوگوں کی بول چال کے لئے مخصوص تھی لہٰذا اس میں صرف وہی لوگ لکھتے پڑھتے تھے جو یا تو سیدھے سادے مضامین پر قلم اُٹھاتے تھے۔ یا خیر

کی طرح فارسی اور ہندی کلچر کو ایک بنا کر ہندستان والوں کو سچی روحانی تعلیم دینا چاہتے تھے۔ اور یہ صرف اس طرح ممکن تھا کہ ملکی زبان اور ملکی استعاروں اور تشبیہوں میں اس چیز کو سمجھایا جائے تو صرف اسی وقت کی درباری زبان تک محدود رکھی۔

ہندستان میں مسلمانوں کے آنے کے بعد قدرتی طور پر ہندو مسلمانوں میں اتحاد بڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ ایسے لوگ بھی پیدا ہوگئے جو خالص توحید کی تعلیم دیتے تھے۔

بہرحال ہندو مسلمان کبھی اس قسم کے ہندو مسلمان نہ تھے کہ وہ بات بات پر جھگڑتے یا محض زبان کے لئے لڑتے رہتے دونوں نے مل کر ہندستانی زبان کو ترقی دی تو تو میں میں کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ لیکن ۱۹۰۱ء میں یا اس سے کچھ پہلے ہمارے صوبہ میں ہندی اردو کا سوال اٹھایا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی چیز دو مختلف خطوں میں لکھی جانے لگی۔ عدالت کی زبان اردو ہندی قرار پائی اسکولوں میں ایک ہی مضمون دو خطوں میں پڑھایا جانے لگا۔ اور اس تحریک کو اتنی ترقی دی گئی کہ ہماری متحدہ قومیت اور متحدہ کلچر یا تمدن خطرہ میں پڑ گیا۔ جس کو یہ بات سوجھی اچھی سوجھی نہ توپ کی ضرورت ہوئی نہ بندوق کی۔ مسلمان اور ہندو ایک ہی زبان کے دو ٹکڑے کرنے کے بعد الگ الگ اپنا اپنا راگ الاپنے لگے۔ ہندوؤں سے کہلوایا گیا کہ اردو رسم خط مسلمانوں کی چیز ہے مسلمانوں کو سمجھایا گیا کہ بھلا ہندی کو تم کیا جانو خبردار اس کے قریب نہ جانا اور اپنے تمدن کو نہ مٹانا۔ اس کا نتیجہ کو بہت خراب ہوا۔ لیکن ایک فائدہ ضرور ہوا۔ کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کو اردو ہندی میں لکھ کر گالیاں دیں لیکن چونکہ دونوں خط بہت کم لوگ جانتے ہیں اس لئے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے کی بھی کم نوبت آتی ہے۔

ہندی اردو خطوں کا موازنہ

ایک ہی زبان کے لئے جب سے دو خطوں کا استعمال شروع ہوا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی اور سنسکرت جاننے والوں نے اردو ہندی میں ایسے ثقیل الفاظ داخل کرنا شروع کئے کہ ایک ہی زبان دو زبانوں میں تقسیم ہو گئی۔ اور عام لوگوں کے لئے ان زبانوں کا سمجھنا مشکل ہوگیا۔ گریرسن نے LINGUISTIC SURVEY OF INDIA V.I.P.152 میں پسندوں کی زبان کی نقل اس طرح انگریزی میں کی ہے کہ ہر ایک اس کی جگہ لیٹن ترجمہ دے دیا ہے۔ یہ عبارت انجیل کی PARABLE OF PRODIGAL SON سے لی گئی ہے۔

A CERTAN VIR HAD TOW FILUSES. AND THE JUNIOR FILUSE MEDIO OF THEM SAID TO HIS PATER PATER! GIVE ME THE PARS OF SUBSTANTIA THAT FALLETH TO ME AND HE MADE DIVIS. UNTO THEM OF HIS PROPRIUS FACULTAS. AND NOT MULTUS DIES AFTER, THE JUNIOR FILUSE MADE OMAIS SUBSTANTIA COLLECTUS, AND BECAME PEREGRE PROFECTUS INTO A REGIO LONGINQUUS.

اس کا ہندی ترجمہ محض اس لئے آسان ہے کہ یہ کوئی علمی مضمون نہیں تھا ورنہ یقیناً سمجھ سے باہر ہو جاتا۔ ملاحظہ ہو۔

کسی منش کے دو پتر تھے۔ ان میں سب سے چھوٹے نے اپنے پتا سے کہا، سمپت کا وہ بھاگ جو نمتہ مجھے ملنا چاہئے۔ مجھے گن کر دیجئے۔ اور اس نے اپنی سمپت کو ان میں وبھاجت کر دیا۔ تھوڑی ہی اوستھا میں، پتر نے سب کچھ اکٹھا کر لیا۔ اور پردیش کی یاترا کی۔ وہاں اس نے اپنی سارا سمپت بلاستا کے جیون میں نشٹ کر دی۔

ٹھیٹ اردو میں اس کا ترجمہ یہ ہوگا:—
ایک شخص کے دو جگر گوشے تھے۔ پسر خورد نے اپنے پدر بزرگوار سے درخواست کی کہ حصہ ما تقسیم فرما دیجئے۔ والد نے دولت مذکورہ کو توزیع کر دیا۔ زمانہ کثیر نہ گذرا تھا کہ پسر مذکور نے تمام تولیش کو جمع کر کے ملک بعید کا قصد کیا۔ وہاں عیاشی میں کل دولت برباد کر دی۔

اسی سلسلہ میں اردو ہندی کا ایک ایک شعر بھی سن لیجئے:—
ایک شاعر کہتا ہے۔

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا چہ دیں

دوسرا فرماتا ہے:—

جو لگی ہوت پراپی مسک میں برہ کی تپسائی
دو دن میں آنسو بہ کر وہ آگ برسنے آئی

اگرچہ اس قسم کی زبان لکھنے والے اب بھی موجود ہیں۔ لیکن خوشی کا مقام ہے کہ ایسی زبان عام طور پر اچھی نہیں سمجھی جاتی۔ بنارسی پنڈت اور حیدر آباد دکن کے اہل قلم بھی اپنی روش بدل رہے ہیں لیکن باوجود ان سب باتوں کے نہ ہندی لکھنے والے اردو انشا پردازوں سے واقف ہیں اور نہ اردو جاننے والے ہندی لکھنے والوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ عام لوگوں کا تو ذکر ہی نہیں میں یہ پوچھتا ہوں کہ خاص لوگوں میں کتنے اصحاب ملیں گے جو اردو اور ہندی کے انشا پردازوں سے یکساں دلچسپی لیتے ہوں۔ اگر وہ تلسی داس، ملک محمد اور سور سے واقف ہیں تو ولی، میر اور سودا کو نہیں جانتے۔ اور اگر حسرت، اقبال، ابوالکلام اور صدیقی کا نام جانتے ہیں تو پریم چند کو اس لئے بھول گئے ہیں کہ انھوں نے اردو لکھنا کو چھوڑ دیا تھا۔ اور سمترا نندن پنت، شکل، سدرشن، ورما اور بچن، کا شاید نام بھی نہ سنا ہو حتیٰ کہ ایک ہی شہر میں رہنے والے ایک دوسرے سے ناآشنا ہیں۔ چنانچہ میرا ذاتی واقعہ یہ ہے کہ چند مہینے ہوئے جبکہ ہندوستان کی مشہور شاعرہ میلا دیا یعنی الہ آباد کی شاعرہ شریمتی مہادیوی ورما شانتی نکیتن تشریف لے گئی تھیں، اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ایک شہر میں رہنے کے باوجود مجھے ان کا علم نہ تھا۔ وہیں مجھے معلوم ہوا کہ یہ ہندی زبان کی چوٹی کی شاعرہ ہیں اور صرف حفظ کے پردے کی وجہ سے نظر سے اوجھل تھیں۔

ہندی اور اُردو دونوں زبانیں اب علحدہ کی گئی ہیں لیکن پہلے یہ دونوں زبانیں ایک ہی تھیں۔ اس علحدگی کی وجہ دو خطوں کا استعمال ہے۔ جس کی وجہ سے عام فہم الفاظ کی بجائے نامانوس اور مشکل الفاظ رائج ہو گئے ہیں۔ اور چونکہ دونوں کو اس کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ ایسے الفاظ استعمال کریں جو سادہ ہوں لہذا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود ہندی یا اُردو کے آسان الفاظ چھوڑ کر اپنا علم یا کم علمی اس طرح دکھائی جاتی ہے کہ ٹھوس کے لئے جامد۔ سخت کے لئے شدید۔ بھاری کے لئے ثقیل اور پانی کے لئے جل۔ نوٹس کے لئے سوچنا۔ کپڑے لئے وستر۔ اور اسی طرح کے الفاظ استعمال ہونے لگے ہیں۔ اگر تحریر یا لکھائی کا یہ پردہ اُٹھا دیا جائے تو یقیناً کم دونوں میں یہ اختلاف مٹ جائے گا۔ اور ہم ہندستان کے لئے ایک ملکی زبان پیش کر سکیں گے۔ چونکہ اس نظریہ THEORY سے کسی کو اختلاف نہیں ہے نہ ہو سکتا ہے۔ لہذا اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے۔ کہ :۔

کس قسم خط کو اختیار کیا جائے؟

پوشک بھاشا یا امدادی (معاون) زبان

جب ہم فلسفہ مذہب تاریخ اور ادبیات کے لئے علمی الفاظ کا استعمال کرنا چاہتے ہیں، تو یہ مشکل ہوتی ہے کہ عام بول چال میں وہ الفاظ یا اصطلاحیں نہیں ملتیں۔ مجبوراً کسی دوسری زبان سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو لوگ سنسکرت جانتے ہیں وہ سنسکرت سے مدد لیتے ہیں۔ جو لوگ عربی جانتے وہ عربی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ہماری علمی زبان دورنگی ہو جاتی ہے۔ لہذا اگر رومن خط اختیار بھی کر لیا جائے تو اس پردہ کو کیسے اُٹھایا جائے گا۔

لیکن اس سے پہلے کہ ہم پوشک بھاشا یا امدادی زبان کی تلاش کریں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کن کن علوم و فنون کے لئے ہمیں نئی اصطلاحیں بنانے کی ضرورت ہے :۔

علوم کی تقسیم

موجودہ تحقیقات کے لحاظ سے ہم سب علموں اور فنون کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک عملی PRACTICAL دوسرے نظری THEORITECAL

۱۔ عملی شاخ میں ہر قسم کی سائنسیں داخل ہیں مثلاً فزکس، کیمسٹری، ریاضی، بوٹانی، جانوریات، ہوابازی، کھیتی اور ان سے جو صنعتیں پیدا ہوتی ہیں مثلاً مشین سازی، انجینئری، شکر سازی، کاغذ سازی وغیرہ حتیٰ کہ اکنامکس کا وہ پہلو جو ہماری عملی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور تجارت، مہاجنی اور صرافہ سے تعلق رکھتا ہے وہ بھی اسی شاخ میں شامل ہے۔ اور موسیقی، مصوری وغیرہ بھی اسی میں داخل ہیں۔

۲۔ نظری شاخ میں مذہب، فلسفہ، تاریخ، اور ادبیات کا شمار ہو سکتا ہے۔

میں یہ عرض کروں گا کہ دنیا کے کاروبار کے لئے اور ہماری روزمرہ زندگی کے لئے زیادہ تر عملی علوم کی ضرورت ہوتی ہے ان میں سے اکثر چیزیں اپنی متعلق اصطلاحیں رکھتی ہیں۔ جن کے لئے ہمیں نئی اصطلاحیں بنانے کی ضرورت نہیں۔ کسان، راج، بڑھئی، کمہار، لوہار، باغبان سب کی ایک زبان ہے۔ انجینیری، دستکاری، مشین سازی کے متعلق آپ ان کی اصطلاحیں بنائیے لیکن جو اس فن کے ماہر کہیں گے وہی آپ کو ماننا پڑے گا۔ ابتدا میں موٹر کو موٹر گاڑی اور بائسکل کو پیر گاڑی کہتے تھے لیکن پھر یہ اصطلاحیں منسوخ ہو گئیں کلچ، کاربریٹر، ڈائنامو، بیٹری، ہوا، وہیل، ٹیوب، ٹائر، سپوک، رینچ، بولٹ وغیرہ کے لئے الفاظ مل سکتے ہیں۔ مگر بازار کا آدمی ان لوگوں کی پروا نہیں کرتا جو فلسفہ کی عینک سے عملی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں۔ اسی طرح وہ سائنٹفک [illegible] اصطلاحیں گھڑنا بھی پسند نہیں کرتا جیسے وہ ان نئی نئی بین الاقوامی (INTERNATIONAL) اصطلاحوں اور [illegible] سے واسطہ پڑتا ہے جو ہماری زبان میں پانچ سال کے بعد ترجمہ ہو کر چھاپی جاتی ہیں حالانکہ اس درمیان میں اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ خود وہ نظریہ (THEORY) بدل جاتا ہے اور ہماری ترجمہ کی ہوئی کتاب سانپ کے منہ کی چھچھوندر ہو کر رہ جاتی ہے۔ لہٰذا سائنس یا عملی علوم کے لئے ہمیں بین الاقوامی یا (INTERNATIONAL) اصطلاحیں استعمال کرنا چاہیے۔ اور ان کے لئے رومن خط نہایت موزوں ہے۔

ہمیں وہی کرنا چاہیے جس میں آسانی ہو۔ علم کی ترقی ہو اور اختلاف کم ہو۔ عربوں نے جب یونانی سے عربی میں ترجمے کئے تو سیکڑوں لفظ بجنسہ عربی میں داخل کر لئے۔ مثلاً جغرافیہ (GEOGRAPHY) تلغراف (TELEGRAPH) غاز (GAS) سیجارہ (CIGAR) اس کی جدید مثالیں ہیں۔ حتیٰ کہ ناموں تک پر عربی زبان قبضہ کر لیتی ہے مثلاً (EUCLID) سے اقلیدس (MONTAGUE) سے منتاقو وغیرہ۔ اسی طرح سائنس کے لئے ہمیں بین الاقوامی اصطلاحیں لے لینا چاہئے۔ ترجمہ نہ کرنا چاہئے۔ اس طرح ہمارا آدھے سے زیادہ لٹریچر (یعنی SCIENCE) زندہ قوموں کے دوش بدوش چلنے کا رہ گیا مذہب و فلسفہ اس کے لئے خط بدلنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ تاریخ اور سیاسیات کے لفظ کو روزمرہ کی بول چال یعنی بنیادی ہندستانی میں لکھنا چاہئے۔

اور جتنے الفاظ عربی یا سنسکرت کے ہندستانی میں آگئے ہیں اور ہندستانی بن گئے ہیں ان کے علاوہ نئے لفظ ہرگز نہ داخل کرنا چاہئے۔ البتہ اگر سخت ضرورت ہو تو فارسی زبان سے لے لینا چاہئے۔ اس لئے کہ فارسی ایک زندہ زبان ہے اور سنسکرت کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

کس تمدن (کلچر) کو نمونہ بنانا چاہئے

آخر میں صرف ایک سوال رہ جاتا ہے۔ کہ کس تمدن کو نمونہ بنایا جائے۔ میرا مختصر جواب یہ ہے کہ لکھنؤ کے تمدن کو۔

یہی وہ شہر ہے جہاں ہندو مسلم تمدن مل کر معراج کمال کو پہنچا تھا۔ اور اب بھی اس شہر کی وضع قطع، تراش خراش،

بات چیت روزمرہ اور محاورہ ہندستان کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ کیسرباغ کا بسنتی رنگ آج بھی نوروز اور بسنت کی یاد دلاتا ہے۔ امام باڑوں میں ہندو مسلم تعداد یکساں نظر آتی ہے۔ میلے ٹھیلوں میں بھی اسی شہر میں چشم بددور کامل اتحاد کی شان نظر آتی ہے۔ اگر لکھنؤ کی عمارات کے ناموں مثلاً فرنگی محل، موتی محل، کیسرباغ، مچھی بھون، چھتر منزل، امام باڑہ وغیرہ پر غور کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ ہندی اُردو کس طرح لکھنؤ میں مل کر ہندستانی بن گئی۔

رومن خط کی خوبیاں

اب دیکھنا ہے کہ رومن خط میں کیا کیا خوبیاں ہیں

۱۔ اوّل تو اس کے حروف بہت سادہ ہیں اور ہر آواز کے لئے الگ الگ مقرر کئے جا سکتے ہیں اور آسانی سے پڑھے جا سکتے ہیں۔

۲۔ سائنٹفک اصطلاحوں کے لئے ہمیں بین الاقوامی خط (INTERNATIONAL SCRIPT) کی ضرورت ہے اور وہ رومن خط ہے

۳۔ اس کے سیکھنے میں بہت آسانی ہے اور ہندستان کا ہر ایک پڑھا لکھا آدمی اسے جانتا ہے۔

۴۔ ترکی اور ایران کے علاوہ جزائر جاوا اور ملایا کے تقریباً آٹھ کروڑ باشندے (جو زیادہ تر مسلمان ہیں) ۱۵ سال سے رومن خط استعمال کر رہے ہیں۔

۵۔ ٹائپ رائٹر مشینوں کے علاوہ سب سے بڑی آسانی یہ ہے کہ ہر جگہ اس ٹائپ میں اچھا خوبصورت اور سستا چھپائی کا کام ہو سکتا ہے۔

کس قسم کا ہونا چاہیئے

یہ مان لینے کے بعد کہ رومن خط ضروری ہے۔ اب ہمیں حروف کی آوازوں کو متعین کرنا ہے۔ اس کے لئے میری تجویز یہ ہے کہ یہ کام صرف ایک آدمی کو نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کے لئے ہندستانی اکیڈیمی، انجمن ترقی اُردو، جامعہ ملیہ، ناگری پرچارنی سبھا اور کاشی ودیا پیٹھ کے ماہرین کی ایک جماعت کا تقرر ہونا چاہئے۔ جو مشترک ہندستانی زبان کے لئے رومن حروف کی آوازوں کو مقرر کریں۔ اس کے لئے مندرجہ ذیل چند اصول کارآمد ہو سکتے ہیں۔

۱۔ چونکہ رومن تحریر سے ہمارا منشا اُردو اور ہندی کو قریب تر لانے کا ہے لہذا جہاں تک ممکن ہو مخلوط حروف کو چھوڑ دیا جائے اور ایک حرف کے لئے ایک ہی آواز مقرر کی جائے۔ جو الفبائی اصول پر ہو

۲۔ سوائے سخت ضرورت کے کوئی نیا حرف نہ بنایا جائے۔ تاکہ دنیا کے جس پریس میں چاہیں، یا جس مشین پر ٹائپ کرنا چاہیں آسانی سے ممکن ہو۔

۳۔ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ہم صرف چھاپنے ہی کے لئے نئے حروف نہ بنائیں گے۔ بلکہ چھاپنے سے

پہلے انھیں لکھنے کی بھی ضرورت ہوگی۔ لہذا جہانتک ممکن ہو نیا حرف نہ ایجاد کریں۔

۴۔ صرف اُن آوازوں کے لئے حروف بنائے جائیں جو ہندستانی زبان میں رائج ہیں۔ اس لئے کہ جو آوازیں ہماری زبان میں نہیں ہیں اُن کے لئے نئے حروف کا ایجاد کرنا اپنی قابلیت کا تو ضرور ثبوت ہوگا لیکن ملک کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اس لئے عربی کے حروف ص اور س کے لیے صرف S کافی ہے اور ذ۔ ز اور ظ کے لئے Z کافی ہے۔ سنسکرت ژان کے لئے N کافی ہے اور کشتری کے کشا کے لئے صرف چھ ہوسکتا ہے۔ ترکوں نے ث اور ص کے لئے S، ق کے لئے K ض ظ ز کے لئے Z د اور ت کے لئے T اور ط کے لئے ṭ ح خ کے لئے H رکھا ہے (دیکھو ترکی گرامر مطبوعہ ۱۹۳۲ء ترکیہ) ہندستان میں آل انڈیا رومن سکرپٹ کی تجویز بھی ملک کے سامنے ہے جس کا منشا یہ ہے کہ انڈو جرمن، سامی اور دراوڑ کی جتنی زبانیں ہندستان میں رائج ہیں سب کے لئے ایک رومن خط (سکرپٹ) بنایا جائے۔ ان میں سے ایک تجویز ڈاکٹر اس۔ کے چٹرجی ایم۔ اے۔ ڈی۔ لٹ۔ پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی کی ہے۔ جس میں انھوں نے چند اُلٹے حروف بڑھائے ہیں۔ مثلاً Y .F.R.H.J.K.W.Y کو اُلٹا لکھا جائے۔ اور ز کے لئے 3 اور ث کے لئے θ کا اضافہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ DURSTZ ترچھے یا ITALICS بھی ایجاد کئے ہیں۔ چھاپنے میں تو اُن حروف کا استعمال ممکن ہے لیکن ٹائپ کرنے یا لکھنے میں دشوار ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔ "دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں"

دوسری تجویز مسٹر اے۔ لطیفی۔ سی آئی ای۔ آئی سی اس۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی بیرسٹر ایٹ۔ لا کی ہے۔ انھوں نے اس کا نام لطیفی الفابٹ رکھا ہے۔ اور یہ تجویز ہز ہائی نس مہاراجہ بڑودہ کے حکم سے افسران ریاست کے سامنے رائے طلب کرنے کے لئے بھیجی گئی ہے۔ اس میں بھی بہت سے نئے حروف بنائے گئے ہیں اور نقطوں اور ماتروں سے کام لیا گیا ہے۔ آ، اَ (a) کے لئے اُلٹا J اور ہ ہے۔ غ کے لئے اُلٹا K ہے ژ کے لئے اُلٹا F (ɟ) ہے خ کے لئے x اور ن تک کی گنتی بھی ابجد میں شامل کر لی گئی ہے۔ مثلاً سیر شاہ لکھنا ہو تو 5er, 5ah چکھ 4a2 شہ 56 وغیرہ۔ ان حروف کے لکھنے اور پڑھنے دونوں میں دقت ہے۔ حروف کے اندر اعداد NUMERALS کے داخل کر دینے اور بہت سے نئے قسم کے حروف بنا لینے کی وجہ سے لطیفی الفابٹ بالکل نئی الفابٹ معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ لوگ جو رومن خط سے واقف ہیں ان کے لئے بیکار ہے اس کے علاوہ یہ خط عام پیسوں میں نہیں چھپ سکتا لہذا ہماری تجویز سے اسے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اگر اس معیار کو ہم سامنے رکھیں کہ جس طرح لوگ بولتے ہیں اُسی طرح ہم لکھیں تو بہت آسانی سے رومن حروف میں ہم ہندستانی زبان کو منتقل کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ معیار وہی ہونا چاہئے جو لکھنؤ والوں کے نزدیک درست ہو۔ اس لئے کہ بنگالی زے کو جیم اور س کو ش۔ زیر کو پیش بولنے کا عادی ہے۔ پنجابی عموماً قاف کو کاف کہتا ہے اور عرب ف کہتا ہے۔ دکن میں خدا کو قدا اور قسم کو خسم کہتے ہیں۔ ایرانی کتاب کو چتاب۔ کنار کو چنار احمق کو احمغ اور آقا کو آغا کہتا ہے۔ لہذا ہندستانی زبان کے لئے صرف ہندستان (یعنی یوپی) اور وہ بھی لکھنؤ کی زبان کو معیار بنا کر اس سے رومن خط بنانا چاہئے

رومن خط کو کس طرح رائج کرنا چاہئے

میں اپنا مضمون اُن تجاویز پر ختم کرتا ہوں جو رومن خط کے جاری کرنے کے لئے میرے ذہن میں ہیں۔

۱۔ عدالتی اور سرکاری کاغذات سب رومن خط میں کردئے جائیں اور استغاثے اور نالشیں اسی خط میں داخل کی جائیں۔

۲۔ چند اخبارات و رسالے اس میں جاری کئے جائیں اور کچھ عام پسند کتابیں ابتدا میں شائع کی جائیں۔ اس کا تھوڑے ہی دنوں میں نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندی اردو کے اخبار جب اپنا تجارتی فائدہ دیکھیں گے تو فوراً یہی خط اختیار کرلیں گے۔

۳۔ کالجوں اور اسکولوں میں بجائے ہندی اردو کے رومن سکرپٹ میں کتابیں رائج کی جائیں۔ اور یونیورسٹیوں میں زبانوں کے پرچوں میں ایک پرچہ رومن خط اور ہندستانی زبان کا ضرور ہو۔

۴۔ کوشش کی جائے کہ سینما والے اپنے اشتہارات اور ہیڈنگ رومن خط میں جاری کریں۔ اس سے عام طور پر یہ خط مقبول ہوجائے گا۔

۵۔ ایک خط بنیادی ہندستانی گرامر اور ایک لغت اسی خط میں شائع کی جائے۔ اب میں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ میری تجاویز کو پسند فرمائیں گے اس لئے کہ متحدہ قومیت بغیر ایک زبان اور ایک خط کے ناممکن ہے۔

راشٹر بھاشا کا سوال

از :——— رگھبیر سرن دواکر

——— (۱) ———

ہم ہندوستانی غلام ہیں لیکن یقینی طور پر ہم آزادی کی طرف بڑھ رہے ہیں اور آزادی کی اس راہ میں ہمیں قدم قدم پر نئی نئی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ملک کے آزاد ہونے پر آزادی کو محفوظ رکھنے کے لئے اور ساتھ ہی ملک کے نظام کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوگی اُن کے بارہ میں ابھی سے ہی نئے نئے سوالوں کا پیدا ہونا اور اُن کے حل کرنے کی پوری پوری کوشش کرنا قدرتی طور پر ہمارے لئے ضروری ہے۔ راشٹر بھاشا کا سوال ایسا ہی ایک سوال ہے جو اپنی تمام پیچیدگیوں اور مشکلوں کے ساتھ ہمارے سامنے آچکا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ یہ خیال رکھتے ہوئے۔ اسے حل کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں کہ جہاں اسکے متعلق اتفاق رائے نہیں ہے وہاں یہ اس قومی اتحاد میں ذرا بھی رکاوٹ نہ ڈالنے پائے جو آزادی کی جدوجہد کے لئے ایک بیش بہا چیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی طرح بھی اپنے نصب العین مکمل آزادی کو نہ بھلا کر اس بینی کو پوری اہمیت کے ساتھ سمجھانا ہمارا فرض ہے۔

—— (۲) ——

کسی راشٹر کی راشٹر بھاشا یا قومی زبان وہ زبان ہے جو اُس ملک میں سبھی جگہ عام فہم ہو جو مختلف مقامی و صوبجاتی زبان والوں کے درمیان تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہو۔ جس میں سرکاری احکام و اعلان شائع ہوں

جو عدالتوں اور کچہریوں میں رائج ہو۔ جو اخبار سنیما اور ریڈیو کی دنیا میں مروّج ہو۔ جس کا لٹریچر راشٹر یا قوم کے ماضی اور حال کی زندہ تصویر ہو جس کی خوبی مستقبل کو شاندار بنانے میں سہارا دے اور جس کا تعلق چند تعلیم یافتہ لوگوں سے نہیں بلکہ غیر تعلیم یافتہ عوام سے بھی ہو۔ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کسی بھی راشٹر کے لئے ایسی راشٹر بھاشا کا ہونا اتنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر کوئی ملک ایک ملک (راشٹر) ہی نہیں رہتا۔

——(۳)——

ہمارے ملک میں ایسی راشٹر بھاشا کیا ہو کیسی ہو اس مسئلہ میں کافی اختلاف رائے ہے اور اس اختلاف رائے نے باہمی نفاق کی صورت بھی اختیار کر لی ہے۔ یوں کچھ ضرورت سے زیادہ سمجھدار لوگ بنگلہ۔ سنسکرت۔ فارسی یا انگریزی کی حمایت کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں لیکن اُن کی اِس نازک خیالی پر ہماری یہ خاموشی ہی بہترین جواب ہے۔ لیکن یہاں ہمیں صرف ہندی[1] اُردو اور ہندوستانی پر بھی کچھ غور کرنا ہے جن کی آج بڑے پیمانے پر اور ساتھ ہی متحدہ طور پر تائید اور حمائت کی جا رہی ہے۔

ہندی والے راشٹر بھاشا کی گدی کے لئے ہندی زبان دے رہے ہیں اور اُردو والوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اُردو ہی جو سیکڑوں سال تک ہندوستان کے ایک بڑے حصے کی زبان رہی ہے اور شاہی درباروں اور کچہریوں میں صدیوں تک جس کا بول بالا رہا ہے راشٹر بھاشا بننے کے قابل ہے۔ ہندوستانی والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ہندی اُردو کے میل سے یعنی دونوں زبانوں سے آسان و عام فہم الفاظ لیکر راشٹر بھاشا بنائی جائے۔

——(۴)——

ہندو مسلم کے جھگڑوں نے فرقہ وارانہ فساد کی شکل اختیار کر کے راشٹر بھاشا کے سوال کو بہت پیچیدہ بنا دیا ہے ہندو ہندو ہونے کی ہی وجہ سے ہندی کو اور مسلمان صرف مسلمان ہونے کے باعث اُردو کو ہی اپنی مادری اور قومی زبان کہتا ہے۔ جو ہندو ہندی سے بے بہرہ ہے اور جو مسلمان اُردو سے ناواقف ہیں وہ بھی اس دلدل میں پھنس گئے ہیں اور یہ ہندی اُردو کا سوال بلاوجہ ہندو مسلم بن گیا ہے۔ حالت یہاں تک خراب ہو گئی ہے کہ دو ہم وطن اور پڑوسی زبانوں میں خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنی ہی مختلف ہوں جو رشتۂ محبت ہونا چاہئے اُردو جیسی ملتی جلتی زبانوں میں بھی وہ رشتہ نہیں رہا ہے۔ کتنی افسوسناک بات ہے کہ ایک ہندوستانی شیکسپیر ملٹن ٹینیسن کی تصانیف کو پڑھ کر انگریزی کی طرف متاثر ہو۔ لیکن اکبر۔ غالب۔ میر۔ حالی۔ سودا۔ اور اقبال جنھوں نے اِس سرزمین پر آنکھیں کھولیں۔ اپنا اپنا کمال دکھا کر یہیں کی مٹی میں مل گئے اُن پر ہمیں کچھ بھی فخر نہ ہو۔ یہ بھی باعث شرم نہیں تو کیا ہے کہ ایک ہندوستانی فرانس۔ اٹلی۔ انگلینڈ اور امریکہ کے لٹریچر کو پڑھ پڑھ کر جھومے اور سُور داس تلسی داس ودیاپتی۔ سکھان دیو بہاری۔

[1] اِس مضمون میں ہندی سے ہمارا منشا سنسکرت پراکرت کے مشکل و غیر عام فہم الفاظ سے بھری ہوئی دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی اور اُردو سے ہمارا مقصد فارسی کے ثقیل و دبیز الفاظ سے لبریز فارسی رسم الخط میں لکھی جانیوالی زبان سے ہے —— دواکر

رابندر ناتھ ٹیگور، شرت چندر چٹرجی، پریم چند، شرت چندر جیسے باہنر باکمال اشخاص کے لٹریچر کو پڑھ کر خوشی سے مست نہ ہو۔ ایسے ایسے ہندو مسلمان آج کتنے ہیں جو ملک کی سبھی زبانیں تو دور محض ہندی اُردو کے لٹریچر کو ہی اپنی چیز سمجھتے ہوں۔ دنیا کے سبھی بلند پایہ شاعروں۔ مصنفوں کی تعظیم کرنا اور اُن کی دی ہوئی چیزوں سے فائدہ اُٹھانا ہر انسان کا فرض ہے لیکن اس فرض کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دنیا بھر کی سیر کی جائے اور گھر کے پاس ہی پڑوس میں کیسے کیسے عجیب و غریب جواہرات بکھرے پڑے ہیں اس پر نظر بھی نہ ڈالی جائے۔

دراصل ہندی اُردو کو ہندو مسلمان میں تقسیم کرنا محض ایک خام خیالی ہے کیونکہ زبان کے نقطۂ نظر سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک زبردست اتحاد ہے۔ الگ الگ صوبوں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک اور صرف ایک ہی زبان ہے دونوں ہی پنجاب میں پنجابی۔ سندھ میں سندھی۔ گجرات میں گجراتی۔ بنگال میں بنگلہ اڑیسہ میں اڑیا۔ اور کرناٹک میں کنڑ بولتے ہیں۔ یہ تو صرف بڑے بڑے شہروں میں ہم چند تعلیم یافتہ ہندوؤں کو ہندی اور مسلمانوں کو اردو بولتے دیکھتے ہیں لیکن شہروں میں ہی بہت حد تک اور گاؤں میں مکمل طور پر عوام کی یعنی عموماً تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کی محض ایک ہی زبان ہے۔ جن صوبوں کی زبان ہندی۔ اُردو ہے وہاں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی الگ الگ نہیں بلکہ ایک ہی زبان ہے خواہ وہ ہندی ہو یا اردو ہو یا گنگا جمنی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ہندی ہندوؤں کی ہی اور اُردو مسلمانوں کی ہی زبان نہیں ہے۔ یہ کوئی فلسفہ نہیں ہے جہاں ایمانداری کے ساتھ بھی اختلاف رائے ہو سکے بلکہ روزِ روشن کی طرح، یہ ایک حقیقت ہے جسے اپنی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے کہ ہندی اُردو کے معاملہ کو جو فرقہ وارانہ صورت دے دی گئی ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے سفید جھوٹ ہے اور محض ایک پروپیگنڈا ہے۔

———(۵)———

ایک دن اِس ملک کی راشٹر بھاشا سنسکرت تھی۔ لیکن زمانہ کی لہر نے جب عوام کی زبانوں کو قدرتی طور پر آگے بڑھایا اور اُنھوں نے اُصولوں اور قاعدوں کا بہت سا غیر ضروری بوجھ اُتار کر آسان و زیادہ عام فہم بننا شروع کیا تب سنسکرت اُس سے بہت پیچھے رہ گئی اور عوام کے لئے وہ راشٹر بھاشا کے کام کی چیز نہ رہی مہاویر بدھ وغیرہ نے سنسکرت چھوڑ کر ماگدھی کے اشتراک سے ایک نئی راشٹر بھاشا بنانے کی کوشش کی جو اردھ ماگدھی (अर्द्ध-मागधी) کہلائی۔ لیکن عوام کی مختلف زبانیں اور بھی زیادہ آگے بڑھتی گئیں اور کچھ عرصہ کے اردھ ماگدھی بھی بیکار ہو گئی۔ پھر اس طرح کے کئی اُلٹ پھیر ہوئے اور زبانوں نے رفتہ رفتہ کئی پلٹے کھائے۔ فارس و افغانستان سے مسلمانوں کے آنے سے زبان کے معاملہ میں انقلاب ہوا۔ مسلمان بادشاہوں نے فارسی کو درباری زبان بنایا۔ اور سلطنت مغلیہ کے آخری زمانہ تک وہ دربار کی زبان ہی بنی رہی۔ اُدھر اردھ ماگدھی سے پراکرت اور پراکرت سے ہندی کا روپ اختیار کر کے عوام میں راشٹر بھاشا کی شکل میں ہندی کا پرچار ہو گیا تھا اور شمالی و وسط ہند میں تو روزمرہ کی بول چال کی زبان بھی یہی تھی۔ ایک زندہ اور ترقی پذیر زبان کی حیثیت سے اُس نے فارسی کے بہت سے

لفظوں کو اپنے میں شامل کر لیا تھا۔ شہروں اور قصبوں میں جہاں درباروں اور عدالتوں کی زبان فارسی تھی ان فارسی کے لفظوں کا زیادہ چلن ہوا بلکہ عدالتوں کے چاروں طرف تو ہندی نے فارسی کے الفاظ لے کر ایک فارسی نما شکل ہی اختیار کر لی جو ریختہ کے نام سے پکاری گئی۔ لیکن اس سے عوام کی ہندی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ ہندی دراصل ہندی ہی بنی رہی۔ اردو کے معنی لشکر جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مغلیہ زمانہ میں سبھی صوبوں ریاستوں اور قوموں سے بھری ہوئی فوج یا لشکر میں الگ الگ زبان بولنے والوں کے درمیان ہندی بولی جانے لگی اور قدرتی طور پر وہاں فارسی سے اس کا زیادہ تعلق ہوا تو اس کا نام اردو پڑا اور ہندی اردو دونوں ہی ناموں سے اُسے پکارا جانے لگا کہیں کہیں اس کا نام بھاشا رہا اور کہیں کہیں ہندوی کے نام سے بھی اسے پکارا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر تک رسم الخط کے علاوہ دیگر تمام باتوں میں اردو کا مطلب ہندی ہی تھا دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا ہندی کا مطلب ہند کی زبان ہے اور اسی معنی میں سب ہندو اور مسلمان اسے تسلیم کرتے رہے اور بہت سے ہندو مسلمان، سنتوں، صوفیوں اور شاعروں نے اسی زبان میں ہی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہندی اردو کے درمیان ایک تفرقہ پیدا ہونے لگا غدر سے حب وطن یا راشٹریتا کا جذبہ سارے ملک میں پھیل چکا تھا لیکن جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ کوشش و کشمکش کے باوجود بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا اور انھیں شکست ہی ہوئی تو فاتح سامراجیوں نے ہندوؤں میں پھوٹ ڈال کر حکومت کرنے کی پالیسی اختیار کی اور منظم و متحد طریقہ سے اسے عمل میں لانا شروع کیا تب حب وطن یا راشٹریتا کے جذبہ نے ایک طرف ہندو راشٹریتا یا ہندو نیشنلزم (Hindu Nationalism) اور دوسری طرح مسلم نیشنلزم (Muslim Nationalism) کی صورت اختیار کرنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بات بات کو لیکر ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑے ہونے لگے۔ زبان کے معاملہ میں بھی یہی ہوا۔ ہندی یا اردو اس وقت اپنی مکمل یا پختہ حالت میں نہ تھی بلکہ رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی ان میں ایک نے اس کو ایک طرف اور دوسرے نے دوسری طرف کھینچنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کی۔ رسم الخط کی علیحدگی ہندو مسلمان کے مذہبی تفرقہ نے اس مسئلہ کو فرقہ وارانہ صورت اختیار کرانے میں اور بھی مدد دی۔

(۹)

ہندی اردو دونوں زبانوں کا ہی بزبانِ حال یہ بیان ہے کہ دونوں کی بنیاد ایک ہے اور تواریخ بھی اس کی گواہی دیتی ہے کہ دونوں دراصل ایک ہی زبان ہیں جو ہندوستان میں ہی پیدا ہوئی اور پھلی پھولی۔ لیکن فرقہ وارانہ جذبات نے اسے ہندو مسلم مسئلہ بنا کر آج دو زبانوں کی شکل دے دی ہے اور دونوں کو ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا کر دیا ہے۔ ہم اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ پچاسوں سال سے آج ہندی اور اردو دو الگ الگ زبانوں کے طور پر نشو و نما پا رہی ہیں۔ ہندی سنسکرت کے زیر سایہ آگے بڑھ رہی ہے اور اردو فارسی کے زیر اثر ترقی کر رہی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ سنسکرت اور فارسی دو مختلف زبانیں ہیں جن کی جائے پیدائش جدا جدا ہے جن کی [illegible] گرامر ہی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہے بلکہ ہر چیز مختلف طور پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی اردو کا معاملہ [illegible]

طرح طرح کی مشکلات کا سبب بن گیا ہے۔

راشٹر بھاشا بننے کے لئے یہ پہلی شرط ہے کہ زبان آسان اور عام فہم ہو۔ تاکہ اُس کی پہنچ بہ آسانی عوام تک ہو سکے۔ لیکن ہندی اور اُردو کو جو شکلیں دی جا رہی ہیں وہ انھیں عوام سے دور ہی لے جا رہی ہیں۔ شاید دونوں نے یہ حقیقت نظر انداز کر دی کہ زبان کی خوبی اس میں نہیں ہے کہ کم سے کم لوگ اُسے سمجھیں بلکہ اس میں ہے کہ ہر خاص و عام اُسے سمجھ سکے۔ اُس میں عوام کے سُکھ دُکھ کی سچی کہانی ہو۔ وہ عوام کی خواہشوں اور اُمیدوں کا عکس ہو وہ عوام کے حقوق کی محافظ ہو اس کا حسن کچھ مخصوص شخصوں کی واہ واہ میں نہ ہو کر رہ جائے۔ کہ عوام کی دل بستگی میں ہو اس کی پاکیزگی دیگر زبانوں سے اجنبی ہونے میں نہیں بلکہ اس بات میں ہے کہ وہ عوام کی گندگی و تاریکی سے اُن کو نکالے رہی ہیں۔ زبان کو بلا ضرورت فرقہ وارانہ جذبات کے جوش میں غیر قدرتی طور پر مشکل بنانا اور پھر یہ چاہنا کہ وہ زبان سارے ملک کی زبان بنے یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ ہندی والے اگر دل سے یہ چاہتے ہیں کہ ہندی راشٹر بھاشا بنے تو انھیں بخوشی یا مجبوراً یہ ماننا پڑیگا کہ ہندی کو ایسی شکل دی جائے جو ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سبھی صوبوں میں رائج ہو سکے۔ اُردو والوں کو بھی اسی طرح کی ہدایت دی ہوگی اور جہاں ہندی اُردو والوں نے اس سیدھی سادی سچائی کو سمجھ لیا تو وہ دیکھیں گے کہ ہندی کو یا اُردو کو راشٹر بھاشا بنانے کا یہی ایک راستہ ہے کہ دونوں مل کر اور مراٹھی گجراتی بنگالی وغیرہ ہی نہیں کچھ حد تک انگریزی کی بھی۔ ملکر ایک عام فہم ہندوستانی زبان بنائیں۔ اُس وقت یہ ہندی اُردو کا مسئلہ فرقہ وارانہ مسئلہ نہ رہے گا اور نہ دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑی رہیں گی۔ بلکہ ساتھ ساتھ رہ کر ملک کی قومی زندگی میں انقلاب لے آئیں گی۔

ہندوستانی کی تائید سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندی ہندی نہ رہے اور اُردو اُردو نہ رہے۔ یہ ہم کہہ چکے ہیں کہ آج دونوں جو صورتیں اختیار کر چکی ہیں انھیں ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کریں گے تو نقصان اٹھائیں گے کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دونوں مختلف دو زبانوں کے زیر سایہ ایک عرصہ سے پل چکی ہیں اور دو زبانوں کی صورت پر قائم رہنے والی ہیں۔ ہمارا منشا تو یہی ہے کہ ہندی ہندی رہے اُردو اُردو رہے یعنی مقامی اور صوبجاتی حیثیت سے دونوں اپنی اپنی جگہ رہیں۔ لیکن ہندوستانی راشٹر بھاشا کے لئے متحد ہو کر اپنے فرض کی ادائیگی کریں۔ اس کے لئے ضرور دونوں کو ہی کچھ قربانی کرنی ہوگی۔ لیکن قوم کی بھلائی اسی میں ہے۔

ہندی اُردو والوں کو جو یہ خوف ہے کہ اگر ہندوستانی راشٹر بھاشا بنائی گئی تو ہندی اُردو کی اپنی اپنی خصوصیات مٹ جائینگی اور لٹریچر کا مزہ جاتا رہے گا۔ وہ بے بنیاد ہے۔ اپنے اپنے صوبوں میں دونوں کو جب خودمختاری مل جائیگی تب یہ خوف کیوں؟ اگر بالفرض ہندی اُردو کے اشتراک سے ایک ہندوستانی راشٹر بھاشا بن جانے پر ہندی اُردو صوبوں کی زبان بھی ہندوستانی کی صورت اختیار کرلے گی تو اس سے گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اگر دراصل ہندی اُردو کی بنیاد اتنی کمزور ہے تو زبردستی اُنھیں جمائے رکھنے میں کیا فائدہ ہے۔ زمانہ کی ضرورتوں کو جو پورا نہ کرسکے گا۔

(Survival of the fitter) کی کشمکش میں وہ نیست و نابود ہو جائیگا اور اُسے برباد ہو جانا بھی چاہیئے۔ لیکن اگر ہندی اُردو کو زندہ رہنا ہے تو ہمارے خیال میں یہ دونوں اپنے اپنے صوبوں کے عوام کی زبانیں ہونگی۔ ایک تو یوں ہی ہندی اُردو کی بنیاد ہندوستانی راشٹر بھاشا بننے سے جو ہندی اُردو کو عظمت نصیب ہوگی اُس کی قیمت اگر یہی چکانا پڑے کہ مقامی یا صوبجاتی زبانوں کی حیثیت سے ہندی اُردو الگ الگ دو زبانیں نہ رہیں تو اس میں بھی کوئی نقصان نہیں۔ دوسرے ہندی اور اُردو کی جگہ جب ہندوستانی لے لیگی تو وہ بھی ہندی اور اُردو کی ہی نسل سے ہوگی پھر اس میں حرج کیا ہے؟ رہا لٹریچر کی خوبصورتی کا سوال۔ تو ہر حالت میں وہ قائم رہنے والی چیز ہے۔ ہندی اُردو الگ الگ زبانوں کی شکل میں رہیں تب تو کوئی بات ہی نہیں ہے اور دونوں کے ملنے سے ایک کھچڑی بنی تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ آخر کھچڑی بُری چیز نہیں ہے۔ آج یہ لوگ جس طرح کے لٹریچر کا مزہ لیتے ہیں اور جسے پڑھ پڑھ کر جھومتے ہیں صرف اسی کو وہ خوبصورت اور لطیف مان بیٹھے ہیں اور اُن کا یہ یقین ہے کہ اس زبان میں کوئی تبدیلی کی گئی تو لٹریچر کا سب مزہ جاتا رہے گا۔ وہ یہ بھول گئے کہ جس طرح اُن کے بزرگوار کے ذائقہ سے اُن کا ذائقہ مختلف ہے جس طرح پُرانے لوگوں کی پسند و رجحان سے اپنی پسند و رُجحان دوسرے قسم کی ہے اسی طرح اُن کی آنے والی پیڑھیوں کا پسند ناپسند کرنے کا معیار (Standard) بھی الگ ہوگا۔ ہر لمحہ ہر شے میں تبدیلیاں ہونا قدرت کا ایک اٹل اصول ہے۔ آج ہندی والے جس ہندی کو اپنی بناری متھرا بنا بیٹھے ہیں اور اُردو والوں نے بھی اُردو کو لیکر الگ جوڑ پڑھ اینٹ کی مسجد بنالی ہے۔ رفتار زمانہ سے اور خصوصاً آج کے زمانہ میں جبکہ حد بندی مٹ رہی ہے اُس میں انقلاب ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ اپنی پسند کو ہی سارے ملک کی یا آنے والی نسل کی پسند مان لینا۔ حال کے ہی سانچے میں مستقبل کو ڈھالنے کی سعی کرنا۔ ایک بے سود کوشش ہے ایک بے معنی مقصد ہے۔

ہندی اُردو والوں سے ایک بات اور کہنی ہے۔ آج انھیں زبان کا مسئلہ ہی حل کرنے کے لئے زبان کا مسئلہ حل نہیں کرنا ہے بلکہ انھیں ایک گناہ کا تدارک (penance) بھی کرنا ہے۔ اُنھوں نے ہندی اُردو کے خالص زبان کے سوال کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا فرقہ وارانہ سوال بنانے کا گناہ کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آج ہندی کی جیت کو ہندوؤں کا ہندو دھرم اور ہندو کلچر کی جیت اور اردو کی فتح کو مسلمانوں کی اسلام کی اور مسلم کلچر کی فتح گمان کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ہندو دھرم اور اسلام سے اس مسئلہ کا کوئی تعلق نہیں ہے آج جبکہ اس میں ہندو دھرم اور اسلام کا تعرقہ مل گیا ہے یعنی الگ الگ ایک زبان کو لیکر فرقہ وارانہ جذبات پیدا کر دئے گئے ہیں تب یہ ضروری ہے کہ پہلے زبان کے سوال کو اس گندگی سے دور کیا جائے اور سب کو لفظوں سے ہی نہیں عمل سے یہ یقین دلا دیا جائے کہ دراصل زبان کا مسئلہ مذہب اور دھرم کے جھگڑوں سے بالکل غیر متعلق اور الگ تھلگ ہے۔ جب ایسی صورت حال پیدا ہو جائیگی تب زبان کی سائنس خود بخود اپنا کام کرلے گی اور آنے والی نسلیں بھی خاموش نہ بیٹھی رہیں گی۔ لیکن جب تک دلوں میں فرقہ وارانہ بغض و حسد ہے تب تک کوری زبان کی سائنس کی دُہائی دینا بے سود ہے۔

(۷)

یہ ہم کہہ چکے ہیں کہ خصوصاً ہندی اُردو اور عموماً ہندوستان کی سبھی زبانوں کی مدد سے ہندستانی راشٹر بھاشا بنانا ہی ہمارا کام ہے لیکن دراصل ایسی ہندوستانی راشٹر بھاشا کو وجود میں لانے کا سوال ہمارے سامنے نہیں ہے بلکہ سامراجیہ واد مذہبی اشتعال اور ہندوؤں و مسلمانوں کے سیاسی جھگڑوں کے باوجود بھی قدرتی طور پر جو بنیادی ایکتا ہے۔ اُس کے باعث ایسی ہندوستانی زبان موجود ہی ہے۔ آج ہندوستان کے تقریباً بارہ کروڑ لوگوں کی زبان ہے اور اُسے سمجھنے والوں کی تعداد تقریباً بیس بائیس کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔ جن صوبوں کی عوام کی زبان ہندی اُردو ہے وہاں اگرچہ ہندی اُردو والے اپنے اپنے ڈھنگ سے اپنا کام کر رہے ہیں لیکن جہاں تک عوام کا تعلق ہے وہاں نہ اُن کی ہندی کی ہی رسائی ہے اور اُن کی اُردو کی ہی۔ جن صوبوں کی زبان ہندی اُردو نہیں ہے وہاں بھی ہندوستانی کو سمجھنے والوں کی ایک بہت بڑی جماعت ہے اور صوبجاتی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کا چلن بھی کافی ہے۔ وہ زبان راشٹر بھاشا ہونے کے لائق ہے۔ ویسا کہنے کی بجائے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ ہماری راشٹر بھاشا ہے جس کے سہارے کوئی بھی شخص کچھ متفرق مقاموں کو چھوڑ کر مہاراشٹر بمبئی۔ بنگال۔ مدراس۔ یو۔پی۔ پنجاب بہار سرحد سندھ وغیرہ صوبوں میں کہیں چلا جائے اُس کا کام چل جاتا ہے۔ سوال رہ جاتا ہے۔ اس ہندوستانی راشٹر بھاشا کی ترقی کا اور اُس کے نظام کا یہ کام مکمل طور پر تو آزاد ملک کی آزاد حکومت اور آزاد قوم ہی کر سکتی ہے لیکن ہم اُس کی بنیاد ڈال سکتے ہیں اُس کے لئے میدان صاف کر سکتے ہیں۔ درحقیقت راشٹر بھاشا کا سوال آج محض اسی حد تک ہے۔

جہاں تک رہن سہن، نشست و برخاست اور روزمرہ کے دوسرے معمولی کاموں اور پرائمری تعلیم کا تعلق ہے ہندوستانی زبان ہمارے سامنے عملی صورت میں ہے ہی لیکن جب ہم اس سے آگے بڑھتے ہیں جب ہم آج کے زمانہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی طرف دھیان دیتے ہیں تب ہمارے سامنے یہ پیچیدہ مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی کے ذخیرہ کو کیسے بڑھایا جائے۔ ہندی اُردو والے یہیں ایک ایسی جگہ پہنچتے ہیں جب اِن کے درمیان کی کھائی بہت زیادہ چوڑی ہو جاتی ہے اور اُسے بھرنا یا اُس پر پُل بنانا نہایت مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ ہندی والے سنسکرت سے ہی اور اُردو والے فارسی سے ہی اپنی کمی پوری کرنا چاہتے ہیں اور خاص طور پر یہ دو زبانیں ہی ایسی ہیں جن کی مدد سے یہ کام نکالا جا سکتا ہے۔

یہاں ہندوستانی کے لئے سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ ہندی اور اُردو بھی اِس نقطۂ نظر سے کافی کنگال ہیں۔ نئے زمانہ کا دور دورہ ہے۔ نئے نئے خیالات نئی نئی ایجادیں نئے نئے فلسفے ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ جنھیں سمجھنے سمجھانے کے لئے سائنٹیفک، اقتصادی، سیاسی کلچرل، مذہبی، قومی سبھی طرح کے خیالات کی ترجمانی کے لئے نئی اصطلاحات

وجدید الفاظ کی ضرورت ہے آج ہندی اُردو والوں کا دھیان بھی اِدھر گیا ہے اور ہندوستانی والوں کو بھی
اِس کا تردد ہے۔ یہی نہیں ملک کی دیگر زبانوں کو بھی آج یہی فکر ہے۔ چاروں طرف جو یہ بیداری ہوئی ہے وہ
ہمارے ملک کی خوش نصیبی ہے۔ ہندی اُردو و دیگر زبانوں کی یہ کنگالی ختم ہو جانی چاہئے۔ لیکن ہندی سنسکرت
سے اپنی کنگالی دور کرے اور اُردو فارسی سے تو ہندوستانی کا کیا ہو؟ وہ کیا کرے؟ یہ سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے
اِس سوال کو کہیں کہیں ہندی اُردو کی ترقی میں بھی کچھ رکاوٹیں ڈالی جانے لگی ہیں جو ایک غلط پالیسی
ہے۔ جہاں نئے نئے الفاظ کی ضرورت ہے وہاں یہ ضرورت پوری ہونا چاہئے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جسے نظر انداز
نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہندی اُردو کی ترقی میں رکاوٹ ڈالی جائے۔ اگر دونوں کو کچھ
سمجھانا بجھانا ہے تو پیار محبت سے سمجھائیں۔ دونوں کی کوئی بھول یا غلطی بتانی ہے تو دردبھرے دل کے ساتھ
بتائیں۔ ہمدردی اور محبت کی یہ ذہنیت آج ہندی اُردو کے ساتھ ہو تبھی سچے معنوں میں ہندی و اردو کی بھلائی ہو سکتی
ہے۔ اور تبھی ہندوستانی کی ترقی میں کچھ کارنمایاں کیا جا سکتا ہے ورنہ ہندی، اردو بہک جائینگی اور راشٹر بھاشا کا سوال حل
کرنے میں نہایت پریشانی ہوگی۔ راشٹر بھاشا کا بنانا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہ رفتہ رفتہ بنے گی اس کے لئے ایک مدت چاہئے
اور طاقت بھی چاہئے۔ لیکن یہ سب تو تبھی ممکن ہے جب خود ہندی اُردو کو مالدار بنایا جائے۔ کنگال ہندی اُردو کو
لیکر ہندوستانی کیا کرے گی؟ اُسے تو ایک بڑا ذخیرہ چاہئے اور اُس کے لئے ضروری ہے کہ سنسکرت اور فارسی سے
ہندی اُردو کے ذریعہ چھن چھن کر وہ اُسے ملے یہی نہیں اُسے دوسری مراٹھی بنگلہ گجراتی سندھی پنجابی ملیالم وغیرہ
زبانوں سے بھی کچھ لینا ہوگا۔ اسے اپنی پاکیزگی کا جھوٹا گھمنڈ مٹا کر جہاں سے جو کام کی چیز ملے گی لینی ہوگی۔
ایسی حالت میں ہندوستانی کی ترقی کا جوش دل میں بھر کر ہندی اُردو و دیگر زبانوں کی ترقی کے راستہ میں
رکاوٹیں ڈالنا سخت مضر ہے اور اُن کی ترقی سے خوفزدہ ہونا غلطی ہے۔ ہندوستانی کے سچے حامی کو ہندی
اُردو کی ترقی سے خوش ہی ہونا چاہئے۔ یہی نہیں اس کے لئے اُسے کوشش بھی کرنا چاہئے۔ ہندوستانی کی
ترقی کے لئے سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے اور کسی طرح کا تعصب دل میں نہ لاتے ہوئے سنسکرت، فارسی و
دیگر زبانوں سے ضروری الفاظ لیتے رہنا چاہئے اور اسی نقطۂ نظر سے ہندی اُردو کی جتنی خدمت ہو سکے کیجائے
اگر کسی معنی کے لئے سنسکرت اور فارسی دونوں سے اچھے الفاظ ملتے ہوں تو دو الفاظ لینے میں بھی کوئی حرج نہیں
ہے گجراتی مراٹھی بنگلہ ملیالم وغیرہ کا تعلق سنسکرت سے زیادہ قریبی ہونے کی وجہ سے سہولت کا یہ تقاضہ ہے
کہ ہندوستانی کے لئے بمقابلہ فارسی کے سنسکرت سے زیادہ مدد لی جائے تو اس کی بیجا طور پر مخالفت کرنا ٹھیک
نہ ہوگا۔ اس امر کا فیصلہ ہم بآسانی کچھ ایسے اشخاص پر چھوڑ سکتے ہیں جو پبلک کے آزمودہ خادم ہیں اور جو
اِس معاملہ میں غیر متعصب فیصلہ کرنے کے قابل بھی ہیں۔ لیکن یہ سب تبھی ہو سکتا ہے جبکہ سنسکرت اور فارسی کی
یہ کشمکش جو فرقہ وارانہ جذبات سے وابستہ کر دی گئی ہے دور ہو جائے۔ جب تک ایسا نہ ہو سکے گا۔ تب تک ہندوستانی

والوں کی ہندوستانی کو سنسکرت فارسی وغیرہ زبانوں سے مالا مال کرنے کی کوشش کے باوجود ہندی الگ سنسکرت اور اُردو الگ فارسی سے اپنی ضروریات پوری کرتی رہیں گی جیسا کہ اب بھی کر رہی ہیں۔ ایسی حالت میں بھی ہمیں اُن کے راستہ میں حائل نہیں ہونا چاہئے اور اُن کی آج کی کنگالی سے اُن کی ہر ممکن ترقی پر صبر کرنا چاہیے کہ آج نہیں تو کل ہندی اُردو وغیرہ ہندوستان کی ہر زبان کی ترقی ہندوستانی کی قومی زبان ہندوستانی کے حق میں مفید ہی ثابت ہوگی۔

(۸)

ہندوستانی راشٹر بھاشا کے زیر سایہ صوبجاتی زبانوں کا اثر مٹ جائیگا۔ یہ اندیشہ بعض اوقات ظاہر کیا جاتا رہا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ کاش کہ تمام مختلف زبانیں نیست و نابود ہو جائیں اور سارے ملک کی بلکہ ساری دنیا کی ایک ہی زبان بن جائے۔ لیکن یہ خام خیالی ہے قطعی غیر ممکن ہے۔ زبان کے معاملہ میں ہی نہیں ہر ایک معاملہ میں اختلاف رہا ہے اور رہے گا۔ ضرورت اختلاف مٹانے کی نہیں ہے کیونکہ یہ ناممکن ہے بلکہ ضرورت اختلاف کے باوجود اتحاد قائم کرنے کی ہے۔

ہماری صوبجاتی زبانیں کسی ایک زبان کی مقامی شکلیں (dialects) نہیں ہیں بلکہ وہ الگ الگ زبانیں ہیں جو قدیم زمانہ سے چل آرہی ہیں اور جو اپنی خصوصیات رکھتی ہیں۔ ہر ایک کے پیچھے اُس کا شاندار ماضی ہے۔ ہر ایک کے بولنے والوں کی تعداد لاکھوں کروڑوں تک ہے ہر ایک کا تعلق کچھ گنے چنے لوگوں سے نہیں بلکہ سبھی خاص و عام سے اُن کی زندگی سے اُن کی کلچر سے اور اُن کے دل و دماغ سے ہے۔ ایسی زبانوں کو ہٹا کر عوام سے تعلق نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہندوستانی کو قومی نقطۂ نظر سے ایک خاص عظمت نصیب ہوگی لیکن ہر صوبہ میں تو اُس صوبہ کی زبان ہی رائج اور حاوی ہو سکے گی۔ عوام کی وہی زبان ہوگی۔ سرکاری دفتروں و پبلک کے جلوس و جلسوں میں۔ شہر شہر اور گاؤں گاؤں عملاً اُسی کو زیادہ ترجیح ملے گی۔ فرق صرف یہی ہوگا کہ اُس وقت صوبہ کی زبان کے ساتھ ہندوستانی کی کچھ تعلیم بھی ضروری ہو جائیگی اور سرکاری عدالتوں وغیرہ میں سرکاری اعلان و اشتہارات میں ہندوستانی کا استعمال بھی کیا جانے لگے گا دراصل ہندوستانی کا کام صوبوں کے باہمی تعلقات سے زیادہ بڑھے گا نہ کہ صوبہ کے اندرونی معاملات سے۔ اس لئے یہ اندیشہ کرنا کہ ہندوستانی سے صوبجاتی زبانوں کو نقصان پہنچے گا غلطی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی سے ہر ایسی زبان کو فائدہ ہی ہوگا۔ آج صوبجاتی زبانوں کے درمیان کوئی ایسا تعلق نہیں ہے جس کی بدولت ایک کو دوسرے سے خاص فائدہ پہنچ سکے لیکن ہندوستانی کے ذریعہ اِن میں باہم ایسا رشتہ قائم ہو جائیگا کہ ایک صوبہ کی زبان کی خوشبو دوسرے صوبہ کی زبان میں پہنچ سکیگی۔

ھ ہندی اُردو بنگلہ مراٹھی گجراتی تامل تیلگو ملیالم کنتڑ اُڑیا آسامی سندھی اور کچھ حد تک پنجابی اور پشتو یہ چودہ زبانیں ہیں۔

ایک صوبہ کے باشندگان دوسرے صوبہ کی زبان کے لٹریچر سے واقف ہوسکیں گے اور اس طرح ہر صوبہ کی زبان کو صوبہ کی زندگی میں ہی نہیں بلکہ تمام ملک کی زندگی میں ایک نمایاں حصّہ لینے کا موقع ہاتھ آجائیگا۔ آج عموماً بنگلہ کا طالب علم مراٹھی کے لٹریچر سے ناواقف ہے۔ ہندی کا طالب علم مراٹھی جواہرات کے دیکھنے کے ناقابل ہے۔ گجراتی تامل تیلگو وغیرہ کے لٹریچر سے بے بہرہ ہے۔ لیکن سچے معنی میں ہندوستانی راشٹر بھاشا ہونے پر یہ چار دیواریاں مسمار ہوجائیں گی اور ہر ایک زبان کی کرنیں ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل سکیں گی۔

باب چوتھا

اتحادِ عرب

عبدالرحمٰن صدّیقی

الوفاق العربی

از ــــــ مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی

سنون میلادیہ کی انیسویں صدی کے آخری پچاس برس اور بیسویں صدی کے نصف اول میں عالم اسلام جس طرح تباہ و برباد ہوا اس کی نظیر یا تو ہلاکو کے بغداد کے حملے اور خلافت عباسیہ کی بربادی میں یا اندلس سے غرناطہ کے آخری حاکم ابو عبداللہ کے اخراج سے ... میں ملتی ہے۔ دہلی میں چراغ تیموری گل ہوگیا۔ وسط ایشیا (ASIA) پر روسی اثر نہ صرف ... بلکہ ... بڑھتا چلا گیا۔ یوروپ میں اسلام کے قدم اکھڑ گئے اور توپاں نکل گئے۔ اور سلطنت کو پہلی پاشا کے ویانا (VIENNA) کے ... کی ناکامیابی ... عثمانی ... پائی مکان کے جو دروازے دشمنان اسلام کے لئے کھول دئے تھے وہ ۱۹۱۸ء تک برابر کھلے ہی رہے۔ یکے بعد دیگرے رومیلیا، دوبروجہ، بلغاریہ، سربستان، آلبانیا، یونانستان اور ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ کے بعد مقدونیا ترکوں کے ہاتھ سے چھین گئے۔ یوروپ میں اب ان کے پاس قسطنطنیہ اور اس کے محافظ چناق کے قلعے اور ان کے عقب میں براعظم یوروپ میں عثمانی سلاطین کا پہلا پایہ تخت ادرنہ (ADRIANOPLE) رہ گئے ہیں۔ اسی زمانہ میں فرانس کی حکومت نے مراکش، الجزائر اور طونس پر اپنا سکہ جمایا اور برطانیہ کی شرکت میں مصر کے خدیو محمد علی پاشا کے زمانہ سے ترکی اثر کو مٹا کر اپنے قدم جمانے شروع کئے تا آنکہ انگریزوں نے بلا شرکت غیری دریائے نیل کے کنارے اپنی حمایہ قائم کرلی اور مغرب میں فرانس کو انگریزی مداخلت سے آزاد کر دیا۔

ہندستان کا انگریزی سلطنت میں آنا اسلامی دنیا کے لئے قیامت ہوگیا۔ روس اور انگلستان کی ایشیا میں باہمی رقابت نے اس میں اور آگ لگادی۔ اس کی وجہ سے افغانستان کو غیر معمولی اہمیت ملی اور درہ خیبر کے عسکری نقطے کے آس پاس دونوں سلطنتوں کی شرارتیں اور سیاسی چالاکیاں گھومتی اور منڈلاتی رہیں۔ ایران روسی اور برطانوی سیاسی سورماؤں کی جولانگاہ اور ترغیبات حاصل کرنے والی ٹولیوں کا اکھاڑا بن گیا۔ رفتہ رفتہ ۱۹۰۷ء میں روسی ریچھ اور برطانوی شیر ببر نے اس کے دو ٹکڑے کر لئے۔ عراق میں دجلہ اور فرات میں

جہاز رانی کے حقوق لنچ (LYNCH) کمپنی نے حاصل کئے اور سر ولیم ول کاکس (WILCOX) نے ان نہروں پر بند بنا کر ملک کو سیراب کرنے کی تجویز کا مطالعہ شروع کیا۔ تجارتی اور اقتصادی حقوق سیاسی شرارت کا پیش خیمہ ہوا کرتے ہیں اور یہی عراق میں ہوا۔

انگریز اپنے آپ کو پانی کا شہزادہ سمجھتے ہیں۔ "اور اپنی نسل کو "برطانیہ دریا کی موجوں پر حکومت کرتا ہے" اور اس قسم کے دیگر گانے سکھا کر دوسروں پر اپنی دھاک جماتے رہتے تھے۔ جبل طارق سے۔ مالٹا اور وہاں سے نہر سوئیز تک کا راستہ اُن کے ہاتھ لگ گیا اور بحر روم گویا ایک انگریزی جھیل بن کر رہ گیا۔ اب ان کے سیاسی اور عسکری ماہرین کی ہمتیں بڑھیں اور جادۂ احمر جو شام کے کنارے سے ہندوستان کی سرحد تک پہنچ جائے اس کے قیام کی تجویز اور اُس کے عمل میں لانے کی ترکیب پر غور کرنے لگے۔ اس کی وجہ ایک اور بھی ہوئی۔ جرمنوں نے استنبول سے بغداد تک ریل بنانے کے حقوق حاصل کر لئے۔ اس پر انگریز بے حد گھبرائے کہ اگر جرمن خلیج فارس پر پہنچ جاتے تو انہیں خوف تھا کہ بحر ہند اور ہندمیں اُن کی حکومت کے لئے خدشہ پیدا ہو جاتا۔ دوسری طرف سلطان عبدالحمید خاں ثانی کی حجاز ریلوے بھی بننی شروع ہو گئی تھی۔ جس سے نہ صرف عرب ممالک کی مدافعت میں امداد ملتی بلکہ اگر ترکی کی شمالی حدود پر دشمن حملہ کرتا تو شام اور عراق سے افواج لانے میں سہولت ہوتی۔ بغداد اور حجاز ریلوے کا اتصال ابھی ہونے نہ پایا تھا کہ انگریزوں نے سلطان پر زور ڈالا کہ جرمن بصرے کو اپنی ریل کا آخری مقام نہ بنائیں۔ فساد زیادہ طول نہ کھینچے اس خیال سے سلطان کے مشورہ پر جرمنوں نے بصرے کو چھوڑ دیا اور کویت کو ریل کا آخری نقطہ بنانا قبول کر لیا۔ اگر ۱۹۱۴ء میں جنگ نہ چھڑ گئی ہوتی اور بغداد ریلوے اور حجاز ریلوے مکمل ہو گئی ہوتیں تو کیا عجب ہے جو سلطنت عثمانیہ کو وہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے جو اُسے ۱۹۱۸ء میں دیکھنے پڑے۔ جرمنوں کی مخالفت میں فرانس نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔

ترکی کو ڈرانے کا بہترین طریقہ عربوں میں بغاوت پھیلانے کا تھا۔ عربوں کو ترکوں سے لڑانے کی خفیہ اور علانیہ کوششیں شروع ہو گئیں اور عرب دھوکا کھا گئے۔ سلطنت عثمانیہ میں کوئی دیوانی یا عسکری عہدہ ایسا نہیں تھا جو عرب حاصل نہ کر سکتے تھے۔ صدارت عظمیٰ بارہا عربوں کو ملی سینکڑوں والی وزراء اور سفیر عرب ہوئے۔ نیز عسکری محکمہ میں فریق (GENERAL) اور مشیر (FIELD) بھی ہوئے مجلس شوریٰ میں عرب مبعوث منتخب ہوئے۔ غرضیکہ حکومت کے ہر صیغہ میں اور ہر عہدے کے بلا تفریق عرب اور ترک برابر کے حقدار تھے عرب تو عرب، یہودی، ارمنی، یونانی، اور دیگر غیر مسلم اقوام بھی وہی حقوق رکھتی تھیں جو مسلمان ترکی اور جرمن کی مخالفت انگریز اور فرانسیسیوں کو قریب ضرور لے آئی لیکن ان کی پرانی رقابت قائم رہی۔ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر فرانس گھبرایا۔ مصر سے انگریز فرانساوی اثر کو آہستہ آہستہ دور کر رہے تھے، عراق میں بھی خلیج فارس کی راہ سے اِن کا پانسہ بھاری ہو رہا تھا اگر شام میں بھی یہ بازی لے گئے تو نہ صرف جادۂ احمر کی تجویز پختہ ہو جاتی بلکہ فرانس کے افریقی اور آسیائی حصے بھی معرض خطر میں آ جاتے۔ لہٰذا انھوں نے شام میں اپنی کارستانیاں شروع کر دیں۔ صلیبی جنگوں کے زمانے سے فرانساوی پادری شام اور ارض مقدس میں مدرسوں اور گرجا گھروں کے ذریعے سے دینی تعلیم کے علاوہ دھیمے دھیمے ایک نئی صلیبی جنگ کی بنیاد ڈالتے رہے تھے اور یہ کام عیسائی عربوں کی وساطت سے صدیوں سے ہو رہا تھا۔ جوں جوں ترکی حکومت میں کمزوری آتی گئی توں توں اُس کام میں زور آتا چلا اور فرانس کے حلیف روس نے بھی اس میں پوری امداد کی۔ کامیابی کی ایک وجہ اور بھی ہوئی۔ عرب، ترک، ایرانی اور مصری نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے عموماً

فرانس کی درسگاہوں میں جاتے تھے کیوں کہ جہاں انگریز صرف تجارت کے ذریعہ سے آگے بڑھتا ہے وہاں فرانس والے مدرسوں کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ مصر، ترکی، اور شام اور خاص کر لبنان میں جہاں کی آبادی زیادہ تر مارونی (MARONINIST) عیسائیوں کی ہے فرانسیسی مدرسے پھیلے ہوئے تھے۔ اور طلبا یورپ کی زبانوں میں اکثر فرانسیسی ہی سیکھتے تھے اور اس طرح فرانسیسی خیالات کی تعمیم ان ممالک میں برابر ہوتی رہی۔ حکومت نے عرب نوجوان طلبا پر اپنا جال پیرس اور مون پے لی ایر (MONTPELIER) کی درسگاہوں میں پھیلایا اور ان میں قومیت کی تحریک شد و مد سے برپا کی۔ قونصل اور قونصلخانوں کے ذریعے سے خفیہ کتابیں ملک میں تقسیم کی گئیں اور ہر قسم کی مالی اور اسلحے سے بھی مدد پہنچائی۔ لبنان کی پہاڑیوں میں کئی مرکز قائم ہوئے۔ جہاں گولہ بارود اور توپیں جمع کی گئیں۔ بلقان کی جنگ میں ترکی ہزیمت سے فائدہ اٹھا کر عرب انقلاب کی پوری تیاری کر لی گئی تھی۔ شیخ عبدالعزیز شاویش مرحوم اور طلعت بیگ مرحوم نے اور تجاویز پیش کر کے اس آگ کو بھڑکنے سے روکا۔

اوّل۔ اصول لا مرکزیہ (DECENTRALIZATION) قبول کر کے ہر عرب ولایت کو خود مختار حلقہ مقرر کیا اور اس کا اعلان ایک ارادہ سنیہ کے ذریعہ تمام عرب ممالک میں کر دیا۔ ترکی اور عربی زبانوں کو برابر کا درجہ دیا۔ دوسری تجویز مدینہ منورہ میں کلیۃ الوہبیہ کے قیام کی تھی۔ جس کا سنگ بنیاد انور بیگ مرحوم نے رکھا تھا۔ مسٹر جورج الطونیوس (GEORGE ANTONIUS) نے عرب انقلاب کی جو تاریخ لکھی ہے اور دیگر کتابیں جو انگریزی میں اور یورپ کی دوسری زبانوں میں شائع ہوئی ہیں وہ صرف اسی حد تک صحیح ہیں کہ شام اور لبنان کے عرب باشندے جن کا دین مسیحی تھا وہ دینی تعصب اور اور یورپائی حکومتوں کی شرارتوں کا شکار ہو گئے۔ ترکی اسلامی حکومت کو تباہ کرنے کے لئے صلیبی جنگوں کے سورماؤں کی روحوں کی یاد کو تازہ کر کے دین عیسوی کی نجات دلانے والوں میں اپنے نام بھی تاریخ کے ورق پر لکھوانا چاہتے تھے۔ مسلم عرب طلبا بھی آزادی کی تحریک سے متاثر ضرور ہوئے تھے۔ اور سلطان عبدالحمید خاں کی جابرانہ حکومت سے اتنے ہی نالاں تھے جتنے کہ خود ترک لیکن ان حضرات میں اکثر نے جو اب پچاس یا اس سے زائد کی عمروں میں ہیں خود مجھ سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ ہمارا ارادہ آسٹریا اور ہنگاریہ کی متحد سلطنت کی طرح ایک ترکی اور عربی متحد حکومت کے قیام کا تھا۔ ہم ترکوں کے دشمن نہیں تھے بلکہ ہم عرب آزادی کے حامی تھے کیونکہ ہم عربی تمدن اور ثقافت (CULTURE) کو ترکی تمدن سے اونچا اور بہتر سمجھتے تھے۔ ہم استانبول کے سلطان کو اپنا بادشاہ اور خلیفہ قبول کرنے کو آمادہ تھے۔ لیکن مجلس شوریٰ ہم عرب ممالک کے لئے علیحدہ چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں ان احباب نے اس کا بھی بلا تکلف اعتراف کیا کہ ہم ترکوں سے کلیتاً الگ اس وجہ سے بھی نہیں ہونا چاہتے تھے کہ ہم میں بیرونی حملے کی مدافعت کرنے کی نہ تو طاقت تھی نہ صلاحیت حفاظت کے لئے ہمیں ترکی سپاہی کی ضرورت تھی۔ اگر ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ نہ ہوتی اور اگر اس میں ترک جرمنوں کا ساتھ نہ دیتے تو شاید سلطنت عثمانیہ اس وقت تک برقرار رہتی اور اس میں ایک مجلس شوریٰ استانبول میں اور دوسری دمشق یا قدس شریف میں برسر اقتدار نظر آتیں۔

قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ گیلی پولی کے جزیرہ نما کی شکست انگریزوں اور فرانس والوں کو شاق گذری آبنائے دار دانیال کے بند ہونے سے روس اکیلا پڑ گیا اور آخر میں برباد ہو گیا۔ لڑائی کا پانسا پلٹنے کی ایک ہی ترکیب تھی اور وہ ترکوں کو جنوب کی جانب سے کمزور کرنے کی۔ شامی عرب جن میں عیسائی عنصر اچھا خاصا تھا۔ بغاوت کے لئے آمادہ کرلئے گئے تھے لیکن ان میں کوئی ایسا شخص

نہ تھا جو انقلاب کا سرگروہ بن سکے۔ جنرل میکسول (MAX WELL) جس کی قرارگاہ عموماً مصر میں تھی اور سرہنری میک مے ہن (MAC MAHON) جو انگریزی حمایہ کا افسرِ اعلیٰ بنا کر مصر بھیجا گیا تھا۔ دونوں نے فرانسیسی حکام اور عرب جاسوسوں کے ذریعے سے شریف حسین کو پھانسا۔ یہ شخص ترکوں سے اس وجہ سے ناراض ہو گیا تھا کہ اس کے لڑکے فیصل کو جس نے ایک رومی عورت کو گھر میں ڈال رکھی تھی خاندان آلِ عثمان کی شاہزادی نکاح میں دینے سے سلطانِ وقت نے انکار کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں اسے یہ بھی شکایت تھی کہ اُسے نہ تو سلطان اور نہ ترکی وزارتِ مالیہ جتنا روپیہ مانگے دیتی تھی۔ ائتلافِ ثلاثہ (TRIPLE ILLIANCE) کے روپے اور خلافت کی ہوس کا جادو چل گیا۔ شریف حسین عرب انقلاب کا مرغنہ بنا لیا گیا۔ اس سے عجیب و غریب وعدے کئے گئے۔ علاوہ خلافت کے اُسے ترکی حکومت کے ان تمام حصوں کا بادشاہ بنانے کا سبز باغ دکھلایا گیا۔ جن میں عرب آباد تھے۔ ابھی یہ حصے فتح بھی نہیں ہوئے تھے کہ یہ اپنے آپ کو ملک العرب کہنے اور لکھنے لگا۔ یہ تھی پہلی کڑی عربی وفاق کی جو برطانیہ اور فرانس کے آہنی کارخانوں میں گڑھی گئی تھی۔ مسلم انقلابیوں نے شریف کو اس وجہ سے قبول کیا تھا کہ آسٹریا دم توڑ رہا تھا اور جرمنوں کو فرانس کے محاذ پر کامیابی نہیں ہو رہی تھی، اس کا اثر ترکی کی حکومت پر بھی نمایاں تھا۔ انھوں نے بہتر یہی سمجھا کہ غالب کا ساتھ دینا زیادہ سود مند ہے وہ یہ نہ سمجھے تھے کہ ان کی خدمات کا صلہ غلامی ہو گی۔

جنگ ختم ہوئی امیر فیصل اپنی عقلِ کل طامس لارنس (THOMAS LAWRENCE) کو کبھی عربی لباس پہنا کر اور کبھی عسکری وردی میں پیرس اور لندن میں بین الاقوامی مدبرین کی ڈیوڑھیوں کے چکر لگاتا رہا شنوائی کہیں نہیں ہوئی حسین ملک الحجاز بن کر رہ گیا۔ شام اور لبنان فرانس کے حصہ میں آئے اور فلسطین، عراق اور حجاز کی مشہور بندرگاہ عقبہ انگریزوں کے۔ انگریزوں کی سفارش پر فیصل کو شام کا بادشاہ فرانس نے قبول کیا لیکن پہلی ہی عدول حکمی پر فرانس والے اس سے ناراض ہو گئے اور نکال باہر کیا۔ انگریزوں نے رحم کھا کر اُسے عراق پر مسلط کیا حالانکہ وہاں طالب پاشا نقیب سے بھی جس نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ بادشاہ بنانے کا وعدہ کیا گیا تھا شریف کے دوسرے لڑکے عبداللہ کو شرق اُردن کا حاکم بنایا۔ اُسے فلسطین صیہونیوں کی وجہ سے نہیں ملا حالانکہ ارضِ مقدس کا پورا اور حتمی وعدہ سرہنری میک مے ہن نے شریف حسین سے کیا تھا صیہونیوں کے پھسلانے دھمکانے سے لارڈ آرتھر بیلفور (BALFOUR) نے ساتھ ہی ساتھ فلسطین میں یہودی مرکز کے بنانے یہودی حکومت کے قیام کا وعدہ کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تک صیہونی اور عرب برابر لڑ رہے ہیں اور جس بین الاقوامی اصول کی بناء پر انگریز وہاں قابض ہو گئے ہیں وہ اُسے سلجھا نہ سکیں گے قرائن یہ معلوم ہوتے ہیں کہ موجودہ جنگ سے فائدہ اُٹھا کر صیہونی حضرات انگریزوں کو عاجز کر دیں گے اور بجائے مرکز کے قومی حکومت قائم کر ہی کے رہیں گے۔ اس قضیہ میں امیر عبداللہ کو شرق اردن کے ریگستان میں دھکیل دیا گیا۔ وہاں وہ انگریزی عسکری حکام کی زیر نگرانی اپنی زندگی کے دن گذار رہا ہے۔ اسے ضرورت کے وقت بغرض تشہیر باہر نکال لاتے ہیں اور پھر معان واپس بھیج دیتے ہیں۔

شریف حسین کی کہانی عبرتناک ہے لندن کی وزارتِ خارجہ اُسے روپے سے اور وعدوں سے اُبھارتی رہی اور ہندی ادارہ خارجہ نجدی سلطان عبدالعزیز ابن عبدالرحمٰن آل فیصل ابن سعود کو تیار کرتا رہا۔ حسین کی ضرورت جوں جوں کم ہوتی گئی اسی رفتار سے چاندی سونے کی گنگا جمنا کی دھارا بھی خشک ہوتی گئی۔ فیصل بغداد میں عبداللہ معان میں بٹھلائے گئے تھے حسین کا فرزند علی حجاز کا ولی عہد مقرر ہوا لیکن جب سلطان عبدالعزیز نے وہابی اخوان کی جماعت کو مسلح کر کے تیار کر لیا تو حجاز پر حملہ کر کے اوّل طائف پھر مکہ معظمہ اور پھر مدینہ منورہ کو فتح

کرلیا۔ حسین حکومت سے دست بردار ہوکر اور علی کو بادشاہت سپرد کرکے جو کچھ سونا جمع کرسکا وہ لے کر جزیرہ قبرص بھاگا۔ اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ملک العرب علی ابن حسین نے اپنے چھوٹے بھائی عبداللہ کے گھر میں پناہ لی سلطان عبدالعزیز پورے حجاز کا مالک بن گیا تھوڑے ہی عرصے کے بعد عسیر بھی فتح کرلیا۔ رسمی طور اب اس کا نام سلطان نجد ملک الحجاز و ملحقاتہا ہے۔ اس نے یمن پر بھی چڑھائی کردی اور تہامہ کا ساحلی حصہ فتح بھی کرلیا تھا لیکن صاحب السماحہ حضرت الحاج السید امین الحسینی مفتی اعظم القدس الشریف اور حضرت الامیر شکیب ارسلان کی کوشش سے صلح ہوگئی اور امام یحییٰ اپنی حکومت پر برقرار رہا۔ جزیرۃ العرب کا جنوبی ساحلی حصہ یعنی حضرموت اور خلیج فارس میں عمان بحرین اور کویت انگریزی حمایہ میں آگئے ہیں اور ان کی حیثیت ہندی نواب اور راجاؤں سے کسی طرح اونچی نہیں ہے۔

یہ ہے تصویر عرب ممالک کی اور یہ ہے تاریخ بیسویں صدی کے عربوں کی۔ پچھلی جنگ کے نتائج عربوں کے حق میں مفید نہیں ہوئے۔ ترکی سلطنت میں یہ برابر کے دعویدار تھے۔ انگریزی اور فرانسیسی تعلق کی بدولت یہ غلام بن گئے۔ اب اپنی قسمت پر روتے ہیں۔ عراق میں انقلابی تحریک اور دو مرتبہ خونریزی کے بعد انگریزوں سے صلح نامہ ہوا۔ لارنس کے دو نائب موجود پاشا مخلص اور نوری پاشا سعید کے ذریعہ سے انگریزی رسوخ قائم ہے۔ لبنان اور شام میں دروزی زعیم سلطان پاشا الاطرش کی انقلابی حرکت کو فرانس نے سختی سے دبا دیا۔ فلسطینی جنگ نجات کی آگ کو موجودہ جنگ نے دبا دیا ہے۔ لیکن اس کی راکھ میں ابھی چنگاریاں باقی ہیں گو ایک ایک کرکے تمام مسلم اور عیسائی حضرات کو جنہوں نے قومی تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا، پکڑ کر جنوبی افریقہ میں روڈیسیا (RHODECIA) میں قید کردیا ہے۔ نجدی اخوان اور اُن کے زعماء حجاز میں آنے کے بعد نئی روشنی کے خواہاں ہوئے۔ مصر اور شام کے علاوہ پیرس اور لندن اور اب تو امریکا کی بھی سیر کرنے لگے اور کیا عجب ہے کہ جو سلطان عبدالعزیز کے بعد یہ بھی منورین کی جماعت میں سمجھے جانے لگیں۔ یمانی حکومت اور باشندے دوسرے عربوں سے نہ صرف مذہبی حیثیت ہی سے جدا ہیں بلکہ ان کا نقطۂ نظر ہر چیز میں علیحدہ ہے۔ وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہی رکھنی چاہتے ہیں۔ عراق میں ایرانی۔ کردی اور عرب فرقے ہیں ان کی زبانیں بھی الگ ہیں۔ شیعہ سنی کا قصہ بھی موجود ہے۔ حجازی شامی کو پسند نہیں کرتا اور بدو شہری کو اب تک ذلیل سمجھتا ہے۔ مکے اور مدینے کے رہنے والے جو ائمہ اربعہ کے مقلد ہیں وہ اور شیعہ حضرات وہابیوں سے عاجز ہیں۔ یمن میں جو قبائل تہامہ کے ساحلی حصے میں آباد ہیں شافعی ہونے کی وجہ سے صنعا کی پہاڑی امامی حکومت کی نگاہ میں قابل عزت اور قابل اعتماد نہیں ہیں۔

عربی تحریک کی جڑیں نہ نسل میں ہیں اور نہ مذہب میں۔ العرب والعربیہ کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہر وہ شخص جس کی مادری زبان عربی ہے عرب ہے۔ اس اصول کے مطابق مراکش۔ الجزائر اور طونس کے بربر بھی عرب ہیں اور مصر کے قبطی اور فلاح اور نوبیا اور سودان کے باشندے بھی مصر میں عرب ترک اور چرکس قومیں وہاں کے اصلی باشندوں میں اس طرح مِل جُل گئی ہیں کہ اُن کی اصل نسل کا دریافت کرنا اکثر مشکل ہو جاتا ہے مصر کا بادشاہ خود البانوی ہے۔ وزراء دیگر اقوام کے اور آبادی کا تقریباً ۹۰ فی صدی حصہ طوطانخ آمون کی اولاد ہے۔ یورپ کی ملی اور قومی تحریکوں کا اثر عرب قوم پر بہت زیادہ پڑا ہے۔ المصر للمصریون۔ العراق للعراقیوں کی صدائیں برابر کانوں تک آتی رہتی ہیں۔ وفاق علیحدہ علیحدہ قوموں اور حکومتوں میں اُسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب ہر قوم اور ہر حکومت اپنے کچھ حقوق کو ایک مرکزی ادارے کے نام تفویض کردے۔ عرب کا خون گرم ہے اور اب بھی پانی پینے اور پلانے پر جھگڑا

کرلیتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہو سکے گا کہ وہ اپنے ملی۔ قومی۔ یا قبائلی حقوق کسی اور کے سپرد کردے خواہ وہ کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں۔

ایک اور پہلو بھی ہے جو وفاق کی خوش کن خواب کو پراگندہ کر دیتا ہے۔ جب تک موصول میں اور بحرین میں اور الحصا کی زمین میں مٹی کا تیل موجود ہے اور جب تک اور وپائی اقوام اپنی صنعتوں کے لئے بازار اور انھیں وہاں تک پہنچانے کے سلئے دریائی اور ہوائی رستوں پر قبضہ قائم کرنے کی کوشش میں مبتلا ہیں تب تک وفاق عربی اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور معلوم ہوتا ہے۔ وفاق کے کامیاب ہونے کی شرط اولیں یہ بھی ہے کہ اس کے اعضاء آزاد ہوں۔ پیشین گوئی کا کرنا آسان نہیں لیکن اس کا کہنا کہ موجودہ حالات میں اگر عربی وفاق کی عمارت کھڑی کی گئی تو اس کی تعمیر میں غلامی اور خرابی کی صورت ضرور مضمر رہے گی۔ غلط نہ ہوگا۔ انگلستان اور فرانس دو بڑی سلطنتیں تھیں جنہوں نے اپنی عمارتیں دنیا بھر میں پھیلا رکھی تھی۔ جنگ کے بعد روسی اور امریکائی حکومتیں اپنے حصے کی طلبگار ہوں گی اور لے کر رہیں گیں۔ موجودہ ہوا کا رُخ اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ البتہ اگر جمہوریت کی جنگ جمہوری صلح پر ختم ہوئی اور عرب ممالک آزاد ہوئے تب ایک نہیں بلکہ ایک سے زاید وفاق ہو سکتے ہیں۔ جغرافیائی۔ مالی۔ علمی۔ تمدنی اور ثقافتی حیثیتوں سے قاہرہ اس کام کا مرکز بن سکتا ہے۔ حکومت سعودی نے نجد۔ حجاز اور عصیر کو متحدہ کر ہی دیا ہے۔ مکہ سے بہتر اس کا اور کوئی مرکز ہو ہی نہیں سکتا۔ ممکن ہے اس میں جنوبی اور مشرقی ساحلی حصے بھی شریک ہو جائیں۔ ریف۔ مراکش۔ الجزائر۔ طونس اور طرابلس الغرب بھی ایک وفاق قائم کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ ناممکن نہیں ہے کہ اس وقت کی عرب حکومتیں اپنے آقایان مغربی کی زیر نگرانی اور ان کی [illegible] سے وہ وفاق قائم کرلیں جس کے مسٹر انیتھنی ایڈن متمنی ہیں اور جس کے لئے مصطفےٰ پاشا نحاس مصر میں [illegible] پاشا سعید عراق میں کوشاں ہیں۔ شام سے جمیل بیگ مردم بھی اسی مہم پر نکلے ہیں اور عبداللہ بیچارہ تو اس کے لئے اپنی سرکار [illegible] کا منتظر ہی بیٹھا ہے۔ اگر یہ تگ ودو جاری رہی تو ممکن ہے قاہرہ میں جو شوری جلسہ ہونے والا ہے وہ کسی صورت کا وفاق گھڑ لے لیکن یہ وفاق عربی نہیں ہوگا شاید عربی الانجلیسی والفرنسادی ہو۔

وفاق عربی صرف ایک ہی بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے۔ اور وہ مذہب ہے۔ عرب ممالک میں مسلم زیادہ اور غیر مسلم کم ہیں۔ فرق تھوڑا نہیں بلکہ ۹۵ اور ۵ کا ہے۔ عیسائی اور یہودی عربوں کو اسلامی قانون کے مطابق وہ تمام حقوق حاصل ہونگے جو مسلمین کو۔ دین اور دنیا کو علیحدہ کرنے کے نتیجے آج یوروپ بھگت رہا ہے۔ جو راہ یورپ والوں نے روما کے پاپا اور اس کے پادریوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے اختیار کی وہ غلط ثابت ہوئی۔ اصلی خدا کو بھول گئے اور اقتصادی بھوت کو اس کی جگہ کھڑا کر دیا۔ عربوں نے اگر یہ راہ لی تو ترکستان ان سے قریب تر ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں نیک ہدایت دے۔ آمین!

باب پانچواں

ہندو تہذیب

ڈاکٹر سیّد محمود

ڈاکٹر سید محمود کا یہ مضمون ایک ضخیم تصنیف کا جزو ہے جو ہندو تمدن پر لکھی گئی ہے اور اب تک شائع نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب اس پر نظر ثانی کر کے پریس کو بھیجنے والے ہی تھے کہ ۸ اگست ۴۲ء کی تحریک میں کانگریس کی مجلس عاملہ کے رکن ہونے کی حیثیت سے گرفتار ہوئے اور اب تک نظر بند ہیں۔ ہم بہت زیادہ فکرمند تھے کہ اس نمبر میں ڈاکٹر صاحب کا کوئی نہ کوئی مضمون ضرور شائع کریں گے۔ اچانک ڈاکٹر صاحب کے ایک عزیز دوست کے ہاں ہمیں یہ مسودہ مل گیا۔

مندرجہ ذیل ٹکڑا ڈاکٹر صاحب کی اسی تصنیف "ہندو تہذیب" کا مقدمہ ہے۔ انشاء اللہ ڈاکٹر صاحب کی رہائی کے بعد ہم ان کی پوری تصنیف کو شائع کرنے کی عزت حاصل کریں گے۔

ایڈیٹر

پروفیسر مکسمولر نے ہندوستان کی تعریف ان زندہ رہنے والے الفاظ میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"بالفرض اگر میں کسی ملک کو ڈھونڈھ نکالنے میں ساری دنیا کو چھان ڈالتا جو قدرت کی برکتوں سے مالا مال۔ منطقہ حارہ کے اثر سے سرسبز و شاداب خزانوں کی کثرت سے معمور اور ہر قسم کی قوتوں سے بھر پور ہوتا خواہ وہ روئے زمین پر بہشت کا ہمسر ہی کیوں نہ سمجھا جاتا تو ضرور میں اس کو ہندوستان ہی بتاتا۔ بالفرض اگر مجھ سے دریافت کیا جاتا کہ آسمان کے نیچے کون سے طبقۂ زمین میں انسانی ضمیر نے بعض بعض اس کی حد درجہ کی نعمتوں کو نہایت ہی کامل طور پر ظاہر کیا ہے اور زندگی کے بڑے بڑے مسائل پر بے انتہا گہرائی سے غور و خوض کیا ہے اور ان میں سے بعض ایسے مسائل کو حل کر دیا ہے جو ان لوگوں کی توجہ کے سزاوار ہیں جنھوں نے پلیٹو (PLATO) اور کانٹ (KANT) کی تصانیف کو پڑھا ہے تو ضرور میں اس کو ہندوستان ہی بتاتا۔ اور اگر بالفرض میں خود یہ پوچھتا کہ ہم یہاں یورپ میں کس علم ادب سے وہ صحت بخش شے اخذ کر سکتے ہیں جو ہماری باطنی زندگی کو زیادہ مکمل، زیادہ سنجیدہ اور زیادہ متین بنانے کے لئے بہت ضروری ہے اور نہ صرف اس زندگی کے لئے بلکہ ایک جاودانی زندگی کے لئے بھی جس کو حقیقتاً انسانی زندگی کہنا چاہئے ضروری ہے تو بھی میں اس کو ہندوستان ہی بتلاتا۔"

یہ کہنا کسی طرح مبالغہ نہیں ہے کہ ہندوستان ہی وہ خطہ ہے جہاں سے تہذیب و شائستگی کی ترقی ہوئی۔ یہیں سے علم و فضل کی روشنی تمام دنیا میں پھیلی اور یہیں سے صنعت و حرفت کا آغاز ہوا۔ بیشک پروفیسر مکسمولر نے سچ کہا ہے اس لئے کہ ہندوستان ہی دنیا کی سطح پر وہ ملک ہے جس کو خدا نے اپنے غیر محدود فضل و کرم سے بہرہ یاب کر رکھا ہے۔ ہندوستان ہی وہ خطہ ہے جس کو رزاق عالم نے اپنی گوناگوں اور بوقلموں بخششوں سے غنی بنا رکھا ہے اور ہندوستان ہی وہ قطعہ ہے جس کو خلاق انس و جان نے ہر قسم کی اشیاء سے معمور کر دیا ہے۔ یہیں سے تہذیب و شائستگی کی ترقی ہوئی۔ یہیں سے علم و فضل کی روشنی پھیلی اور یہیں سے صنعت، حرفت کا آغاز ہوا۔ دیکھئے ہمالیہ سے راس کماری تک اور

کوہ سلیمان سے بحر شرقی تک ہندستان آباد نظر آتا ہے جس میں خدا کی نعمتیں بھری پڑی ہیں۔ اگر آپ کو علم طبقات الارض کے جاننے کا شوق ہے تو ہمالہ سے راس کماری تک اس کے تجربہ کے لئے لق ودق زمین پڑی ہوئی ہے۔ اگر آپ کو علم نباتات حاصل کرنے کی ضرورت ہے تو اس کے لئے بھی کوہ سلیمان سے بحر شرقی تک کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ اگر آپ کو علم حیوانات کے جاننے کی خواہش ہے تو اس کے واسطے بھی میدان کھلا ہوا ہے۔ اگر آپ کو اسباب دریافت کرنے کی ضرورت ہے تو ہندستان گویا سبسوں کا مخزن ہے۔ اگر آپ کا رجحان اسلاف کے حالات کی طرف ہے تو ہندستان خود اسلاف کی تاریخ ہے۔ اگر آپ کو قدیم سکوں کا خزانہ درکار ہے تو ہندستان فارس۔ یونان۔ کارتیا تھریس۔ پارتھینا۔ مقدونیہ سیتھا۔ روم اور سائبریا کے نایاب سکے پیش کرسکتا ہے۔ اگر آپ کو دیوتاؤں کے نام کا معلوم کرنا مقصود ہے تو وہ دیوتاؤں کے عجیب وغریب حالات وحیرت خیز اشکال اور ان کی بیشمار تعداد بتا سکتا ہے۔ اگر آپ کو مافوق الخیال افسانے اور تحیر انگیز قصے سننا منظور ہیں تو وہ ایسے دلچسپ افسانے سنانے کو تیار ہے جس کو سن کر آپ متحیر وششدر رہ جائیں۔ لیکن آپ کو جاننا چاہئے کہ ہندستان سے صرف یہی نفع نہیں حاصل ہوسکتے ہیں بلکہ اس کے موسموں کا اعتدال۔ اس کی آب وہوا کی لطافت۔ اس کی شادابی اور سرسبزی کی کیفیت اور اس کی پیداوار کی کثرت بے اختیار انسان کو اپنی جانب متوجہ کرلیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ سے ہندستان ساری دنیا کا مطمح نظر رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مدام ہندستان شاہان اولوالعزم کا جولانگاہ بنا رہا ہے اور یہی باعث ہے کہ آریوں نے اس کو اپنا وطن بنایا اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس کی خوبیوں پر فریفتہ ہوکر آریوں کی طرح اس کو اپنا گھر بنالیا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ہندستان کی طبیعت میں کچھ ایسی ملنساری اور مہمان نوازی ہے کہ آریہ آئے تو ان کے قدموں کے نیچے آنکھیں بچھادیں اور ایسا دل کھول کر برتاؤ کیا کہ وہ اپنے قدیم وطن وسط ایشیا کو بھول گئے۔ یونانی آئے تو ان کے ساتھ بھی ایسا اچھا برتاؤ کیا کہ وہ بھی یہیں رہ پڑے۔ غرضکہ ایرانی۔ افغانی سب آنے والوں کے ساتھ اس کی مہمان نوازی دلفریب تھی۔ جب مسلمان آئے تو ان کی مہمان نوازی میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور اس طرح کا مخلصانہ سلوک کیا کہ وہ اپنے آبائی گھر کو بھول گئے۔

پھر جب اہل یورپ آئے تو ان کا بھی نہایت سرگرمی سے خیر مقدم کیا لیکن انھوں نے پیشتر آنے والوں کی طرح اس کو اپنا وطن نہیں بنایا بلکہ وہ صرف اس کی بیشمار نعمتوں سے مالا مال ہوتے رہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہندستان جتنا کہ نئے آنے والوں کے ساتھ اظہار انس ومحبت کرتا ہے ویسا پریم وہ ان لوگوں کے ساتھ نہیں کرتا جن کو آئے ہوئے ایک عرصہ دراز گذر گیا۔ لیکن اگر ہم ایسا سمجھتے ہیں تو یہ ہماری غلطی ہے اور ہم اپنے پیارے ملک ہندستان کو ناحق الزام دیتے ہیں اور اس الزام سے بچنا چاہتے ہیں۔ جس کے ہم خود مستحق ہیں۔ ہم کو صاف اقرار کرنا چاہئے کہ ہم نے خود اپنے خصوصیات کو مٹا دیا ہے۔ ہم نے خود اپنے عادات وخصائل کو بدل دیا ہے۔ ہم نے خود اپنے قومی شعار کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ ہم نے خود اپنے علم وادب کو تلف کردیا ہے۔ ہم نے خود اپنی تاریخ کو بھلا دیا ہے اور اپنے پچھلے کارناموں پر پانی پھیر دیا ہے۔ ہم نے خود اپنے میل ومحبت کی داستان کو بھلا دیا ہے۔ ہم نے خود بجائے

خلوص و اتفاق کے ریا اور نفاق کو اپنا شیوہ قرار دیا ہے۔ ہم نے انسانی ہمدردی اور نفع رسانی خلائق کے عوض کج ادائی و خود غرضی کو اپنا وتیرہ قرار دیا ہے۔ ہم نے اپنے اکابر و اسلاف کے وضع و اطوار کو وحشیانہ سمجھا ہے۔ ہم نے دنیاوی معاملات میں تعصب و تنگ نظری کو دخل دیا ہے۔ ہم نے آپس کی سوشل اور مذہبی رواداری کو بھلا دیا ہے۔ ہم نے ایک دوسرے سے نفرت کا نام مذہب رکھا ہے۔ ہم نے اپنے اسلاف کی عالی ہمتی اور بلند نظری کو فراموش کر دیا ہے۔ ہم نے اکتساب کمال میں کاہلی برتی ہے۔ ہم نے صنعت و حرفت کو بے عزتی کا سبب گردانا ہے۔ اپنے گھر سے باہر نکلنے کو بیکار و عبث ٹھہرایا ہے۔ ورنہ ہندوستان تو جیسا شروع میں تھا اب بھی ویسا ہے۔ اب بھی وہی اس کی زمین ہے وہی اس کا آسمان ہے۔ وہی آب و ہوا ہے۔ وہی فرحت افزا منظر ہے۔ وہی شادابی ہے۔ وہی سرسبزی ہے۔ وہی دریاؤں کی روانی ہے وہی پہاڑوں کی بلندی ہے۔ وہی نباتات میں روئیدگی ہے وہی جمادات میں سنگینی ہے وہی آفتاب کی حرارت ہے۔ وہی ماہتاب کی برودت۔ وہی شفق رنگ ہے۔ وہی قوس و قزح کا ڈھنگ ہے۔ مگر صرف ایک بات کا فرق ہے۔ ہندو پہلے سے ہندو ہیں مسلمان پہلے سے مسلمان ہیں۔ ان دونوں میں جو میل و محبت تھا وہ اب غائب ہے۔ جو یگانیت تھی وہ اب بیگانیت سے بدل گئی ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ لوگ صدیوں تک ساتھ رہتے تھے اور ان کی یکجہتی اور پریم کی داستانوں سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ اب ان پریم و محبت کے سچے نقشوں کو بھی شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ملک پر الزام دینا انصاف کا خون کرنا ہے۔ ملک کا قصور نہیں ہے بلکہ ملک میں بسنے والوں کا قصور ہے۔

غیر آریا اقوام

آریا قوم کے آنے کے پہلے بھی بھارت ورش جنگلی قوموں سے بھرا ہوا نہ تھا بلکہ غیر آریا اقوام نے بھی اچھی خاصی ترقی کی تھی۔ وہ زراعت کرتے تھے بڑے بڑے شہروں میں رہتے تھے۔ لوہے کا استعمال جانتے تھے۔ بڑے بڑے قلعے اور عمارات بناتے تھے۔ کشتیاں بناتے اور دریاؤں اور سمندروں میں تجارت کی غرض سے سفر کرتے۔ ان کی زبان و تہذیب نے بہت ترقی کر لی تھی اور جب آریا ہندوستان میں آئے تو ان کی تہذیب و زبان نے آریا اقوام پر بھی بہت کچھ اثر ڈالا اور آریوں نے دراویڈین قوم کے بہت سے دیوتاؤں کو خود اپنے دیوتا مان لیا۔ ابھی سندھ میں موہنجوداڑو میں ایک بہت بڑا شہر دریافت ہوا ہے جس میں بڑے بڑے پختہ اینٹوں کے مکانات ہیں۔ سونے اور چاندی کے زیورات ملے ہیں۔ طرح طرح کے برتن پائے گئے ہیں۔ شہر میں بڑی بڑی اور چوڑی سڑکیں ہیں۔ پانی نکلنے کا (DRAINAGE) نہایت عمدہ سامان تھا۔ تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر پانچ ہزار برس کا پرانا ہے۔ عام طور پر ہندوستان کی غیر آریا اقوام سچی، وفادار اور مہربان تھیں اور انھوں نے تہذیب و شائستگی میں خاطر خواہ ترقی کی تھی۔ وہ زراعت کرنا جانتی تھیں۔ ان کے گاؤں کے انتظام نے اچھی خاصی ترقی کر لی تھی اور حقیقت یہ

ہے کہ آریوں نے اپنے گاؤں کے نظام کو غیر آریا اقوام کے گاؤں کے نظام پر مرتب کیا۔ تمام غیر آریا اقوام میں ڈریوی ڈین قوم نے سب سے زیادہ ترقی کی تھی اور انڈو۔ آریا تہذیب و تمدن کی ترقی میں اس قوم کا بڑا حصہ تھا اور غالباً ڈریوی ڈین نظام کی بنیاد پر انڈو۔ آریا اقتصادی عمارت بنائی گئی۔ آریا اور ڈریوی ڈین اقوام کے سوشل سسٹم میں فرق تھا آخر الذکر نظام میں ماں خاندان کی اصل رکن تھی حالانکہ اول الذکر نظام میں باپ خاندان کا رکن اعظم ہوا کرتا تھا۔ ڈریوی ڈین نظام کے تحت گاؤں میں عورتوں اور مردوں کے رہائش کے مکان علاحدہ علاحدہ ہوتے تھے۔ جیسا کہ آج بھی ہے۔ گاؤں کی زمین ایک شخص یا خاندان کی ملکیت نہیں ہوا کرتی تھی بلکہ وقتاً فوقتاً گاؤں کے جلسہ میں اس کی دوبارہ تقسیم ہوا کرتی تھی۔ باپ اپنے بچوں کا خاص طور پر نگران نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک وقت کے تمام بچے عورت ہوں یا مرد آپس میں بھائی بہن ہوا کرتے تھے اور آج بھی ہندوؤں میں ایک گوتر میں شادی جائز نہ ہونے کا طریقہ شاید اسی سے لیا گیا تھا۔ اس طرح ماں تمام مذہبی اور غیر مذہبی امور کا مرکز بن گئی۔ باپ عموماً گاؤں میں نہیں رہتا تھا۔ وہ دور دور تجارت کی غرض سے جاتا اور بچے اکثر اوقات اپنے باپ سے واقف بھی نہ ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہندوستان ماتا بھومی کہا جاتا ہے

پرانے اور قدیم شکاری مرد گاؤں میں رہتے اور لڑکوں کو شکار کا فن سکھلاتے اور گاؤں کے معاملات پر بحث کرتے تھے۔ یہ اقوام زیادہ تر چاول کی کاشت کرتی تھیں۔ آریا اقوام نے جو، گیہوں، سرسوں، تیسی وغیرہ عراق سے لاکر ہندوستان میں رواج دیا۔ تامل۔ تیلگو، کنارہ، ملیالم اور اوراون وغیرہ ڈریوی ڈین زبانیں ہیں۔ بلوچستان کے ایک فرقہ براہوئی نامی کی زبان ڈریوی ڈین زبانوں سے ملتی جلتی ہے۔ اس لئے بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ ڈریوی ڈین ہندوستان میں مغربی ایشیا کی طرف سے آئے تھے۔ لیکن بعضوں کا خیال ہے کہ ڈریوی ڈین اصل میں ہندوستان کے باشندے تھے اور بلوچستان کے راستہ سے مغربی ایشیا تک پھیل گئے۔ بہرحال ان کی اصل جو بھی ہو لیکن وہ شمالی اور جنوبی ہندوستان میں آریوں کے آنے سے پہلے پھیلے ہوئے تھے۔ ڈریوی ڈین اثر سنسکرت اور پراکرت زبانوں پر بھی پایا جاتا ہے۔

جب آریا آئے تو ڈریوی ڈین قوم نے ان کا بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا اور ایک ایک انچ زمین کے لئے بہادری سے لڑے اور یہ لڑائی بہت دنوں تک جاری رہی۔ یہ صرف دو قوموں کی لڑائی نہ تھی بلکہ دو طریقہ تہذیب کا مقابلہ تھا۔

ڈریوی ڈین کو اپنی ہستی کے لئے لڑنا تھا اس لئے یہ لڑائی بہت سخت تھی اور بہت دنوں تک جاری رہی رگ وید سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لڑائی انتہا درجہ کی سخت لڑائی تھی اور اس میں لاکھوں کی تعداد میں ڈریوی ڈین کام آئے اور جو بچے وہ غلام بنائے گئے آریوں نے ان کے قلعے فتح کرلئے اور ان کے مکانات برباد کر ڈالے اور آخرکار

وہی ہوا جو اس ملک میں برابر اس کے بعد بھی ہوتا آیا۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ اس ملک کے باشندے شمال و مغرب کی پہاڑیوں سے آنے والوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے آخرکار دراوڑی دکن میں جاکر آباد ہو گئے۔ وہاں ان کی تہذیب خوب پھیلی اور لوکل سلف گورنمنٹ کو انھوں نے خوب ترقی دی اور بعد میں دکن میں لوکل سلف گورنمنٹ کی ترقی میں انھیں کا اثر تھا۔

آریا قوم

آریا قوم نے اس ملک میں آکر ایک نئی پائدار اور نہایت روشن تہذیب و شائستگی کی بنیاد ڈالی۔ اُس تہذیب میں اتنی پائداری ہے کہ باوجود ہزارہا برس گذر جانے کے اس کے تمدن و کلچر کی دیواریں آج بھی اس درجہ مستحکم ہیں کہ متعدد طوفان کے تھپیڑے جو مختلف صورتوں میں ملک میں نمودار ہوتے رہے اُس کی دیواروں کو متزلزل نہ کر سکے۔ امتداد زمانہ اور حوادث ایام کے سبب اس کے چمکدار اور روشن ملمع پر زنگ آگیا ہو تو ہو لیکن تھوڑے سے صیقل کے بعد وہ کلچر آج بھی دنیا کو تہذیب و شائستگی کی شمع دکھا سکتا ہے۔

اُصول مذہب ہندوؤں کا مذہب بہت قدیم ہے۔ ہندو مذہب کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ یہ بہت سے مذہبوں کا مجموعہ ہے تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔ اس مذہب کی بنا کسی ایک شخص نے ایک وقت میں نہیں ڈالی بلکہ مختلف رشیوں و رہنماؤں نے جو مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے ہزارہا سال کے عرصہ میں بنایا ہے۔ اگر اس مذہب کے نکات اور عظمت دریافت کرنے کے لئے ہم مقدس رشیوں اور باخدا دیوتاؤں (بزرگوں) کے طریق علم و عمل پر غور کریں تو ہم کو خدا پرستی کی پوری شان اور توحید کی سچی تصویر نظر آئے گی۔ گو یہ صحیح ہے کہ آج کل بہت سے ہندو پتھر پوجتے ہیں اور جاہل لوگ آدمیوں کو خدا مانتے ہیں لیکن دراصل ہندو مذہب میں خالص توحید ہے اور ایک خدا کے علاوہ دوسرے کو ماننا گناہ ہے۔ ویدوں کی اصل تعلیم خدا کی وحدانیت کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ بہ تکرار بتاتی ہے۔

"نہیں ہے حقیقت میں کوئی معبود مگر ایک ایشور۔"

وید کا ایک اور اشلوک یہ ہے۔

"میں اس معبود حقیقی کو خوب پہچانتا ہوں جو آفرینش پر چھایا ہوا ہے جو آفتاب سے بھی کہیں شاندار ہے اور تاریکی سے دور ہے۔ صرف اُسی معبود کے جاننے سے مجھے موت پر فتح حاصل ہو سکتی ہے۔ سوائے اس کے کوئی دوسرا راستہ مکتی کا نہیں ہے۔"

بھاگوت گیتا کا ایک دوسرا اشلوک یوں ہے۔

"میں اسپرٹ (روح) ہوں اور ہر ذی روح اور غیر ذی روح کے دل کی گہرائی کے اندر بیٹھا

ہوا ہے۔ وہ اسپرٹ نہ تو کبھی پیدا ہوئی اور نہ کبھی مرے گی۔ کوئی ایسا وقت نہ تھا جبکہ وہ موجود نہ تھی۔ ابتدا و انتہا خواب ہیں۔ بغیر پیدائش کے بغیر موت کے وہ اسپرٹ نہ کبھی بدلی اور نہ بدلے گی۔ موت نے اس کو کبھی چھوا تک نہیں۔"

ایک دوسرا شلوک ہے۔

لوگ اُس ذاتِ واحد کو اندرا، مترا، ورنا، اگنی کہتے ہیں ..... لیکن وہ صرف تنہا ہے

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں کے نزدیک خدا انسان کی صورت میں جنم لیتا ہے اور اُسی کو اوتار کہتے ہیں۔ اوتار کے معنی ہیں جسم والا شخص۔ سب لوگ جیو یعنی شعور کے اوتار ہیں۔ لیکن سب کو ہم اوتار نہیں کہتے۔ جو شخص اپنے وقت میں سب سے بڑا دھرم والا ہوتا ہے اُسی کو زمانہ مابعد میں لوگ اوتار مان کر پوجتے ہیں۔ جس میں وہ نمایاں (مذہبی) زندگی اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ ہو وہی خاص اوتار ہے۔ چنانچہ آج بھی مہاتما گاندھی کو بہت سے ہندو اوتار ماننے لگے ہیں اور کچھ زمانہ کے بعد تو عام طور پر وہ اوتار مانے جائیں گے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مہاتما گاندھی ایشور ہیں یا خدا نے ان میں جنم لیا ہے بلکہ اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے نمایاں (مذہبی) انسان ہیں۔ اس مضمون کو ایک ہندو ذیل کے اشعار کے ذریعہ بہت خوبصورتی سے سمجھا سکتا ہے۔....

آدم کو خدا مت کہو آدم خدا نہیں   لیکن خدا کے نور سے آدم جدا نہیں

مردان خدا خدا نہ باشند   لیکن ز خدا جدا نہ باشند

علامہ البیرونی مشہور مسلمان عالم اور منجم محمود غزنوی کے زمانہ میں ہندوستان آیا اور برسوں تک ہندوستان میں رہ کر سنسکرت کی تعلیم حاصل کی اور ہندوؤں کے علوم سیکھے۔ بڑے بڑے پنڈت اُس کا لوہا مانتے تھے۔ البیرونی لکھتا ہے:

"ہندو گو بت پرست کہے جاتے ہیں مگر بت پرستی عوام الناس میں ہے عقلا میں نہیں ہے۔ وہ تو ایک خدا کو جس کی ابتدا اور انتہا نہیں ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ پاک ہے۔ جو اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ جو قادر مطلق ہے اور دانائے کُل ہے۔ جو زندگی بخشتا ہے۔ حکومت کرتا ہے۔ جو اپنی بادشاہی میں نرالا ہے جس کی مشابہت کسی چیز سے نہیں ہو سکتی مانتے ہیں۔"

علامہ ابوالفضل اکبر کا مشہور و معروف وزیر اور صلاح کار جس نے ہندوؤں کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل کی تھیں یوں لکھتا ہے۔

"میں نے ہندو عقلا کی صحبت بہت کی ہے اور ہر فرقہ اور ہر مذہب کے مسئلوں کو معلوم کر کے اس کتاب (آئینہ اکبری) میں اس غرض سے لکھا ہے کہ آئندہ کے عقلا افلاطون اور ارسطو اور صوفیوں کے مسائل سے اُن کا مقابلہ کر کے بلا دخل دینے تعصب کے یہ معلوم کر سکیں گے کہ حقیقت کیا چیز ہے ہندوؤں کی کتابوں میں بیش بہا اور اعلیٰ ترین ہدایتیں ہیں۔"

پھر ہندوؤں کے متعلق وہ یوں لکھتا ہے۔

"اس وطن کے باشندے (ہندو) خدا پرست۔ مہربان دل۔ غریب دوست۔ ہنس مکھ۔ کشادہ پیشانی عقلمند۔ محنت کش۔ منصف مزاج۔ صابر۔ جفاکش کارکن۔ نمک حلال۔ سچے اور وفادار ہیں سختی کے وقت ان کی اصلیت ظاہر ہوتی ہے ۔۔۔۔۔۔ سب لوگ خدا کو ایک مانتے ہیں اور اگر لوگ پتھر دھات یا لکڑی کی مورتی یا کسی اور چیز کی تعظیم کرتے ہیں اس کو بے وقوف آدمی بت پرستی جانتا ہے۔ مگر مصنف نے بہت سے عقلا سے معلوم کیا ہے کہ تصویر کو بعض خدا پرستان مقبول بارگاہ نے وسیلہ اپنی دلجمعی کا کیا ہے تاکہ ان کا دل دوسری طرف منتشر نہ ہو وہ ایک خدا کی پرستش ضروری سمجھتے ہیں۔ اپنی تمام عبادت اور عادتوں میں اسی سے مدد ڈھونڈھتے ہیں اور اسی کو سب سے برتر سمجھتے ہیں"

وید ہندوؤں کی مقدس کتابیں ہیں جو مختلف وقتوں میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سب سے اوّل رگ وید ہے۔ جس کا بڑا حصہ عبادت اور خدا کی تعریف سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن اس میں بہت سے بھجن ایسے بھی ہیں جن سے قدیم ہندوؤں کا مذہب۔ ان کی زبان۔ ان کا علم و فضل۔ ان کی طرز معاشرت اور ان کا تمدن ظاہر ہوتا ہے۔ رگ وید اور دیگر ویدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو قوم ایک تہذیب یافتہ قوم تھی۔ جن کے عادات و اطوار مہذب انسانوں جیسے تھے۔ ان کے دلوں میں خدا کا خوف اور نیکی کا ذوق تھا۔ انھوں نے بڑے بڑے کارنمایاں میدان علم و عمل میں کئے تھے۔ ہندوؤں کا فلسفہ جو ہمیشہ اس ملک کی عظمت و شان کو بڑھاتا رہے گا اور اس کی خدا پرستی اور اعلے تہذیب کو ظاہر کرتا رہے گا۔ اب بھی مہذب ملکوں کے لئے رہنمائی کا کام کرتا ہے۔ قدیم یونانیوں کے ذریعہ اور پھر عربوں کے توسط سے اہل یورپ ہندوؤں کے کارناموں سے ہمیشہ متمتع ہوتے رہے اور اب تک ہو رہے ہیں۔

سخاوت۔ مروت۔ شرافت اور رواداری خاص ہندوؤں کا ورثہ مانا گیا ہے۔ ان کی شجاعت و مروّت اور شرافت کی یہاں ایک مثال بیان کی جاتی ہے اس کو غور سے سنو اور دیکھو کہ پچھلے ہندو اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی کیسا برتاؤ کرتے تھے۔

مہابھارت کی لڑائی میں جب دونوں طرف سے لشکر آراستہ ہو کر باہر آئے اور فوجوں کی صف بندی ہو چکی تو یکایک یدھشٹر اور ارجن صف سے باہر نکلے اور اپنے اپنے ہتھیار اتار کر پھینک دئے اور حریف کے لشکر کی طرف بڑھے۔ تمام لوگ متحیر تھے اور ان کی سپاہ یہ سمجھی کہ شاید یہ لڑنا نہیں چاہتے۔ حریف یہ سمجھا کہ یہ لوگ ہماری جرّار فوج دیکھ کر ڈر گئے اور صلح کے لئے آرہے ہیں۔

طرفین کے لوگ دم بخود تھے۔ یہ دونوں بھیشم پتاما اور درون اچاریہ جو دشمن کی فوج کے سپہ سالار تھے کے خیمہ میں گئے اور ان دونوں کے قدموں پر سر رکھ کر یوں بولے۔ "اے بزرگ دادا اے استاد۔ ہم آپ کے سکھائے ناچیز شاگرد ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم کو آپ کے سامنے تلوار کھینچ کر کھڑا ہونا پڑا اور آپ کو بھی مجبوراً ہم چھوٹوں کے خلاف تلوار

اُٹھانی پڑی۔ ہم کو اس کی شکایت نہیں ہے کہ آپ جیسے اُستاد ہماری تعلیم دینے والے ہمارے مقابلہ میں لڑنے پر آمادہ ہوئے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے حریف دریودھن سے آپ قول ہار چکے ہیں مگر ہم بھی مجبور ہو گئے ہیں۔ ہم نے صلح کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور نہ کوئی کسر چھوڑی۔ اب جب کہ لڑائی سر پر آگئی تو ہمارا فرض ہے کہ پہلے آپ کو سلام کریں اور آپ سے لڑائی شروع کرنے کی اجازت مانگیں۔ اگر دوسرے غنیم کا مقابلہ ہوتا تب بھی ہم آپ کی اجازت لئے بغیر میدان میں نہ نکلتے اور اب اگر خود آپ ہی سے جنگ کرنی ہے تو بھی ہم آپ ہی سے اجازت مانگنے آئے ہیں۔ جب تک آپ اجازت نہ دیں گے ہماری تلوار میان سے باہر نہ نکلے گی۔"

بھیشم پتامہ اور درون اچاریہ پر اس سعادتمندی کا بڑا اثر ہوا۔ انھوں نے ان کو اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے بہت سی دعائیں دیں اور کہا کہ "جاؤ ہم تم کو دل سے اجازت دیتے ہیں۔ تمھاری فتح تو اسی وقت ہوگئی جب تم ایسی نیک نیتی، ایسی شرافت، ایسی بہادری اور ایسی سعادتمندی سے اپنے دشمنوں پر بے ہتھیار چلے آئے۔"

آج یدھشٹر اور ارجن موجود نہیں ہیں۔ آج دریودھن کی خاک بھی دنیا سے ناپید ہے۔ لیکن پسران پانڈو کا یہ کارنامہ قیامت تک موجود رہے گا اور ہندو قوم کے برتر خصائل کی گواہی نسلاً بعد نسلٍ دیتا رہے گا کہ اس قوم کے حکمران عداوت اور دشمنی کی حالت میں بھی ایسے سیر چشم اور شریفانہ وضعداری کے پابند ہوتے تھے۔ اس کے بعد دنیا کی مشہور لڑائی شروع ہوئی جس کا نتیجہ تم کو معلوم ہے۔

اُپنشد میں ہے کہ :۔

"خدا سچائی کا نام ہے۔ خدا عقل کا نام ہے۔ خدا پاکی کا نام ہے۔ خدا لامتناہی شے کا نام ہے خدا ایکتا کا نام ہے۔ خدا محبت کا نام ہے۔"

محبت کا لفظ آخر میں آیا ہے اور اس سے اس پر زور دینا مقصود ہے۔

"محبت ہی سے ہم ہستی میں آئے۔ محبت ہی سے ہماری ہستی ہے۔ محبت ہی کی طرف ہم بڑھ رہے ہیں اور محبت ہی میں داخل ہو جاتے ہیں۔"

مُکتی (نجات) کا یہی راستہ بتلایا گیا ہے۔ ہندوؤں کا دھرم ہے کہ نفرت کو مٹانے کا ذریعہ نفرت نہیں ہے بلکہ نفرت محبت سے مٹتی ہے۔ ہندو مذہب کا کوئی ڈفینیشن نہیں ہے۔ اس کے خدا کے ہزاروں نام ہیں۔ وہ خدا کی لامحدود صفتوں کو ہزاروں ناموں سے یاد کرتا ہے۔ خدا کی جمالی صفت اس کے دل کو مسحور کرتی ہے۔ وہ خدا کی محبت میں مبہوت ہو جاتا ہے یہاں تک کہ خدا کا کوئی خوف اس کے دل میں باقی نہیں رہتا اور وہ یوں چلا اُٹھتا ہے۔

"جیسا کہ زمین و آسمان خوف نہیں کھاتے اور اس سے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اسی طرح میری آتما تجھ سے (او معبود) خوف زدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ صبح و شام خوف زدہ نہیں ہوتے اور کوئی

نقصان نہیں اُٹھاتے اُسی طرح میری آتما (روح) تجھ سے خوف نہیں کھاتی۔ جیسا کہ آفتاب و ماہتاب
خوف زدہ نہیں ہیں اور اس کارن کوئی نقصان نہیں اُٹھاتے اسی طرح (اے خدا) میری آتما تجھ سے
خوف نہیں کرتی۔"

ہزاروں طریقوں سے اُس کا خدا اس کے پاس آتا ہے جب کہ خدا ایک ہندو کے پاس تمام مصائب و تکالیف کو مٹا کر آتا ہے تو وہ اُسے درگا۔ درگا ماتا کے نام سے پکارتا ہے جب کہ وہ اس کے گناہوں کو معاف کرتا ہے تو وہ اُسے ہری کہتا ہے۔ اور جب کہ وہ اس کے پاس علم کی روشنی میں آتا ہے تو وہ اسے سوراسوتی کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ہندو کسی ایک خاص کتاب کو اپنا نجات دہندہ نہیں سمجھتا۔ بہت سی کتابیں ہیں جن سے اس کا نصب العین (اوپنشد) ظاہر کیا گیا ہے لیکن صرف کتابوں ہی نے اُس کا دل کبھی پورے طور پر مسخر نہیں کیا۔ اُس کا مذہب اس کو رواداری کا مجسمہ بنانا چاہتا ہے۔ اس کا مذہب اس کو سمجھاتا ہے کہ وہ اس کی پرواہ نہ کرے کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان۔ کون عیسائی ہے اور کون پارسی۔ کون یہودی ہے اور کون بُدھ۔ سب خدا کی مخلوق ہیں اور ہر مذہب والے کی نجات اُسی کے مذہب کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ ایک سچا ہندو کسی مذہب کو بُرا نہیں کہتا اور نہ وہ اپنے مذہب کو سب سے اچھا بتلاتا ہے۔ ایک بار وشنو کے ایک پوجاری کے دل میں شیوا کے پوجاری کی طرف سے نفرت کے جذبات پیدا ہوئے ہیں۔ جب وہ وشنو مورتی کی پوجا میں مشغول ہوا تو دیکھتا ہے کہ مورتی کا چہرہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے اور ایک طرف وشنو کا چہرہ ہے اور دوسری طرف شیوا کا۔ اور دونوں چہرے مثل ایک چہرہ کے متعصب پوجاری کی طرف دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ یہ قصہ اس مسئلہ پر خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس کا مطلب یہی تعلیم دینا ہے کہ نجات کے بہت سے راستے ہیں اور کسی راستہ کو بُرا مت کہو۔

ایک ہندو اپنی روح کو غور و خوض سے علم کی روشنی میں عبادت اور ڈسپلن (سادھنا) کے ذریعہ نجات دلانا چاہتا ہے۔

ہندو دھرم سچائی کو سب پر مقدم اور سب سے بالاتر سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک آفتاب کی روشنی۔ ہوا کا جھونکا۔ آب باراں اور خدا سب کے لئے ہے اور سب کا ہے۔ بھگوت گیتا کا یہ مشہور و معروف اشلوک دنیا کو یہی سبق سمجھاتا ہے۔ خدا کہتا ہے۔

"جو کوئی بھی میرے پاس کسی راستہ سے چل کر آتا ہے میں اس کے پاس اُسی راستہ سے
پہنچتا ہوں۔ تمام لوگ مختلف راستوں سے میرے پاس پہنچنے کی کوشش میں ہیں اور وہ سب راستے
میرے ہی ہیں۔"

گیتا کے اس اشارہ کے بعد کون سچا ہندو کسی دوسرے مذہب کو بُرا کہہ سکتا ہے۔ یہ اشلوک گیتا کا مغز ہے اور گیتا کا سنٹرل خیال ظاہر کرتا ہے۔ ہندو اپنے خدا کو جگن ناتھ۔ جگن ناتھ کے نام سے پکارتا ہے۔ یعنی دنیا کا چاہنے

والا دنیا بھر کی بھلائی کرنے والا۔ وہ اس معبود حقیقی کو صرف اپنا یا اپنے ملک کا چاہنے والا نہیں سمجھتا۔ ہندوؤں کے روزانہ فرائض کا لُبِّ لُباب یہ ہے۔

معبود حقیقی کی عبادت۔ دیوتاؤں اور رشیوں کی عزت و منزلت۔ والدین کی قدر و عزت۔ دوسرے انسان کے ساتھ فیاضانہ نیکی کرنا۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا۔ پیاسوں کو پانی پلانا۔ جانوروں کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرنا۔ ویدیں خدا اور انسان کی محبت بلکہ ہر ذی روح کی محبت پر دلالت کرتی ہیں۔

"اپنے ایشور اور اپنے بزرگوں سے جن میں والد بھی شامل ہیں محبت کرو۔"

وید جن کے متعلق ہندوؤں کا اعتقاد ہے کہ وہ ازلی (قدیم) ہیں گو تعداد میں چار تسلیم کئے گئے ہیں مگر ہندو علما جو ہیں وید کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں۔ اس کے بیشتر منتر دہی ہیں جو رگ وید میں ہیں ہر ایک وید دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ان میں سے پہلے حصہ میں مناجات کے گیت اور دعائیں ہیں۔ دوسرے حصہ میں ہندو مذہب کے وہ مذہبی فرائض سے آگاہ کرتے ہیں علاوہ اس کے ان میں فلسفہ الٰہیات کے متعلق مباحث بھی پائے جاتے ہیں۔ ویدوں کی اصل تعلیم وحدانیت کو ظاہر کرتی ہے۔ علاوہ ازیں چاروں ویدوں میں اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔

"کوئی سچائی نہیں ہے لیکن صرف اُس معبود حقیقی کی جو سب پر غالب ہے کُل کائنات کا ... ہے۔ اور جس کی رحمت کا نتیجہ کائنات کا وجود عمل میں آیا۔"

ہندوؤں کا مذہب دراصل خدائے تعالیٰ (پرمیشر) کی توحید پر مبنی ہے۔ ان کے تمام فرقوں کے علما کا اتفاق ذیل کے اصول پر ہے:-

(۱) خدا کی ذات پاک ایک ہے (ایکم ایوادوی دتیم) جو وحدہٗ لاشریک لہٗ کا ٹھیک ترجمہ ہے
(۲) البتہ ذات باری تعالیٰ کے صفات بے حد و بے شمار ہیں۔ بعض رشیوں (اولیا و اتقیا) نے صفات باری (دیوتا) کا شمار تینتیس لاکھ تک کیا ہے۔
(۳) لیکن ان میں سے تین صفات بڑے جامع صفات ہیں جو موجودات عالم (لوکم) کے قیام و نظام کے باعث ہیں۔

(الف) خالق (برھما) پیدا کرنے والا۔
(ب) حافظ (وشنو) حفاظت کرنے والا۔ بچانے والا۔
(ج) مالک (شیو) مارنے جلانے والا۔ سزا و جزا دینے والا۔

(۴) ان تینوں صفات باری تعالیٰ کا ظہور ایک ایک خاص قوت کے ذریعہ ہوا ہے اور ہوتا ہے۔
(الف) خالق (برھما) نے اپنی حکمت (سرسوتی) سے دنیا کو پیدا کیا ہے یعنے خالق میں حکمت مستور ہے
(ب) حافظ (وشنو) اپنی رحمت (لچھمی) کے ذریعہ سے دنیا کا محافظ ہے یعنے حافظ کی صفت ...

حمت موجود ہے۔

(ج) مالک (شیو) اپنی قدرت (پاروتی) سے دنیا میں سزا و جزا کا مختار ہے۔ مارتا جلاتا ہے یعنے مالک کی صفت قضا و قدر کا ظہور ہے۔

یعنے خدائے تعالیٰ (خالق + حکیم) و (حافظ + رحیم) و (مالک + قادر) ہے۔

یا یوں کہو کہ

پرمیشر (برہما + سرسوتی) و (وشنو + لچھمی) و (شیو + پاروتی)۔

دوسرے اصول (یعنے تینوں صفات باری کا ظہور ایک ایک خاص قوت کے ذریعہ ہوا ہے) علمائے ہنود نے ایسے استعارات و تشبیہات کے پیرایہ میں بیان کئے ہیں جن سے عام طور پر یہ غلط فہمی رواج پا گئی ہے کہ ہندو تین خدا (برہما۔ وشنو اور شیو) کے قائل ہیں اور ہر ایک خدا کے لئے انھوں نے ایک زوجہ (سرسوتی۔ لچھمی و پاروتی) مقرر کر دی ہے۔ اور جس طرح سے علمائے ہنود نے صفات باری تعالیٰ کو علٰحدہ علٰحدہ مشخص اور موسوم کیا ہے اس سے بھی عام طور پر یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ گویا ہنود ۳۳ لاکھ خداؤں کو مانتے ہیں لیکن یہ غلط فہمی کسی طور پر بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اصل عقیدہ جس کی نسبت تمام ہندو علما و فضلا متفق ہیں وہ فقط اسی قدر ہے کہ خدا کی ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ اس کے تین بڑے جامع صفات ہیں جو موجودات عالم کے بانی مبانی ہیں اور ہر ایک صفت کے ظہور کا طریقہ جو اس دنیا میں انسان کو محسوس ہوتا اس سے پایا جاتا ہے کہ خدا حکمت والا۔ خالق و رحم والا حافظ۔ قدرت والا مالک ہے یعنے دوسرے الفاظ میں خدا کے لقب لی حکیم۔ حافظ۔ رحیم۔ مالک۔ مقتدر ہے۔

یہاں تک تو فلسفہ الٰہیات ہنود ہیں، ان کے تمام علما کا اتفاق ہے۔ مگر اس کے بعد اکثر مسائل آلہیہ کی نسبت ان میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ جس نے ہنود کے مختلف فرقے پیدا کر دئے ہیں۔ ہر فرقہ ہر مسئلہ کو اپنے طور پر حل کرتا ہے اور دوسرے طریقوں کو رد کرتا ہے۔ یہ مسائل کب اور کس لئے معرض بحث میں آئے اس کی تصریح ہندوؤں کی تمدنی و اخلاقی تاریخ پر نظر ڈالنے پر معلوم ہو سکتی ہے۔ خدائے تعالیٰ سے موجودات عالم (لوگم) کو کیا اور کیسا تعلق ہے؟ علمائے ہنود نے (ایکم ایوا ادی ویتم) کا لفظی ترجمہ کرکے خدا اور دنیا کے باہمی تعلق کے مسئلہ کو تین طور سے طے کیا ہے۔

(۱) سری شنکر اچاریہ نے اس کی تعبیر یوں کی ہے۔

(ایکم ایوا ادی ویتم)۔ خدا ایک ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔ سوا خدا کے اور کوئی موجود نہیں ہے۔ لہذا جو موجود ہے وہ خدا ہی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے۔ عالم یا دنیا اگر موجود ہے تو وہ خدا ہی ہے اور کوئی نہیں۔ خدا عالم ہے اور عالم خدا ہے۔ خدا سے

عالم خدا نہیں اور عالم سے خدا جدا نہیں۔

سری شنکر اچاریہ اور ان کے معتقدین وحدت الوجود کے قائل ہیں یعنے خدا کا موجودات عالم سے جدا ہونا نہیں مانتے یہ لوگ نہ صرف ہمہ اوست کہتے ہیں بلکہ ہرچہ ہست اوست کہتے ہیں۔

(۲) پھر سری رامانج اچاریہ نے یوں تعبیر کی ہے۔ (ایکم ایوادی وتیم)

خدا الگ بغیر دوسرے کے ہے۔ دنیا کے سوا اگر کوئی دوسرا موجود ہے تو فقط اسی کا ظہور ہے۔ اور کوئی نہیں لہذا جو موجود ہے اور جو ہم کو محسوس ہوتا ہے وہ خدا نہیں لیکن خدا سے جدا بھی نہیں دنیا اور خدا میں باہمی تعلق ایسا ہی ہے جیسا کہ قالب اور روح میں ہے۔ روح سے قالب زندہ ہے اور نشوونما پاتا ہے۔ پھر بھی قالب جدا ہے اور روح الگ ہے۔ اگرچہ ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ اسی طرح خدا اور موجودات عالم یا دنیا ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اگرچہ خدا بغیر دنیا نہیں اور دنیا بغیر خدا نہیں مگر ہم دنیا کو خدا نہیں کہہ سکتے اور نہ خدا کو دنیا کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح روح سے زندہ جسم خالی نہیں اسی طرح یہ زندہ موجودات عالم خدا سے خالی نہیں ہیں۔ خدا دنیا میں مانند روح کے موجود ہے۔ یہ فرقہ خدا کا دنیا سے برتر ہونا مانتا ہے اگرچہ خدا کو دنیا سے بالکل جدا نہیں کرتا۔ یہ ہمہ اوست و ہمہ از اوست دونوں مقولوں کے معنے ایک سمجھتا ہے

(۳) سری مادھواچاریہ نے یوں تعبیر کی ہے۔ (ایکم ایوادی وتیم)۔

خدا ایک ہے دوسرا خدا نہیں ہے۔ خدا کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ موجودات عالم جس کو ہم دنیا کہتے ہیں وہ خدا کے ساتھ کسی طرح شریک نہیں بلکہ خدا سے بالکل جدا مخلوق ہیں۔ خدا الگ ہے اور دنیا الگ ہے۔ ان دونوں میں صرف خالق و مخلوق کا تعلق ہے اور بس کچھ نہیں یہ فرقہ وحدت الوجود کا قائل نہیں ہے۔ دنیا سے خدا کی ذات بالکل جدا اور برتر سمجھتے ہیں۔ ہمہ اوست کے منکر ہیں۔ فقط از اوست کے قائل ہیں۔ اس کے بعد دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ خدا کی تمام صفات ہیں (برہما۔ وشنو وشیو) یہ ان صفات کے جو ان کے لازم و ملزوم ہیں (سرسوتی۔ لچھمی پاروتی) ان میں کون سی صفت سب سے بڑی ہے یا سب سے بڑھ کر انسان کے لیئے قابل پرستش ہے۔

اگرچہ مان لیا جاتا ہے کہ فقط خدائے تعالیٰ (پرمیشر) کی ذات ہے اور قابل پرستش ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ خدا کی ذات جو انسان کے فہم و خیال سے بالاتر ہے اس کی پرستش انسان ضعیف العقل سے نہیں ہوسکتی۔ انسان کے لئے پرستش کے واسطے کوئی ایسی شے یا کوئی ایسا مفہوم ہونا چاہیے جو اس کی عقل و فہم میں آسکتا ہو۔ اس لئے خدا کے صفات جس کا ظہور موجودات عالم میں ہے انھیں کی پرستش انسان کرسکتا ہے اور تمام صفات باری تعالیٰ کی یکساں پرستش بھی انسان کے امکان سے

باہر ہے۔ لہذا کسی ایک صفت باری کی پرستش ہی انسان سے اچھی طرح ہوسکتی ہے۔

خدائے تعالیٰ کی لکھو کھا صفات میں سے فقط ایک صفت کی پرستش ہی انسان کرسکتا ہے اور کسی ایک صفت کی پرستش انسان کے واسطے دراصل خدا کی ذات کی پرستش ہے۔ کیونکہ صفت اس کے موصوف سے جدا نہیں ہے اور نہ جدا ہوسکتی ہے لہذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی تین جامع صفات میں سے کون سی صفت ہے جو دنیا میں اچھی طرح ظاہر ہے۔ جس کی پرستش انسان اپنے دل وجان سے کرکے خدائے تعالیٰ کا قرب حاصل کرسکتا ہے جو پرستش کا اصل مقصود ہے۔

(۱) سائیو فرقہ والے مالک و مقتدر (شیو) کی صفات کو سب سے بہتر پرستش کے قابل سمجھتے ہیں۔

(۲) ولیشنو فرقہ والے حافظ رحیم (وشنو) کی صفات کو سب سے بہتر پرستش کے قابل سمجھتے ہیں۔

(۳) نگائیست فرقہ خالق و حکیم (برہما) کے صفات کی پرستش کو دوسرے صفات کی پرستش سے بہتر جانتے ہیں۔

مقدس وید ہم کو تبلاتے ہیں کہ انسان میں دو قسم کی روحیں ہیں۔ ایک روح حیوانی جس کی مدد سے یہ جسم حرکت کرتا ہے۔ دوسری روح جیسی یا نفس ناطقہ اس سے غضب۔ شہوت فلاح و صلاح کا تعلق ہے۔ اور اسی سے خصائل ذمیمہ اور اعمال قبیحہ کا صدور ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ روحیں خود مختار ہوتی ہیں لیکن ان کا تعلق ذات باری تعالیٰ سے ہے جو کل اشیاء میں جاری و ساری ہے۔ یہ روح حیوانی ہے جو انسان کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ دور یا دور تک اپنے جرائم و معاصی کے اندازہ کے موافق مصیبتیں برداشت کیا کرتی ہے اور پھر اسی طرح آدمیوں میں اور جانوروں میں منتقل ہوتی رہتی ہے یہاں تک کہ آخر ایذا اٹھاتے اٹھاتے اور ذلتیں سہتے سہتے پاک وصاف ہوجاتی ہے۔ پھر وہ اپنے پاکیزہ معاملات سے ربط و اتحاد پاتی ہے اور با دوامی خوشی حاصل کرتی ہے۔ بہرکیف خدا نے انسان کو خود اپنی سمجھ بوجھ سے سچا ناصح اور صحیح و غلط کے درمیان ایک قطعی فرق کرنے والا بنایا ہے۔ اسی طرح خوشی۔ رنج۔ تکلیف اور دیگر متضاد حالتوں کے مابین بھی امتیاز رکھا ہے۔

ویدوں کے بعد پھر پران ہیں۔ پرانوں کی تعداد اٹھارہ ہے۔ ان کو ویدوں کے مدون ویاس جی کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔ ان میں الہیات۔ تحقیق عالم۔ فلسفیانہ حقائق۔ مذہبی رسوم۔ تاریخی واقعات اور دیوتاؤں اور رشیوں کے معاملات سے تعلق رکھنے والے بے شمار افسانے بیان کئے گئے ہیں۔ پرانوں کے اعتقاد کی رو سے عالم و خالق ایک ہی شے قرار دئے گئے ہیں۔ ویدوں کی تعلیمات کا لُبِ لباب علم یا گیان (KNOWLE) اور پرانوں کی تعلیمات کا لُب لباب بھگتی یا یقین و محبت (FAITH OR LOVE) ہے۔

یہ ہے ہندوؤں کا اصل مذہب جس کا نہایت مختصر ذکر یہاں کیا گیا ہے۔ اختلافات اور فروعات کو

چھوڑ کر صرف اصل اصول کا ایک نہایت ہی مختصر خاکہ کھینچا گیا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بُت پرستی ہندوؤں میں کیونکر آئی۔ یہ بات صاف ہے کہ ویدوں کے زمانے میں تو مورتی پوجا کا پتہ ہی نہ تھا۔ لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ جب بُدھ مت اور ہندو دھرم میں جنگ جاری تھی اور برہمن اپنا دوبارہ اثر جمانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے تو منجملہ اور کوششوں کے انھوں نے مورتی پوجا بھی بُدھ مت سے لے کر اپنے دھرم میں جاری کیا۔ مورتی پوجا ہر زمانہ میں اور ہر ملک میں ہمیشہ سے انسانوں کے دلوں کو مسخر کرتا رہا ہے۔ اور ہمیشہ سے انسان کا دل محبت پرستی کی طرف رجوع اور مائل ہوتا رہا ہے۔ مصر، چین اور یونان غرضکہ تمام قدیم مہذب ممالک میں بُت پرستی رائج تھی۔ برہمنوں نے دیکھا کہ اگر وہ صرف خشک منطقی دلائل سے لوگوں کو اپنی طرف رجوع کرتے ہیں تو بُدھ مت کے مقابلہ میں پوری کامیابی نہ ہوگی غالباً اس لئے انھوں نے بُت پرستی کا رواج اپنے یہاں بھی دے دیا۔ رتھ جاترا بھی شاید ہندوؤں نے بُدھ مت سے لیا ہے۔ بُت پرست قوموں کی زندگی عموماً شاعرانہ ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کی طرز زندگی بھی شاعرانہ طرز میں ڈھل گئی۔ اور قدیم ہندوؤں کے حالات زندگی، ان کے آپس کے برتاؤ، رشیوں کے حالات وغیرہ جب ایک جذبہ والا شخص پڑھتا ہے تو ان ساری چیزوں میں وہ ایک ایسی پاکیزہ، ایسی نازک اور پُراثر اور دلکش شاعری محسوس کرتا ہے جس کے اثر اور تخیل سے اُس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

ہندوؤں کو شروع سے محبت کا سبق دیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پانچ سو برس پہلے ہندو عقلا نے یہ بتلایا تھا۔

"کہ نفرت کبھی بھی نفرت سے نہیں مٹتی۔ نفرت صرف محبت سے مٹتی اور ختم ہوتی ہے۔ یہ اُس کی فطرت ہے"

"ہم کو خوش و خرم رہنا چاہئے اور جو لوگ ہم سے نفرت کرتے ہیں اُن سے ہرگز نفرت نہ کرنا چاہئے"

"غصہ پر محبت کے ذریعہ فتح پانا چاہئے بُرائی پر نیکی کے ذریعہ فتح حاصل کرنا چاہئے لالچ پر سخاوت سے اور جھوٹ پر سچ کے ذریعہ فتح حاصل کرنا چاہئے"

یہاں ایک قصہ کا بیان کرنا بے محل نہ ہوگا۔ کاشی میں برھمدتا نامی ایک راجہ تھا۔ وہ بہت امیر، بہت دولت مند اور بہت طاقتور تھا۔ اس کے پاس بڑی جرّار فوج تھی اور وہ ایک بڑی سلطنت کا مالک تھا۔ لیکن اس کے خلاف کوسالا کا راجہ جس کا نام دگھیتی تھا بہت کمزور تھا۔ اس کے پاس نہ تو بہت مال و خزانہ تھا اور نہ بڑی فوج تھی۔ اس کی سلطنت بھی بہت چھوٹی تھی۔ برھمدتا نے دگھیتی کے ملک پر قبضہ

کرلیا اور اس کو گھر سے نکال دیا۔ دگھیتی اپنی بیوی اور اپنے چھوٹے بچے دگھاؤ کے ساتھ بھیس بدل کر بنارس میں ایک لوہار کے گھر میں رہنے لگا۔ کچھ عرصہ بعد راجہ برہمدت کو اس کی خبر ہوگئی اور اس نے بیچارے دگھیتی اور اس کی بیوی کو پکڑوا کر قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ ان کا لڑکا دگھاؤ اس وقت بنارس سے باہر تھا لیکن اپنے باپ کے قتل کے حکم کی خبر پاکر وہ قتل گاہ پر پہنچا۔ دگھیتی نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور یہ نصیحت جو انسانی عفو سے لبریز ہوئی ہے کی۔

"نفرت سے حد بات۔ اے میرے عزیز دگھاؤ نفرت سے نہیں بجھتی بلکہ محبت نفرت کی آگ کو بجھاتی ہے"

پھر نوجوان دگھاؤ جنگل میں گیا اور وہاں مدت تک روتا رہا اور پھر کچھ مدت کے بعد واپس شہر میں آیا اور راجہ کے فیل خانہ میں نوکری کرلی۔ علی الصباح وہ نہایت موثر اور دل کو لبھانے والی آواز میں بانسری بجانے لگا۔ راجہ نے ایسی دلکش آواز سن کر دریافت کیا اور دگھاؤ اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ راجہ نے اس کو خاص اپنے پاس رکھ لیا اور وہ راجہ کی خدمت کرنے لگا۔ کچھ دن بعد راجہ ایک دن شکار کو گیا اور اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہوگیا صرف دگھاؤ اس کے ساتھ تھا۔ راجہ بہت تھکا ہوا تھا اور وہ سو گیا۔ دگھاؤ نے سوچا کہ اپنے والدین کے ناحق خون کا بدلہ لینے کا یہ اچھا وقت ہے۔ اس نے فوراً تلوار نکال لیا۔ اور راجہ پر وار کرنا ہی چاہتا تھا کہ اس کو اپنے باپ کی آخری نصیحت یاد آگئی اور اس نے تلوار پھینک دیا۔ راجہ جاگ گیا اور اس نے دگھاؤ سے ماجرا پوچھا۔ دگھاؤ نے سارا قصہ سچ سچ کہہ دیا۔ اس پر راجہ نے اسے سینہ سے لگالیا اور اپنے قصور کی معافی مانگی۔ دگھاؤ کے باپ کی سلطنت اسے واپس کردی اور اپنی لڑکی سے اس کی شادی کردی۔ اس طرح کے قصوں سے رشی لوگ ہندوؤں کو اخلاقی تعلیم دیا کرتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ برتاؤ اور محبت کے متعلق یہ تعلیم دی گئی ہے۔

(۱) اپنے دوستوں کو تحفہ دیا کرو اس سے محبت زیادہ ہوتی ہے۔
(۲) اپنے دوستوں کے ساتھ نرم و میٹھے لہجہ میں گفتگو کیا کرو۔
(۳) ان کے فائدہ پر ہمیشہ نظر رکھو۔
(۴) ان کے ساتھ برابری کا برتاؤ کیا کرو اور اپنے فائدہ پر ان کے فوائد کو ترجیح دیا کرو۔
(۵) اگر تم خوش حال ہو تو اپنی مرفہ الحالی میں ان کو شریک کرو۔
(۶) جب کہ وہ غافل ہوں ان کی خبرگیری کرو۔
(۷) خطرہ کے موقع پر ان کو پناہ دو۔
(۸) مصیبت کے وقت میں ان کی اور زیادہ خاطر کرو۔

مصنف نے حسب ذیل مقالہ انگریزی میں تحریر فرمایا ہے "اسلامی کلچر" پر سیر حاصل بحث ہونے کی وجہ سے کسی قدر طولانی ہو گیا ہے۔ فی الحال اس کے پہلے باب کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے۔ بقیہ ابواب آئندہ ماہانہ نمبروں میں مسلسل پیش کیے جائیں گے

(ایڈیٹر)

کی عام سرگرمیوں کا مطالعہ ہے۔ یہی وہ مفہوم ہے جس کی بنا پر تہذیب قدیم، تہذیب متوسط، تہذیب جدید وغیرہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ اس صورت میں کلچر (تہذیب) کی اصطلاح سولائزیشن (تمدن) کی بہ نسبت کہیں زیادہ وسیع ہو کر اس مفہوم سے بھی بالکل ہی مختلف ہے جسے ہم پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس لئے ایک ہی سا لفظ کلچر کا انسانی پہلو لے لیتے ہیں جس نتیجے پر پہنچنے کے بعد ہم کلچر کی تعریف کرنا چاہتے۔ کہتے ہیں کہ بیکن (جدید مفہوم میں اس اصطلاح کا موجد)[۸] کلچر دراصل روح انسانی کا ایک عالم ہے۔ انسانیت کی وہ کوشش ہے جو اپنے اندرونی اور خودداری وجود کو قائم رکھتی یا اظہار کرتی ہے۔ اور اسی لئے وہ اس کو CULT. DIMIN کہتا ہے وہ اسے "تعمیر خودی" کا مفہوم دیتا ہے۔

ڈیوئی کے فلسفی حلقہ نے کلچر کے متعلق بہت کچھ کہا ہے اس کے نزدیک کلچر کا تصور یہ ہے کہ وہ آدمی کی ذہنی اور اخلاقی ... ہے۔ وہ اسے ضمیر کی آزادی اور RAATIANISM کا مناسب کہتا ہے[9] بنا بریں اس کی نظر میں انسانی تہذیب روح انسانی کی مکمل آزادی کی سمت ایک جھکاؤ ہے۔ کلایو بل بحث تمدن میں بھی کلچر کے ... دیے گئے ہیں۔ اس کی ابتدا میں ایک کامیاب تمدن کی خصوصیات یہ ہیں اندازہ کی ساخت، معقولیت کی فرمانروائی، خیالات کو ان کے صحیح توازن کے ساتھ سمجھنے کی صلاحیت اور دماغی اشیاء سے محظوظ ہونے کی قابلیت۔

میتھیو آرنلڈ نے اپنی کتاب "کلچر اور انارکی" میں کلچر کے جدید ترین تصور کو نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے وہ کہتا ہے کہ کلچر کے اصل اصول چار ہیں (۱) کلچر میں بہ نسبت حیوانیت کے انسانیت کی داخلی خصوصیات کہیں زیادہ ہیں (۲) وہ بجائے منجمد اور ساکن ہونے کے متحرک اور ارتقائی چیز ہے (۳) وہ ایک ایسی طاقت ہے جو بنی نوع انسان کو فرد کی طرح آگے قدم بڑھانے پر مجبور کرتی ہے (۴) اس میں بجائے کسی ایک مخصوص طاقت کے تمام طاقتوں میں اضافہ کے امکانات پائے جاتے ہیں۔ نٹشے کا نقطۂ نظر کلچر کے متعلق تقریباً وہی ہے جو شپنگلر کے متعلق عام اعتقاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تہذیب کے حقیقی زاویۂ نظر سے دیکھا جائے تو عہد الزبتھ کا انگلستان آج کے انگلستان سے زیادہ عظیم الشان تھا۔ اس کے نزدیک فرانسیسی تہذیب کی بلندی، تہذیب یونان کی آخری اونچائی یعنی HELLINISM تھی۔ اور نشاۃ ثانیہ کا حقیقی مفہوم یہ تھا کہ اس کی بدولت ہیلنزم میں پھر سے جان آگئی۔ کلایو بل اپنی بحث تمدن میں اس پر مصر ہے کہ محض تعریف تو بالکل بے نتیجہ رہے گی۔ ہاں اس نے چار نظریں سامنے رکھی ہیں جنہیں وہ "کامل نظریے" کہتا ہے اس کا خیال ہے کہ اعلیٰ تمدن پورے طور پر سمجھ میں آسکتا ہے اگر چار ادوار کو ذرا غور سے دیکھا جائے۔

(۱) ایتھنز PERIELES کا دور (۲) شہنشاہیت روما کی پہلی اور دوسری صدیاں (۳) پندرھویں اور سولھویں صدی کا اٹلی (۴) اور سترھویں صدی سے آج تک کا فرانس اس کے تجزیہ سے ہم اس نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں کہ "تہذیب حاضر" نے نہ صرف مذکورہ سرچشموں سے فیض حاصل کیا ہے بلکہ اسلامی تہذیب سے بھی خوشہ چینی کی ہے۔

اب ہم یہ دکھائیں گے کہ تہذیب عمل کی سرگرمی، مذہب اور انسانیت، تہذیب اور مسرت، تہذیب و مذہب میں کیا باہمی

---

۷ سی، جی شا - انسائیکلوپیڈیا -- مذہب و اخلاق۔
۸ بیکن - فوائد علم۔
9. کلایو بل - تمدن۔

(HOUSMAN) نے اپنے قابلِ ذکر الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "اور تمنائیں تو سیر ہو کر ختم ہو جاتی ہیں لیکن تمنائے علم کبھی سیر ہی نہیں ہوتی۔ جن اشیاء کی مقدار ہمیں معلوم کرنی ہے وہ لا متناہی ہیں یہ داستان جتنا بھی ہم پڑھتے چلے جائیں مگر ختم نہیں ہوگی۔ جب تک انسانی دماغ کی رفتار وہی رہے گی جواب ہے اس وقت تک وہ کائنات کی تمام غیر معلوم چیزوں کی طرف بڑھنے میں لطف پاتا رہے گا۔ اور شجر علم ہمیشہ یونہی رہے گا جیسا وہ بالکل ابتدا میں تھا کہ اس سے صرف کسی ایک کے عالم و دانا بننے کی آرزو کی جا سکے[15]

کلچر اور مذہب :۔ شاید سب سے زیادہ حقیقت آمیز تجزیہ وہ ہے جو انچ بلیک نے "کلچر اور پابندی" میں پیش کیا ہے۔ وہ کلچر اور پابندی کو ایک ہی مد میں شمار کرتا ہے۔ کلچر ناگزیر طور پر (یونانی) ہیلنگ نصب العین ہے۔ اس کا اصلی مقصد "اظہار ذات" ہے اور اس صورت میں وہ حسن و خوبی کے نظریات تعلیم کرتا ہے۔ دوسری طرف خود پابندی بھی عبرانی آئیڈیل ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان "خود انضباط" پیدا کرے اس کو رہبانیت (ترک دنیا۔ تپسیا) کا اصول بھی کہا جا سکتا ہے۔ بنیادی طور پر یونان اور زیون (ZION) میں یہی ایک امتیاز ہے۔ اگر مذہب یہود سائنس کا گہوارہ ہے تو یونان بھی فن کاری و تہذیب کا جھولا ہے۔ بلیک کی نظر میں زندگی داخلی اور ترقی پذیر نشوونما کا نام ہے اور پیدا وار کی ارتقائی طاقت ہی زندگی ہے۔ اور وہ کلی طور پر افلاطون کے اس نظریہ کی تصدیق کرتا ہے کہ زندگی اصولی اور عالمگیر حسن سے حسنِ مطلق کے احساس تک پہنچنے کا عمل (SYMPOSIUM) کے ایک مشہور بیان میں افلاطون نے یہ دکھایا ہے کہ انسان کس طرح حسن کی داد دیتے دیتے حسنِ عمل اور حسن عمل سے حسن خیال حاصل کر لیتا ہے یہاں تک کہ وہ روح کے اندرونی رخ تک جا پہنچتا ہے جسے "حسن مطلق" کا تصور و احساس ہی کہنا چاہیے۔ نقطۂ نظر اس حقیقت کا مرتبہ دیتا ہے۔ آیت قرآنی (کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال و الاکرام)[16] زمین اور اس کی سب چیزیں فانی ہیں مگر شکل خداوندی لافانی و قدیم) نے اسی مفہوم کی ترجمانی کی ہے کہ تصور حسن اس امکان کا نام ہے جو وجود لافانی پر منحصر ہے[17]

یہ آگے چل کر دیکھا جائے گا کہ عوام اخلاق کے مقاصد کلچر سے بالکل جداگانہ کوئی چیز نہیں ہیں۔ فنون لطیفہ یا پاکیزہ مذاق ادب کے متعلق اہم نظریہ اور سائنس اور تاریخ میں مکمل علومات دوسری حدود نہیں بناتی ہیں بلکہ ---- "تہذیب اخلاق خود ہی تہذیب دماغ کا پیش خیمہ ہوتی ہے[18]" بلیک اسی لئے تہذیب ذہنی کو تہذیب روحانی سے مشابہت دیتا ہے اور ترک دنیا، عبادت الٰہی کا مسیحی نظریہ پیش کرتا ہے۔ تہذیب محض اور ریاضت محض دونوں کئی لحاظ سے ناکام رہ جاتی ہیں اور مصنف ریاضت کے متعلق عیسائی نقطۂ نظر کی داد دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مسیح ایک تارک الدنیا ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک دنیاوی انسان بھی تھے۔ عیسائیت نے جو حل پیش کیا ہے وہ درمیانی راہ دکھاتا ہے لیکن کیا یہی اسلامی حل بھی نہیں ہے؟ کیا پیغمبر اسلام نے یہ نہیں بتایا ہے کہ (لا رھبانیۃ فی الاسلام) اسلام تپسیا اور ترک دنیا تسلیم نہیں کرتا۔ اور تاہم یہ کہا جاتا ہے کہ

---

[15] ہاؤسمین۔ تمہیدی بیانات (کیمبرج) [16] بلیک ۔ ۱۲۶، ۱۲ [17] قرآن ۔ ۵۵ ۔ ۲۷

[18] وینڈنگ ۔ مسلم کریڈ ۔ ۹۳، ۹۰ [19] بلیک ۔ ۶۲

علی خلیفۂ اسلام نے دنیا اور اس کی زیبائی کو تین بار طلاق دے کر مکمل قطع تعلق کر دی تھی اور خلیفۂ عمرؓ جو رسول اللہ کے سب سے زیادہ معتقد تھے۔ انھوں نے پھٹے کپڑے پیوند لگا لگا کر پہنے۔ ان عمر میں اپنی ذات پر صرف دو روپے صرف کیے اور اس کے باوجود وہ ایک زبردست حکمراں اور ایک طاقتور سردار اور عالمگیر دانائی کا اعلیٰ انسان تھا جس نے زندگی پورے طور پر دنیا کی رفتار کے ساتھ بسر کی۔ اس دنیاوی زندگی کو مکتی (نجات) کا ذریعہ قرار دے کر راستبازی کی زندگی بسر کرنے کا جو آئیڈیل ہندو ازم اور بدھ ازم میں الگ الگ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں بول ہی معمولی سا فرق ہے۔ بہرحال مسیحی حل اسلامی حل سے بالکل ہی قریب تر ہے۔ اور اگر بنیادی طور پر دیکھا جائے تو اس میں اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے حل میں کچھ فرق نہیں رہتا۔

لیکن کلچر کی بحث کو مذہب میں خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ کلچر دماغ کا ایک وصف ہے اور ذہنی صورت اس کا مسئلۂ نجات سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ مذہب کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ انسان اور خدا کا رشتہ معین کرتا ہے وہ روح اور نجات سے متعلق ہے اور اس طرح اس کا تعلق پاکیزگی اور راستبازی اخلاق سے قائم ہوتا ہے۔ ایک مذہبی آدمی کے لئے تہذیبی آدمی ہونا کچھ ایسا ضروری نہیں ہے اور ایک تہذیب یافتہ آدمی ——— کا مذہبی ہونا لازمی نہیں درآنحالیکہ وہ مذہب ہی کی ہر بات میں تعظیم کرتا ہے۔

چونکہ مذہب اپنے تنگ فقہی مفہوم میں حقیقی تہذیب کی لازمی شرط نہیں ہے اس لئے کسی صورت سے بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک مناسب اخلاقی معیار غیر ضروری ہوگا۔ جب ایک شخص اقدار کی شناخت رکھتا ہے، حسن معقولیت کو واجبی حیثیت دیتا ہے، جب وہ اشیاء کا صحیح عکس دیکھتا ہے، جب وہ ضبط تحمل اور رحم وکرم کا احساس رکھتا ہے تو عام طور پر یہ بات ناقابلِ غور ہے کہ وہ دنیاوی کردار کی ایک موزوں کسوٹی بھی نہ رکھتا ہو۔ یا یہ کہ وہ اخلاق سے بالکل ہی محروم ہو۔ لہٰذا با اخلاق باعمل ہونا یا تو مذہبی رویہ کا ثمر ہوگا یا پھر وہ دماغ کے توازن اور AGNOSTIC ایمان بالغیب سے انکار کا نتیجہ۔ لیکن وجہ کچھ بھی ہو یہ ضرور ہے کہ تہذیبی آدمی مردِ عمل (باکردار) ہوتا ہی ہے۔

اب ہم کلچر کی حدود کیونکر بیان کریں۔ کلچر لطیف روحِ انسانی کا ایک خاصہ ہے۔ یہ وہ جذبہ (SPIRIT) ہے انسان کے تمام ماضی کو اپنے دامن میں لیتا ہے اور انسانیت کے اعلیٰ خیالات سے متصف ہو کر باقی رہتا ہے۔ وہ مطالعۂ تکمیل کی اندرونی ترغیب ہے۔ کلچر تکمیل کی اندرونی جستجو کو لازمی قرار دیتا ہے۔ اس میں لازمی طور پر شاعرانہ "مقدس جستجو و بے صبری" بھی شامل ہے۔ جبکہ عمل و تخلیق میں ایک امتیاز موجود ہے اور کلچر خصوصی طور پر عمل سے وابستہ نہیں ہے، کلچر صرف وہیں مانا جاتا ہے جہاں انسان کو صبر تمنائے علم کی دھن لگی ہو۔ تہذیب میں ہر قسم کے فنون کی قدر دانی شامل ہے خواہ وہ کیسی شکل میں ہو مثلاً موسیقی شاعری، ادب، رنگ آمیزی، مینا کاری وغیرہ اس میں اقدار کی شناخت اور مختلف معیاروں کی طرف بڑھنے کی مسلسل کوشش بھی آجاتی ہے۔ تہذیب کا وجود بغیر کافی ترقی یافتہ احساس حسن کے ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر یہ بھی کہ تہذیب کا تعلق مذہب اور اخلاق سے لازمی ہے بے اصولی طور پر نہیں ہے ——— یہ اس لئے نہیں کہ مہذب یافتہ آدمی کو مذہب سے بے نیاز ہو جانا چاہئے بلکہ اس وجہ سے کہ مذہب

کا تعلق ذہن انسانی سے اور مذہب کا روح انسانی سے ہے۔

پس کلچر کی تعریف یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک مخصوص عہد کے اہل الرائے طبقہ کا اندرونی پس منظر ہے اور اہل علم کا ذہنی کارنامہ ہے جو بلند ترین حقائق کو پیش کرتا ہے۔ اور جو شخص اس کو حاصل کر لے ہم اسے تہذیب یافتہ (CULTURED) کہتے ہیں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تہذیب کا تمدن CIVILIZATION سے کیا علاقہ ہے۔ جیساکہ ہم کہہ چکے ہیں تمدن وہ ہے جو ہم استعمال کریں اور تہذیب یہ کہ ہم کیا ہیں --- تہذیب ہماری اندرونی ترقی اور تمدن ایک بیرونی اظہار و خطاب۔ ایک زبردست تمدن میں یہ تمام باتیں ہو سکتی ہیں کہ بڑے بڑے شہر ہوں، صنعتی فنون مثلاً زراعت، معدن کنی، تعمیر، ذرائع نقل و حمل، سیاسی تنظیم و قوت وغیرہ میں خاص فضیلت ہو اور یہ بھی کہ فنون لطیفہ مثلاً سنگتراشی، مینا کاری، مصوری اور موسیقی کا چرچا ہو۔ لیکن یہ خصوصیت تہذیب CULTURE کو ہی حاصل ہے کہ وہ انسان کے اعلیٰ مشاغل کی آواز اٹھاتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ایک متمدن انسان مہذب بھی ہو۔ کیونکہ مادی ترقی، ذہنی نشو و نما کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ اور اس کے برعکس بہت سے مہذب لوگ اعلیٰ متمدن نہیں ہوتے۔ ذرا دیر کے لئے فرانس اور دولت متحدہ امریکہ کو ہی لے لیجئے۔ فرانس بالکلیہ ایک بہتر اور برتر تہذیب کا مالک ہے۔ اور امریکہ زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ وسیع تمدن کا۔ (۱۹A) میتھو آرنلڈ نے مثال کے طور پر کہا ہے کہ "رفتار تمدن کے برعکس، الیزبتھ کا انگلینڈ آج کے انگلینڈ سے زیادہ مہذب تھا" اور کسی کی جرأت ہے جو موجودہ یورپ کی تہذیب کو پیریکلس (PERICLES) کے عہد سے بہتر ہونے کا دعویٰ کر سکے۔

ان تمام تخیلات کو ذہن میں رکھنا چاہئے کیونکہ اسلام نے ایک طرف ممتاز تمدن اور دوسری طرف شاندار تہذیب، دونوں کو ہی پیش کیا ہے۔

---

۱۹ سوار (تمہید ادب) ۱۱، ۱۲ — [illegible]

ہند پکچرز کی مایۂ ناز تصاویر
HIND PICTURES
HIND PICTURES
عنقریب اپنے شہر میں ملاحظہ فرمایئے
عنقریب اپنے شہر میں ملاحظہ فرمایئے
ایثار و محبت کا ایک غیر فانی نقش
سلمیٰ
افسانہ:- منشی دل
موسیقی:- گووند رام
ہدایات:- نذیر
اسکرین پلے:- حسرت لکھنوی
جس کا
اداکاران:- آریلا، یعقوب، ستارہ، ایشور لال، نجیمہ
اور ایک نیا چہرہ:- عذرا
بمبئی میں کئی ہفتوں سے بے پناہ رش لے رہی ہے
آبرو
ہدایت کار نذیر کا عدیم النظیر کارنامہ
مکالمے:- رمیش
موسیقی:- گووند رام۔
گانے:- تنویر، ارجن، سوامی راما نند۔
اداکاران:- ستارہ، نیلیر، یعقوب، جگدیش، مسعود، وتسلا، کمکر وغیرہ اپنے شہر کے سینما میں دیکھنے کے لئے چشم براہ رہیئے۔
HIND PICTURES
BOMBAY, 14
JAGAT TALKIES DISTRIBUTORS
DELHI

مختلف مضامین

تاریخ ہند کی ایک جھلک

از:—
ہمایوں کبیر

ہندستان کے تاریخی واقعات کو مسخ کر کے پیش کرنا برطانوی سامراج کا ایک اہم حربہ رہا ہے جس سے وہ اس ملک میں اپنے وجود کو برقرار رکھ سکا ہے۔ اس طرزِ عمل کی پشت پر جو خیال کارفرما ہے وہ بالکل ظاہر ہے یعنی اگر ہندستان کے دو مذہبوں کی تاریخ کو جنگ وجدال کا نقشہ بنا کر پیش کیا جائے تو اس سے لوگوں کے ذہن میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ برطانیہ کی آمد گویا باعثِ صد رحمت تھی۔ اسکولوں میں جو تاریخ کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں شاہی خاندانوں کے عروج و زوال کی ختم نہ ہونے والی داستانوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ اُن میں نئے نئے تہذیب و تمدن کے وجود میں آنے اور شکل اختیار کرنے کا کہیں تذکرہ نہیں۔ اور نہ اُن کوششوں کا بیان ہے جو دو مذہبوں میں اتحاد اور ہم آہنگی کرنے کے لئے صرف کی گئی تھیں۔

زیادہ تر ہندوؤں کا خیال ہے کہ ہندستان میں اگر تھوڑی بہت تہذیب کے آثار تھے تو صرف قدیم ہندو زمانہ میں اس لئے ہندستانی تمدن سے مراد ہے قدیم ہندو تمدن۔ مسلمان بھی مختلف قسم کے شکوک اور غلط فہمیوں کے شکار ہیں وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر اُن کے طویل دورِ قیام میں تہذیب و ترقی کے آثار معدوم ہیں تو اس کے صاف معنی ہیں کہ ہندستان کی تہذیب لازمی طور پر ہندو تہذیب ہے اس لئے اُن کو اس سے کوئی واسطہ نہ ہونا چاہئے۔ چونکہ ہندستان کی تہذیب کی تعمیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراکِ عمل کی قدر و قیمت کو صحیح طور پر محسوس نہیں کیا گیا ہے اس لئے یہ دونوں فرقے ایک دوسرے کو شک و شبہ اور نفرت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ دراصل یہ آٹھ سو سال سے زیادہ عرصہ تک کی انسانی طاقت اور صلاحیت کے تباہ و برباد ہونے کا احساس ہے جو آج ہماری فرقہ وارانہ ذہنیت کی تہہ میں کام کر رہا ہے۔

[illegible] نو افلاطونیت 'NEOPLATONISM' زرتشت کے عقیدوں اور تحریک انسانیت کا [illegible]
[illegible] فلسفہ کا جب مثال کی دنیا میں باہمی اثرات اور رد عمل کا ظاہر ہونا لازمی امر تھا۔ چنانچہ
تصوف نے ہندی نظریوں سے اثرات حاصل کرنے [illegible] مذہبی [illegible] گہرا اثر مرتب کیا [illegible] فلسفہ
[illegible] لوگوں کو [illegible] احساس سے لیکن حقیقت [illegible] ہندو اور مسلم خیال کی [illegible]
[illegible] وقت [illegible] تحریکوں نے تمام
[illegible] آٹھویں صدی عیسوی [illegible] انقلاب [illegible]
جنوبی ہند میں منتقل ہو جاتی ہے [illegible] یہ تمام لوگ جنوبی ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے [illegible]
[illegible] مذہب پیدا ہوا اور نشوونما حاصل کرتا رہا [illegible] مورخین کے لئے قومی سرگرمیوں کا یہ "انتقال مکان" ناقابل فہم
اور پریشان کن رہا ہے۔ لیکن اگر ہم اس واقعہ کو جنوبی ہندوستان میں اسلام کی آمد سے ملا دیتے ہیں تو یہ معمہ حل ہو جاتا ہے۔ جنوبی
ہندوستان میں اسلام ساتویں صدی کے وسط میں وارد ہوا۔ اور اس نے بہت جلد ہندوستان کے خیالات اور نظریوں کو
متاثر کرنا شروع کر دیا۔

اقتصادی اثرات

جہاں تک اقتصادی تنظیم کا سوال ہے ہندوستان کے عہد متوسط کی تاریخ مذہبی تصادم اور اتحاد کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ قدیم زراعتی نظام ایک نئے ریاستی نظام کے لئے جگہ خالی کر رہا تھا۔ جس کی بنیاد فتوحات پر تھی۔ اس سخت گیر نظام کے اندر علاء الدین کی وہ کوششیں جو ضروریات کی اشیاء کی قیمت مقرر کرنے کے لئے عمل میں آئی تھیں اس بات کا واضح ثبوت پیش کرتی ہیں کہ سماجی شعور بہت حد تک ذاتی نفع پسندی اور انفرادی مفاد کی بندھنوں کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ محمد تغلق کی چمڑے کا سکہ جاری کرنے کی کوشش قبل از وقت تھی اس لئے ناکام رہی لیکن اس سے کم سے کم اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ لوگوں کے اندر مبہم سا احساس پیدا ہو چلا تھا کہ روپیہ بجائے خود کوئی قیمت نہیں رکھتا بلکہ بعض اشیاء کے تبادلہ کا ایک ذریعہ ہے۔ پھر اس زمانہ میں سیاسی اور اقتصادی عناصر کا جو باہمی عمل وجود میں آچلا تھا وہ بھی آج تاریخ کے طالب علم کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مورخین نے یورپ میں سرمایہ داری اور قومی حکومت کے باہمی ربط و اتحاد کا ذکر کیا ہے لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا ہے کہ خود ہندوستان میں اسی قسم کے حالات پیدا ہو چلے تھے اور اکبر کی اصلاحات اور قوانین نے غیر شعوری طور پر ہندوستان میں سرمایہ داری کے لئے راستہ صاف کرنا شروع کر دیا تھا۔ شیر شاہ کے ہاتھوں زمین اور لگذاری وغیرہ کی جو دو بارہ تنظیم عمل میں آئی تھی اور جسے اکبر نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ریاستی نظام عنقریب سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کے ہاتھوں زوال پذیر ہونے والا تھا۔ لیکن ایک ابتدائی شرط کے پورے نہ ہونے کا سبب یہ عمل جاری نہیں رہ سکا اور وہ یہ تھی کہ قدرتی ذرائع پر فتح پانے اور ان کو استعمال میں لانے کے طریقے حاصل نہیں کئے گئے تھے۔ اکبر کے مقابلہ میں پرتاب سنگھ کا شکست کھا جانا اس بات کا مظہر تھا کہ نئے نظام کے مقابلہ میں پرانے ریاستی نظام نے سر جھکا دیا تھا۔ لیکن ریاستی نظام دوبارہ سر اٹھانے کی کوشش میں برابر مصروف رہا۔ چنانچہ شیواجی اور رنگ زیب کا

عروج کے زمانہ میں سیاسی نظام کو درہم برہم کر دیا وہ عروج تھا۔ ان کے عروج نے ہندستان میں سرمایہ داری کی ترقی کو روک دیا اور قومیت جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھی باقی اور فرقہ وارانہ مفاد کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئی۔

چنانچہ ہندستان کے عہد متوسطی کی تاریخ ہر زمانہ اور ہر ملک کی تاریخ کی طرح سیاسی طاقت اور اقتصادی برتری حاصل کرنے کی جدوجہد کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ لیکن ہمیں اس دور میں مذہبی یا فرقہ وارانہ تصادم کا نشان بھی نہیں ملتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عہد متوسط میں مسلمانوں نے ہندوؤں سے جنگ کی لیکن وہ جنگ ہرگز مذہبی مسائل پر نہیں تھی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان جنگ اور صلح بالکل اسی قسم کی تھی جیسی کہ ہندو اور ہندو یا مسلمان اور مسلمان کے درمیان۔ لیکن اس زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مذہبی مسئلوں نے کبھی نہیں پریشان کیا تھا۔ محمود نے اگر سومنات پر حملہ کیا تو سیاسی خیال سے اور محمود غزنوی کے حملوں کا مقصد بھی اس سے زیادہ نہیں تھا کہ ہندستان کی دولت سے اپنی سلطنت کو مضبوط اور طاقتور بنائے۔ ہندستان میں افغانوں کی آمد کی اہمیت بھی اس سے زیادہ نہیں تھی کہ وسط ایشیا سے آبادی کی ہجرت شروع ہوئی جس نے ہندستان کے سرحدی علاقے کی آبادیوں کو انتقال مکان پر مجبور کیا۔ ٹھیک جس طرح افغانوں سے پہلے آریوں کی آمد بھی شمال سے ہوئی تھی اور جس کی وجہ بھی وہی وسط ایشیا سے آبادیوں کی ہجرت تھی، اسی طرح افغان ترک اور مغل بھی اسی ضرورت کے تحت ہندستان میں داخل ہوتے رہے۔ بابر کی خودنوشتہ سوانح عمری میں اس حقیقت کی سمت ایک واضح اشارہ ملتا ہے جس میں اس نے یہ بتایا ہے کہ خود اس کی اپنی زندگی میں یہی اصول کام کر رہا تھا۔ مسلمانوں کی آمد اور آریوں کی آمد میں صرف فرق یہ تھا کہ موخرالذکر جب ہندستان میں داخل ہوئے تو ان کے پاس اپنا کوئی ترقی یافتہ تہذیب تمدن نہ تھا لیکن افغان جب ہندستان میں داخل ہوئے تو وہ اسلامی تہذیب کی اگر موجد نہیں تو کم سے کم اس کی خاص باتوں کو ضرور اختیار کر چکے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندستان میں جو سوال پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ دو تہذیبوں کو کسی طرح ہم آہنگ کیا جائے۔ کہاں تک یہ ہم آہنگی حاصل کی جا سکی اس کے متعلق ہم اوپر کہہ آئے ہیں۔

سیاسی سرگرمیوں کا "انتقال مکان"

عہد متوسط میں اگر افراد اور جماعتوں کے درمیان باہمی مناقشے موجود تھے تو ان کے اسباب خاص دنیاوی تھے۔ اور ان مناقشوں کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں انھیں اسباب کی چھان بین کرنی ہے۔ اس کا ثبوت اس زمانہ کی ایک اہم خصوصیت سے ملتا ہے۔ اور اس کی تشریح یوں ہے۔ مورخین نے وسط ایشیا کے سماجی اور جغرافیائی حالات اور ان کی وجہ سے ہندستان پر ہونے والے پے در پے حملوں پر تو بہت کچھ لکھا ہے لیکن تاریخ ہند کی ایک اہم حقیقت پر اچھی طرح غور نہیں کیا ہے اور وہ ہے عہد متوسط میں راجپوتوں کا عروج اور ان کی حکومت کی مدت حیات۔ عام طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے اور اورنگزیب کے عہد حکومت کے بعد راجپوتوں کی ہندستان کی تاریخ میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ لیکن اس ایک ہزار سال کے عرصہ میں وہ ہندستان کی تاریخ پر چھائے رہے باوجود اس کے کہ وہ تعداد اور سیاسی طاقت کے لحاظ سے ہندستان کی بہت سی دوسری جماعتوں اور ریاستوں کے مقابلہ میں کمزور تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے ہی ہندستان کی سیاست کا مرکز گنگا کے

انتقال مکان پر مجبور ہوگیا۔ اس کی تشریح یوں ہے۔ ٹھیک جس طرح مشرق بعید سے جب تک ہندستان کے تعلقات قائم رہے اُس وقت تک مشرقی ہندستان (مثلاً بہار) سیاسی سرگرمیوں کا مرکز رہا اور جب مغربی ہندستان سے عربوں کے تجارتی تعلقات قائم ہوئے تو گجرات ہندستان کا تجارتی مرکز بن گیا اور راجپوتوں کا عروج ہوا بالکل اُسی طرح جب "راس امید" سے سمندری راستوں کی دریافت کرنے کے بعد کالی کٹ اور جنوبی ہندستان کے مشرقی ساحل سے یورپ کے تجارتی تعلقات پیدا ہوئے تو ہندستان کی تاریخ کا عروج شروع ہوا۔ اس لئے کہ پرتگالی، ڈچ اور یورپ کی دوسری قوموں کا جب ہندستان سے تجارتی ربط و ضبط بڑھا تو مغربی گھاٹ کے ساحل پر قابض ہونا، پورے ملک کی اقتصادی زندگی پر قابض ہونے کے لئے ضروری ہو گیا رانا پرتاپ سنگھ اور شیواجی، دونوں کے نعرے مذہبی اور فرقہ وارانہ تھے لیکن تاریخ کا طالب علم یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ دراصل ان نعروں کی پشت پر اقتصادی مفاد کام کر رہا تھا۔ اور ان راجاؤں نے اس مفاد کو مغلوں کے پنجے سے چھڑانے کے لئے لڑائی چھیڑی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ خود اس کا احساس نہیں رکھتے تھے تو اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ وہ اقتصادی مفاد کے لئے نہیں لڑ رہے تھے۔ اس لئے یہ ایک ظاہری بات ہے اور ہر کوئی اس سے واقف ہے کہ ہزاروں انسان دراصل خود اپنے پوشیدہ مقاصد اور ارادوں کا تجزیہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ روزانہ ہزاروں ایسے مرد و عورت اس قسم کا کام کرتے نظر آئیں گے جن کی وجہ وہ خود نہیں سمجھتے یا ان کے حقیقی اسباب سے خود بھی انکار کرتے ہیں اور ایسے اسباب اور وجہیں پیش کرتے ہیں جو دراصل ان کے عمل و حرکت سے غیر متعلق ہوتی ہیں۔ جب ہندستان میں یورپ کے تجارتی مفاد تقویت اور عروج حاصل کرنے لگے تو ملک کی اقتصادی زندگی نئی شاہراہوں پر چل پڑی۔ اور کالی کٹ اور مدراس سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجپوت اور مرہٹے دونوں سیاسی اعتبار سے کمزور ہوگئے۔ مرہٹے کم سے کم ایک سو سال تک اور اپنی جدوجہد کو جاری رکھنے میں کامیاب ہوئے لیکن جب ہندستان میں پرتگال اور ہالینڈ کی جگہ فرانس اور برطانیہ نے لے لی اور ہندستان اور یورپ کی باہمی تجارت کے مالک بن بیٹھے تو مرہٹے بھی آہستہ آہستہ زوال پذیر ہونے لگے اگرچہ بندرگاہ بمبئی کے عروج سے اس کا یقین ہوگیا کہ مرہٹوں کا مکمل خاتمہ غیر ممکن ہے۔

دہلی کے مسلمان بادشاہوں کے خلاف راجپوتوں اور مرہٹوں نے جتنی جنگیں چھیڑیں ان کی نوعیت مورخین نے ہمیشہ فرقہ وارانہ اور مذہبی بتائی ہے لیکن اوپر کے تجزیہ سے یہ بات ثابت ہوگئی ہوگی کہ مناقشے اور جھگڑے دراصل مادی اسباب کی بنا پر ہوتے ہیں اور ان میں مذہبی یا تمدنی عناصر کی مداخلت محض اتفاقی اور خارجی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۹۴۱ کا گنا وا

ہندوستان میں مردم شماری کی اہمیت

از : ـــــــــ ڈاکٹر جعفر حسن

(۱)

مردم شماری یا گنا وے کا مفہوم

یہ جدید زمانے کی خصوصیت ہے کہ ہر دہائی کے بعد ترقی پذیر ملکوں میں باضابطہ طور پر آبادی کی گنتی ہوتی ہے اور مختلف معاشی اور سماجی حیثیتوں کی کیفیت مرتب کی جاتی ہے۔ مثلاً آبادی کی عمرواری تقسیم، تعلیمی حالت، معیار صحت، بیاہیوں اور بن بیاہیوں کی تعداد، ان کی عمریں، مرنے والوں کی تعداد، شرح اور بیماریاں، غرض تہذیب و تمدن کے بہتیرے امور پر اعداد و شمار اکٹھا کیے جاتے ہیں اور بسا اوقات صرف اعداد کو دیکھئے اور دوسرے ملکوں سے ان کا مقابلہ کرنے سے بڑی دلچسپ، حیرت انگیز اور بعض مرتبہ سبق آموز باتیں معلوم ہوتی ہیں اس مضمون میں ان ہی کا ذکر کیا گیا ہے اور دس بیس سال پہلے کے اعداد نہیں بلکہ ۱۹۴۱ء کے بالکل جدید اعداد دئے گئے ہیں۔ یہ اعداد سبق سکھانے اور الجھے میں ڈالنے والے ہوں یا نہ ہوں مگر وہ دلچسپ ضرور ہیں، کم سے کم ان لوگوں کے لئے جو اپنی تہذیب و تمدن کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

لطیفہ۔ سب سے پہلے ایک لطیفہ سنئے کسی ضلع کی خبر تھی۔

ACCORDING TO THE LATEST CENSUS THERE ARE 25000 BUFFALOES IN OUR DISTRICT.

دفتر کے سرکاری مترجم نے لکھدیا۔

"حالیہ مردم شماری کے مطابق ہمارے ضلع میں ۲۵ ہزار بھینس ہیں!" انسانوں کی گنتی سے بھینسوں کی تعداد کا معلوم کرنا بڑی مزیدار بات ہے۔ مگر میں نے جب یہ لطیفہ سنا تو مجھے خیال آیا کہ مترجم سے زیادہ یہ ہماری زبان کا قصور ہے جس میں CENSUS کے لئے صرف مردم شماری کا لفظ ہے اور یہ لفظ CENSUS کے پورے مفہوم پر حاوی نہیں۔ ہندی میں اسے کہتے ہیں मनुष्य-गणना یا मनुष्यगणना جو بالکل مردم شماری کے ہم معنی ہیں۔ دونوں لفظ بہت بوجھل اور کٹھن ہونے کے علاوہ CENSUS کے پورے مفہوم کو ادا نہیں کرتے۔ اس لئے سنسس کو گنانا یا گنواکنا ٹھیک ہوگا اور یہ لفظ ہندی اور اُردو دونوں زبانوں کے جاننے والوں کے لئے آسان ہوگا

ہندستان میں مردم شماری کی اہمیت

لطیفہ سے سنجیدگی کی طرف آنے کے لئے ہمیں یہ دکھانا ہے کہ ہندستان میں انسانوں کی گنتی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کیوں زیادہ اہم ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ہندیانا اور فرقہ واری نیابت۔ ہم محکوم ہیں اس لئے اکثر بڑے بڑے اور اہم عہدوں پر انگریز جمے بیٹھے ہیں، پچاس۔ ساٹھ سال قبل ہماری حالت اور بھی بدتر تھی کیونکہ اس وقت تمام اچھے عہدوں پر انگریز ہی انگریز ہوتے تھے۔ جیسے جیسے ہندستانی اپنے حقوق کے لئے لڑ رہے ہیں اور اس کی خاطر قربانیاں کر رہے ہیں اسی قدر ملک کے انتظامی عہدوں پر ہندستانیوں کا تقرر بڑھتی ہوئی تعداد میں کیا جا رہا ہے۔ اسی کو اصطلاحی زبان میں INDIANIZATION یعنے ہندیانا یا ہندیاؤ لکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کے مختلف محکموں میں اور ہر محکمے کے لئے مختلف عہدوں پر خاص کر اہم اور بڑے عہدوں پر انگریزوں کی بجائے ہندستانیوں کا تقرر کرنا۔ پبلک کے مطالبوں اور مختلف اداروں کے ہنگاموں سے مجبور ہوکر حکومت ہر لازمی خدمتوں کی تعداد ہندستانیوں کے لئے مختص کر رہی ہے، یہ اور بات ہے کہ مطالبے کرنے والے یا ان مطالبوں کی خاطر قربانیاں کرنے والے اور ہیں اور ان کے طفیل سے خدمتیں پانے والے اور! قربانی کوئی کرے، عہدے اور روٹیاں دوسروں کو ملیں! بوتا کوئی ہے، لوٹتا کوئی ہے: اس کا بھی نام دنیا ہے! غرض بڑھتی ہوئی تعداد اور تناسب سے ہندستانیوں کا تقرر ہو رہا ہے اور مختلف سرکاری خدمتیں ہندیائی جا رہی ہیں!

ہندیانے کی ایک حقیقی مثال لیجئے

۱۹۳۰ء میں سرکاری ریلوں کے یورپی عہدہ داروں کی تعداد ۴۷۷۳ تھی مگر ۱۹۴۳ء میں سرکاری ریلوں کے یورپی عہدہ داروں کی تعداد ۲۵۰۸ ہوگئی تھی گویا اس مدت میں جتنی جائدادیں خالی ہوئی تھیں ان میں سے زیادہ تر جائیدادوں پر ہندستانیوں کا تقرر ہوا تھا۔ اسی کو ہندیانا کہتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس مدت میں ہندستانیوں کے حصّے میں تو زیادہ جائدادیں آئیں مگر وہ ملیں کنھیں؟ ہندوؤں کو؟ عیسائیوں کو؟ مسلمانوں کو؟ سکھوں کو؟

ہمارا ملک محکوم ملک ہی نہیں بلکہ فرقہ واریت میں مبتلا ملک ہے؟ ہمیں اس حقیقت سے تشفی نہیں ہوتی کہ ہمارے اپنے ملک کے انتظام میں سب کا حصّہ ہو، ہندوؤں کا، پارسیوں کا، عیسائیوں کا اور مسلمانوں کا اور ہر ایک کو

حصہ اس کی تعداد کے مطابق ملے۔ اس طریق کو اصطلاحی زبان میں COMMUNAL REPRESENTATION یعنے فرقہ واری نیابت کہتے ہیں دو حقیقی مثالیں لیجیے۔

۱۹۳۱ء میں سرکاری ریلوے کی مختلف خدمتوں اور عہدوں پر ۱۴۳۹۸ ہندوستانی عیسائی تھے۔
۱۹۳۹ء تک ان کی تعداد میں ۳۴۴۲ کا اضافہ ہوا اور سرکاری ریلوں میں ہندوستانی عیسائیوں کی مجموعی تعداد ۱۷۸۴۰ ہوگئی۔

۱۹۳۱ء میں سرکاری ریلوے کی مختلف خدمتوں اور عہدوں پر ۱۲۲۹۵۴ مسلمان مامور تھے۔
۱۹۳۹ء تک ان کی تعداد میں ۱۵۴۵۴ کی کمی ہوئی اور سرکاری ریلوں میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد گھٹ کر ۱۰۷۵۰۰ ہوگئی۔

ان اعداد سے ظاہر ہے کہ سرکاری ریلوں میں جو ہندیاوی طریق (INDIANIZING PROCESS) جاری ہے، اس میں سراسر ناانصافی اور مصلحت کارفرما ہیں کیونکہ جس رفتار اور تناسب سے خدمتیں ہندیائی جاری ہیں اسی رفتار اور تناسب سے ہندوستان کے سب فرقے اور جماعتیں یا علاقے اور طبقے، نسلیں اور ملتیں مستفید نہیں ہو رہی ہیں کیونکہ حکومت سب سے زیادہ ہندوستانی نژاد یورپی لوگوں پر اس کے بعد ہندوستانی عیسائیوں پر اور آخر میں پارسیوں اور برہمنوں پر مہربانیاں کرتی ہے اور زیادہ تر انہی میں فیاضی سے عہدے اور خدمتیں تقسیم کرتی ہے سب سے زیادہ گھاٹے میں سکھ، مسلمان اور نام نہاد نیچ ذات کے ہندو یعنے ہریجن رہتے ہیں۔ جب مسلمانوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مجموعی تعداد بڑھ رہی ہے پھر بھی جو نوکریاں سرکاری ریلوے میں خالی ہوتی ہیں، ان میں سے انھیں بہت کم ملتی ہیں تو یقینی طور پر انھیں بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے حکومت نے یہ اصول اختیار کیا ہے کہ جہاں کہیں ہو سکے (COMMUNAL REPRESENTATION) یعنے فرقہ داری نیابت کا انتظام کیا جائے۔

ہندوستان میں مردم شماری کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہونے کی ایک اور وجہ سیاسی ہے۔ جتنی قانون بنانے والی جماعتیں ہیں ان کے لئے چناؤ فرقہ واری نیابت کے اصول پر ہوتا ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی اور فرنگی سب الگ الگ اپنے نمایندوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ کہیں کہیں علاقہ واری انتخاب ہوتا ہے مگر عام طور پر قانون ساز مجلسوں کے لئے فرقہ واری نمایندگی ہوتی ہے۔ لہذا ہر مذہب، ملت کے لوگوں کی خواہش ہے کہ جتنی ان کی تعداد بڑھیگی، اتنے ہی نمایندوں کا مطالبہ اور آخر کار اس کی اجازت ملے گی، اور ان کی تعداد کی مناسبت سے ان کے نمایندے صوبائی یا مرکزی قانون ساز مجلسوں میں پہنچکر حکومت کی تمدنی، سیاسی، معاشی اور سماجی پالیسی پر اثر ڈال سکیں گے اور اپنے رسوخ اور اثر کی وجہ سے اپنے ہم فرقہ وکیلوں، ٹھیکہ داروں، ڈاکٹروں، تاجروں، صناعوں، سرمایہ داروں وغیرہ کو فائدہ پہنچا سکیں گے۔ ان ہی وجوہ کے تحت کئی لوگوں نے ۱۹۴۱ء کے

گنا وے میں اپنی اصلی تعداد سے بڑھ کر تعداد لکھوا دی۔ ایک صاحب نے خود مجھ سے فخریہ بیان کیا کہ انھوں نے سات کے بجائے گھروالوں کی تعداد سترہ بتائی تھی، شمار کرنے والا (ENMUERATOR) جس کا ہم مذہب تھا اس نے انھیں مشورہ دیا کہ جب سترہ ہیں تو دو اور لکھاؤ" غرض سات کے انیس ہوگئے!! میں جانتا ہوں کہ ہر جگہ ایسا اندھیر نہیں ہوا مگر پھر بھی ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی تعداد بڑھا چڑھا کر لکھائی ضرور ہے۔

خلاصہ یہ کہ فرقہ واری نیابت اور ہندیانے کی پالیسی کی وجہ سے ہندستان میں گنا وے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، جس کی نظیر انگلستان یا امریکہ میں کہیں نہیں ملتی اور جب تک ہمارے ملک میں فرقہ واریت کا بول بالا رہے گا یہ اہمیت باقی رہے گی۔

اس غیر معمولی اہمیت کے علاوہ بھی گنا وے کی عام اہمیت ہر ملک میں، خاص کر ترقی پذیر ملکوں میں، مانی ہوئی بات ہے کیونکہ گنا وے سے ہمیں حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے مختلف جدولوں میں اعداد و شمار جمع کئے گئے ہیں۔ ان اعداد کی روشنی میں ہم نہ صرف اپنی تہذیب و تمدن کے مختلف اجزا کو معلوم کرسکتے ہیں بلکہ مستقبل کے لے نظام عمل بنانے میں مدد لے سکتے ہیں۔

اعداد و شمار کی روشنی میں ہندستان کے تمدنی مسئلے

(۱) آبادی کی گنجانی

بے جوڑ یا غیر مربوط اعداد کو معلوم کرنے سے آبادی کی کمی زیادتی کا کچھ علم نہیں ہوتا اس لئے آبادی کی تعداد اور ملک کے رقبہ کا تناسب ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ آبادی کتنی گنجان ہے۔

ہندستان کا مقابلہ یورپی ملکوں سے کرنا ٹھیک نہیں کیونکہ ہندستان جغرافی اور معاشی اعتبار سے آدھا برا اعظم ہے، ہندستان کے صوبوں اور بعض بڑی بڑی دیسی ریاستوں کا مقابلہ یورپ کے ملکوں سے کرنا ٹھیک ہوگا کیونکہ یہ اُن کے ہم پلہ ہیں۔

ملک یا برا اعظم کا نام	جس سال کے اعداد ہیں	رقبہ چوکور میلوں میں	آبادی	گنجانی (ہر چوکور میل کے لحاظ سے لوگوں کی تعداد)
آسٹریلیا	سنہ ۱۹۳۹ء	۲۹،۷۴،۰۰۰	۷۰،۰۰،۰۰۰	۲
کناڈا یا کنیڈا	سنہ ۱۹۴۱ء	۳۴،۶۶،۰۰۰	۱،۱۴،۰۰،۰۰۰	۳
آرجنٹائن	سنہ ۱۹۴۱ء	۱۰،۸۰،۰۰۰	۱،۳۳،۰۰،۰۰۰	۱۲
متحدہ امریکی ریاستیں	سنہ ۱۹۴۰ء	۲۹،۷۷،۰۰۰	۱۳،۱۴،۰۰،۰۰۰	۴۴
چین[۱]	سنہ ۱۹۳۶ء	۲۹،۰۳،۰۰۰	۴۲،۲۷،۰۰،۰۰۰	۱۴۸
ہندستان	سنہ ۱۹۴۱ء	۱۵،۸۱،۰۰۰	۳۸،۸۹،۰۰،۰۰۰	۲۴۶

[۱] چین میں باقاعدہ طور پر ملک بھر میں گنتی کبھی نہیں کی گئی۔ یہ اعداد واقف کاروں کے اندازے ہیں۔

دُنیا کی سطح زمین کا مجموعی رقبہ ۵½ کروڑ چوکور میل ہے اور دُنیا کی مجموعی آبادی کا اندازہ دو ارب سے زیادہ تقریباً ۲۱۸ کروڑ ہے۔ اس کے یہ معنے ہوئے کہ مجموعی اعتبار سے دنیا کی گنجانی ۴۰ افراد فی چوکور میل ہے اور ہندستان کی گنجانی تقریباً ۲۵۰!

جنوبی امریکہ کا ایک اور بڑا ملک بریزل ہے جس کا رقبہ ہندستان کے رقبہ سے دونا ہے مگر وہاں کی آبادی صرف ۴،۱۴،۰۰،۰۰۰ ہے۔ اس لحاظ سے وہاں کی آبادی کی گنجانی ۱۲ ہے اور ہندستان کی ۲۴۶۔ ان اعداد سے ہم اندازہ کر سکتے کہ ہماری آبادی کس قدر گھنی ہے۔ جہاں آبادی پہلے ہی سے کافی گھنی ہوگی وہاں پھیلاوے کی گنجائش کہاں سے آئے گی!!

متحدہ امریکی ریاستوں کی تعلیمی، زراعتی، فنی، کاروباری، تجارتی، صنعتی، پیشہ ورانہ ترقی کو پیش نظر رکھئے اور خیال کیجئے کہ ایسے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملک میں تو ہر چوکور میل کے لحاظ سے لوگوں کی تعداد ۴۴ ہے مگر ہندستان میں محکومیت، غفلت اور جہالت کے ہوتے ہوئے ۲۴۶۔ ان ہی اعداد سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہندستان میں کس قدر اضافی کثرت آبادی ہے!

(۲) مختلف ملکوں اور ہندستان کے بعض صوبوں یا ریاستوں میں آبادی کی گنجانی

ملک یا صوبہ کا نام	رقبہ (چوکور میل)	آبادی	گنجانی
بنگال (۱۹۴۱ء)	۷۷،۴۴۲	۶،۰۳،۰۶،۰۰۰	۷۷۹
بہار (")	۶۹،۷۴۵	۳،۶۳،۴۰،۰۰۰	۵۲۱
آگرہ و اودھ کے متحدہ صوبے (")	۱،۰۶،۲۴۷	۵،۵۰،۲۰،۰۰۰	۵۱۰
جاپان (اصل ریاست)	۱،۴۷،۰۰۰	۶،۹۲،۰۰،۰۰۰	۴۶۹
مدراس (۱۹۴۱ء)	۱،۲۶،۱۶۶	۴،۹۳،۰۰،۰۰۰	۳۹۱
جرمنی (۱۹۳۶ء)	۱،۸۱،۶۳۰	۶،۹۶،۰۰،۰۰۰	۳۸۲
اٹلی (")	۱،۱۹،۷۶۴	۴،۳۰،۰۰،۰۰۰	۳۵۹
پنجاب (۱۹۴۱ء)	۹۹،۰۸۹	۲،۸۴،۱۹،۰۰۰	۲۸۷
بمبئی (")	۷۶،۴۴۳	۲،۰۸،۴۹،۰۰۰	۲۷۲
اڑیسہ (")	۳۲،۱۹۸	۸۷،۲۸،۰۰۰	۲۷۱
میسور (")	۲۹،۴۵۸	۷۳،۲۹،۰۰۰	۲۴۹
حیدرآباد دکن (")	۸۲،۳۱۳	۱،۶۳،۳۹،۰۰۰	۱۹۸
فرانس (۱۹۳۶ء)	۲،۱۲،۶۵۹	۴،۱۹،۰۰،۰۰۰	۱۹۷
پرتگال (")	۳۵،۴۹۰	۶۰،۳۰،۰۰۰	۱۹۲
آسام (")	۴۵،۹۵۱	۱،۰۲،۰۴،۰۰۰	۱۸۷
متوسط صوبے اور برار (۱۹۳۶ء)	۹۸،۵۷۵	۱،۶۸،۱۳،۰۰۰	۱۷۰

آباد ملکوں میں بھی گنجانی کتنی مختلف ہے اس کا اندازہ ان اعداد سے ہوتا ہے۔ غیر ملکوں کے اعداد جنگ سے کچھ قبل کے ہیں اور سٹیٹسمن ئیر بک کی جدید ترین اشاعت سے ماخوذ ہیں۔ جاپان کی اصل ریاست سے مُراد اس علاقے سے ہے جو سیکڑوں برس سے جاپانیوں کا ہے۔ اس میں کوریا اور فارموسا بھی شامل ہیں۔ جرمنی میں پہلی عالمی جنگ کے بعد کا رقبہ اور ۱۹۳۲ء کی آبادی شامل ہے۔ اگر مہا جاپان اور مہا جرمنی کے اعداد پیش کئے جاتے تو گنجانی کم ہو جاتی کیونکہ سامراجیت کی بدولت ان ملکوں کو آبادی کے مقابلہ میں رقبہ بہت زیادہ ملا ہے۔ اس جدول کی تیاری میں زرعی کی غرض سے مطلوبہ اعداد حاصل نہیں کئے گئے بلکہ ہندستان کے مسئلہ آبادی کی مختلف نوعیتیں ظاہر کرنے کے لئے اور چند غیر ملکوں سے مقابلہ کرنے کی خاطر اُن ملکوں کے اعداد اکٹھا کئے گئے ہیں۔ ان سے ثابت ہے کہ وادیٔ گنگا اور اس کے ملحقہ علاقوں کے برابر یورپ کا کوئی ہم وسعت ملک آباد نہیں! وادیٔ گنگا کے برابر گنجانی کہیں ملتی ہے تو وادیٔ نیل (مصر) اور وادیٔ یانگ ٹسی کیانگ (چین) میں!

(۳) ہندستان کا فرقہ واری مسئلہ

ہندستان کے تمدنی مسئلوں میں ناقابلِ انکار اہمیت رکھنے والا مسئلہ فرقہ داری ہے۔ بعض لوگ اس بات کو بہت بُرا سمجھتے ہیں کہ علمی نوعیت کی تحریروں میں بھی اس مسئلہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور بعض لوگ فرقہ واریت کی بھی معاشی تاویل کرتے ہیں اس میں شک نہیں کہ فرقہ واریت کا مسئلہ معاشی اور سیاسی وجوں سے شدید تر ہو گیا ہے مگر اس کی اساس بہرحال قائم ہے۔ اس کے وجود سے انکار کرنا، ناپسند حقیقتوں سے انجان بننا، خود مغالطے میں مبتلا ہونا اور دوسروں کو گمراہ کرنا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ہندستان میں فرقہ واریت کا مسئلہ شدید تر ہونے والا ہے کیونکہ اس مسئلہ کو اور زیادہ اُلجھانے کے لئے ایک نئی جماعت طوفانی طاقت حاصل کر رہی ہے۔

ہمارے ملک میں ہندو کتنے ہیں اور مسلمان کتنے؟ اس کا جواب دینے کے لئے یہ دریافت کرنا ضروری ہوگا کہ ہندو یا مسلمان کہتے کسے ہیں! میں نے ایک سنگھٹن دجلسے میں کسی خوش اعتقاد عالم کو اپنے ویاکھیان میں اس بات پر اصرار کرتے سنا ہے کہ ہندو کے لئے ہمیشہ سچ بولنا لازمی ہے!" اگر مردم شماری کے وقت بھی یہ شرط عاید کی جائے تو ہندوؤں کی تعداد کیا کروڑوں کی رہ سکتی ہے؟ ایک اور محفل میں جاہل مسلمانوں کی بے تعصبی کا ذکر ہو رہا تھا ایک عالم نے کہا: "جس دل میں تعصب ہو وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتا! بلکہ مسلمان کے لئے سب سے محبت اور ہمدردی کرنا لازمی ہے۔ اس شرط کے بعد مسلمانوں کی تعداد کیا ہو سکتی ہے؟ ان مشکل معیاروں کو جانے دیجئے ان متعدد کفر کے فتوؤں کا خیال کیجئے جو آئے دن مختلف افراد اور جماعتوں کے خلاف نکلتے رہتے ہیں، سرسید احمد خاں اور نواب محسن الملک، شبلی نعمانی اور حافظ نذیر احمد جیسے عالم اور رہنما جب کافر ٹھہرائے جا چکے تو آپ ہم کس گنتی میں ہیں۔ بہائیوں اور قادیانیوں کی طرح تمام جدید فرقے قدیم فرقوں کے کٹر لوگوں کے نزدیک کافر ہوئے نہیں! ہمیشہ سے کافر تھے!" جس ملک میں ابوالکلام آزاد جیسے بزرگ قوم معظم اور حافظ قرآں کو کافر بنایا گیا ہو وہاں مسلمان ہے کون؟

مولانا حالی نے "یادگار غالب" میں اعتراف کیا ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ وہ مذہبی خود پسندی کے نشے میں سرشار تھے

خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے تہتّر فرقوں میں سے اہل سنّت کو اور اہل سنّت میں صرف حنفیہ کو اور ان میں سے بھی صرف اُن لوگوں کو جو صوم و صلوٰۃ اور دیگر احکام ظاہری کے نہایت تقید کے ساتھ پابند ہیں، نجات اور مغفرت کے لائق جانتے تھے"۔

مسلمانوں کے فرقوں کی باہمی پھوٹ کو واضح کرنے کے لئے حالّی ہی نے اپنی لاجواب مسدس میں لکھا ہے ؎

نہ سُنّی میں اور جعفری میں ہو اُلفت ۔ نہ نعمانی و شافعی میں ہو مِلّت
وہابی سے صوفی کی کم ہو نہ نفرت ۔ مقلّد کرے نا مقلّد پہ لعنت
رہے اہلِ قبلہ میں جنگ ایسی باہم
کہ دینِ خدا پر ہنسے سارا عالم

بہرحال مردم شماری کے لئے ہندوی تفریقوں میں جانا یا بلند معیار تطبیق کرنا ممکن نہیں اس لئے ہم یہ معلوم کرتے ہیں کہ مختلف مذہبوں کو ماننے والے کتنے ہیں، یہ اعداد بھی ۱۹۴۱ء کے جدید ترین گنادے سے ماخوذ ہیں،

(۴) ہندستان میں مذاہب کے نام لیوا

		سو میں
ہندومت کے نام لیوا	۲۵،۰۰،۰۰،۰۰۰	۶۶
اسلام کے نام لیوا	۹،۲۰،۰۰،۰۰۰	۲۴
عیسائیت کے نام لیوا	۶۳،۰۰،۰۰۰	۱٫۶
سکھ مت کے نام لیوا	۵۷،۰۰،۰۰۰	۱٫۵
جین مت کے نام لیوا	۱۴،۴۹،۰۰۰	۱
بدھ مت کے نام لیوا	۲،۳۲،۰۰۰	
پارسیت یا زرتشت کے نام لیوا	۱،۱۴،۰۰۰	
یہودیت کے نام لیوا	۲۲،۰۰۰	
کل تعداد	۳۵،۵۸،۱۷،۰۰۰	
بقیہ آبادی جس کا شمار "قبیلوں" میں کیا گیا ہے	۳،۰۸،۸۳،۰۰۰	
۱۹۴۱ء میں ہندستان کی کل آبادی	۳۸،۶۷،۰۰،۰۰۰	

مذہبی شماریات میں تین کروڑ سے زیادہ لوگوں کو "قبیلوں" میں شمار کر لینا بالکل بے اصولی اور من مانا طریق ہے۔ قبیلہ کا تعلق مذہب سے

نہیں بلکہ نسل سے ہوتا ہے اور مذہب بدلنے کے بعد قبیلہ اور قبیلہ واری خصوصیتیں وہی رہتی ہیں۔ لہٰذا مذہبی گناد سے "تین قبیلوں" کی ذیلی قسم قرار دینا بالکل بے جوڑ بات ہے۔ جہاں تک عام واقفیت اور قیاس سے کہا جاسکتا ہے ان تین کروڑ لوگوں میں دو ڈھائی کروڑ ہندو (یا آیندہ ہندو کہلانے والے اور خود کو ہندو تعبیر کرنے والے) نصف کروڑ مسلمان (یا آیندہ خود کو مسلمان کہلانے والے اور مسلمانوں سے تعبیر کرنے والے) بقیہ میں تین چوتھائی عیسائی (یا مستقبل کے عیسائی) اور بقیہ سکھ وغیرہ ہیں۔ اس قیاس کی وجہیں اور دلیلیں بیان کرنے کا یہ موقع نہیں، اتنی بات تو بہرحال مسلّم ہے کہ مذہبی گناوے میں تین کروڑ کو "قبیلے" کہنا علمی نقطۂ نظر سے مہمل اور عملی نقطۂ نظر سے گمراہ کن ہے۔

ہندوؤں کی عظیم اکثریت ہندستان کے بیچ اور جنوب میں ہے۔ گنگاجی کا مقدس پانی نہ صرف ہندو تہذیب کے مرکزی علاقے کو سیراب کرتا ہے بلکہ ہندوؤں کی اکثریت کو بچاسے ہوئے ہے چنانچہ متحدہ صوبوں میں ان کی تعداد ۸۵ فیصد ہے اور بہار اور اڑیسہ کے صوبوں میں بھی ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ متوسط ہندستان، راجپوتانہ، بمبئی اور جنوبی ریاستوں میں ان کی اکثریت اور زیادہ ہے۔ حیدرآباد کی ریاست میں ۸۵ فی صد ہے اور مدراس میں سب سے زیادہ ۸۸ فی صد ہندو آباد ہیں۔ یہی علاقے مذہبی اعتبار سے "ہندستان" کہے جاسکتے ہیں۔

مُسلمان مسلمان شمال مغربی سرحد، کشمیر، سندھ اور بلوچستان پر چھائے ہوئے ہیں اور ان کی مطلق اکثریت بنگال اور پنجاب کے صوبوں میں بھی ہے۔ ان ہی علاقوں کو "پاکستان" کہا جاسکتا ہے۔

سکھ سکھوں کی سب سے زیادہ تعداد پنجاب میں ہے اور وہ بھی ایک زمانے میں مجوزہ پاکستان کے علاقوں پر حکمراں رہ چکے ہیں، وہ بھی اپنی گذشتہ عظمت اور حکومت کو نہیں بھول سکتے، لہٰذا وہ بھی پنجاب کے کم سے کم ایک حصّہ کو "سکھستان" یا "خالصتان" بنانا چاہیں تو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟

جین اور پارسی جین زیادہ تر راجپوتانے، اجمیر اور مارواڑ میں پائے جاتے ہیں اور تہذیبی اعتبار سے ہندو ہیں، جینوں کو مہا ہندو دھرم کا فرقہ سمجھنا صحیح ہے۔ پارسیوں کی کل تعداد ایک لاکھ سے کچھ زیادہ ہے، تمدنی اعتبار سے پارسی سب سے زیادہ ترقی یافتہ فرقہ ہے۔ دولت مند، ہنرمند، تعلیم کے ماہر علوم اور فنون میں ممتاز پارسیوں کے چلائے ہوئے کاربار ہندستانی معیشت کے سرتاج اور بین اقوامی شہرت رکھنے والے ادارے ہیں۔ ہندستانی تمدن سے بیگانگی یا کم تعلقی، خاصکر بحیثیت جماعت، قومی تحریکوں سے علیحدگی اور انگریزیت سے وابستگی پارسیوں کی نمایاں کمزوریاں ہیں۔ انھیں "ہندستان کے یہودی" کہا جاتا ہے اور یہ لقب بالکل بے بنیاد نہیں، فوجی نقطۂ نظر سے پارسی نیپال کے گورکھوں کے برعکس ہیں۔

عیسائی عیسائیوں کی آدھی سے زیادہ تعداد دکن اور جنوبی علاقوں میں ہے، بقیہ سارے ہندستان میں منتشر ہے۔ مدراس کے صوبہ میں عیسائیوں کی تعداد سو میں چار، کوچین ریاست میں ۲۹ اور ٹراونکور میں ۳۲ فی صد ہے! گویا ٹراونکور میں ہر تیسرا شخص عیسائی ہے وہاں "ہندو مسلم مسئلہ" نہیں "ہندو عیسائی" مسئلہ ہے۔ کچھ عجب نہیں اگر مستقبل میں "جرچستان" کی مانگ پیدا ہو اور عیسائی اپنی مخصوص تہذیب کے بچاؤ کے لئے ایک علٰحدہ سیاسی اکائی قائم کرنے پر مچل بیٹھیں۔

عیسائیوں کی نہ صرف مطلق تعداد بلکہ متناسب تعداد تقریباً ہر صوبے اور ریاست میں بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۱ء کی دس سالہ مدت میں عیسائیوں کی تعداد میں ۲۳ فی صد کی رفتار سے اضافہ ہوا۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی

رفتار اضافہ ۳۲ فی صدی تھی!! ہندوؤں اور مسلمانوں کی شرح اضافہ سے تگنی رفتار پر عیسائیوں کا اضافہ ہو رہا تھا ظاہر ہے کہ یہ تیز رفتار ترقی صرف فطری اضافے کی وجہ سے ممکن نہیں۔ اس حیرت انگیز ترقی کا سب سے بڑا سبب مذہب کی تبدیلی ہے۔

اگرچہ ہندستانیوں کے ہر فرقے اور طبقے اور ملت اور جماعت سے عیسائی اپنی تعداد حاصل کر رہے ہیں مگر سب سے زیادہ نام نہاد "نیچ" ذات کے لوگوں سے ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ بلا مبالغہ ہر سال لاکھوں ہریجن بدسلوکیوں، حقارتوں اور ناانصافیوں سے پریشان ہو کر اپنا آبائی دھرم چھوڑتے اور کسی نہ کسی عیسائی فرقے میں شریک ہو جاتے ہیں، جس میں بل کران کو کئی معاشی، سیاسی اور سماجی فایدے ہوتے ہیں۔

اگر ہمارے ہندو بھائی خواب غفلت سے جلد نہ چونک گئے تو ہندستان کا مسئلہ ہندو مسلم مسئلہ نہ رہے گا بلکہ ہندو مسلم عیسائی مسئلہ بن جائے گا اور عیسائی تثلیث (تین پن یا ترمورتی) کی مہر ہندستان کی تہذیب، شایستگی، سیاست و معیشت سے، سماج اور زبان پر ثبت ہو جائے گی۔ جنوبی ہند کے کئی علاقوں میں ہر تیسرا فرد عیسائی ہے۔ کئی بستیاں اور محلّے ہیں جہاں عیسائیوں کی مطلق اکثریت ہے کیا یہ ہندستان کے سیاسی مستقبل کا پیش عکس ہیں؟

عیسائیوں کی تعداد بڑھنے سے صرف ہندوؤں ہی کا نقصان نہیں بلکہ یہ اضافہ ہندستانی تمدّن کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔ کیونکہ عیسائی ہونے کے بعد سابق زمانے کے مسلمان اور ہندو رفتہ رفتہ فرنگی تہذیب، فرنگی لباس اور آخرکار فرنگی زبان اختیار کرتے ہیں اور فرنگی سیاست کا مُہرہ بن کر ہندستانیت کے مخالف یا کم سے کم ہندستانیت سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔

اگر مذہب کا اثر تہذیب، تمدن پر نہ پڑتا، اگر عیسائیت کے فروغ کی وجہ سے ہندستانی زبانیں، ہندستانی شائستگی، ہندستانی پہناوا، ہندستانی اخلاق و کردار متاثر نہ ہوتے تو عمرانیات اور علم تمدن کے نقطۂ نظر سے اعتراض اور افسوس کرنے کا کسی کو حق نہ ہوتا مگر اب صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے، اگر ہم نے، خاص کر ہندوؤں نے اپنے بچاؤ کی فکر نہ کی تو عیسائیوں کا بڑھتا ہوا سیلاب ہندستانی تہذیب کو مٹا کر رہے گا اور ہمارے ملک کے کروڑوں باشندوں کی حالت امریکہ کے کالے رنگ کی آبادی کی طرح ہو جائے گی۔ اُن بیچاروں نے اپنا مذہب چھوڑ دیا، زبان بُھلا دی، اصلی نام چھوڑ دئے، قدیم پہناوا، رسمیں، سب کچھ تج کر پورے طور پر فرنگیت میں ڈھل گئے پھر بھی اجنبی کے اجنبی رہے اور مساوات یا کامل حقوق حاصل نہ ہوئے۔ اگر سارا ہندستان عیسائی ہو جائے تو بھی اس کو مساوات حاصل نہ ہوگی البتہ جب تک ہندستانی عیسائیوں کی ایک جماعت ہوگی جو سامراج کے پیش دستے کے طور پر ہندستانیت کے خلاف استعمال کی جائیگی اس وقت تک اُس جماعت کے ارکان کو دنیوی فایدہ ہوگا۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ اپنی تہذیب کے بچاؤ کے لئے ہر طرح کوشش کریں اور اپنی متناسب تعداد کو اور زیادہ گھٹنے نہ دیں۔

(۵) یم دیوتا کے چرنوں پر بھارت ماتا کی بھینٹ

یعنی

ملک الموت کی خدمت میں ہندستان کا نذرانہ

۱۹۳۱ء کی سرکاری روئداد میں دی ہوئی شرح کے مطابق اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر سال ہندستان میں ہیضے، چیچک ...

طاعون جیسی قابل انسداد بیماریوں میں مبتلا ہو کر مرنے والوں کی تعداد تقریباً چھ لاکھ ہے۔

جدید عمرانیاتی اصطلاحوں میں سے ایک اصطلاح جو بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے PREVENTABLE DEATHS ہے۔ ہر شخص کو اور ہر جاندار کو ایک نہ ایک روز مرنا ہے پھر "قابل انسداد موت" کے کیا معنے؟ اس کے معنے ایسی بیماریوں میں مبتلا ہو کر اور ایسی وجہوں سے مرنا ہے جنھیں انسانی عقل اور تدبیر کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہیضہ، چیچک اور طاعون جیسی بیماریاں، فاقے اور قحط سب اسی قسم کی وجہیں ہیں۔ جب سے مغرب میں تہذیب کا پرچم لہرانے لگا ہے قحطوں اور وباؤں کی قابل شرم ظلمات صرف مشرق تک محدود ہو گئی ہے اور انھوں نے خاصکر چین اور ہندوستان میں بسیرا کیا ہے۔

طوالت کا موقع نہیں، اور حوالے پیش کر کے حساب کی توضیح کرنا بھی ممکن نہیں۔ آپ صرف بھروسا کر کے مان لینا چاہتے ہیں تو سن لیجئے کہ ہمارے ملک میں ہر سال دس لاکھ قابل انسداد موتیں ہوتی ہیں۔ اور یہ تعداد گویا فرشتۂ موت پر ہندوستان کی طرف سے انسانوں کی قربانی ہے! قابل فخر قربانی نہیں بلکہ شرمناک قربانی!

یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میرا اندازہ بالکل بے بنیاد نہیں میں صرف ہیضے سے واقع ہونے والی موتوں کا حوالہ دیتا ہوں۔ ۱۹۳۰ء کی سرکاری رپورٹ کے مطابق ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء کی دو دہائیوں میں چالیس لاکھ افراد صرف ہیضے کی وجہ سے قبل از وقت موت کا شکار ہوئے انھیں موت نہیں آئی تھی، انہیں ہندوستان کے راج اور سماج نے مارا تھا۔

خاتمہ ابھی بہت سے تمدنی مسئلوں پر اعداد و شمار کی روشنی میں تبصرہ کرنا باقی ہے جنھیں بعد میں کتابی شکل میں پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ایک اور تقابلی نسبت ملاحظہ کیجئے اور غور فرمائیے کہ ہمارے ملک میں کتنی جانیں ضائع ہو رہی ہیں۔ زچاؤں اور ماؤں کی شرح اموات کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقف کار نے لکھا ہے کہ ہندستان میں ماؤں کی شرح اموات انگلستان سے سات گنی زیادہ ہے۔ ہزار زچاؤں میں سے انگلستان میں تین مرتی ہیں اور ہندستان میں اکیس[21]! اتنی جانی قربانیوں کے بعد بھی ہندستان کا اپنی اعلیٰ تہذیب، اور شائستگی اور سب سے زیادہ اپنی "روحانیت" پر ناز کرنا کیا جائز ہو سکتا ہے؟

عہدِ اکبری میں سنسکرت کتب و فارسی تراجم

از: — ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

اگر ابتدائی تاریخ اسلام سے دیکھا جائے تو مسلمانوں نے اکثر قدیم ہندستانی کتب کے عربی تراجم کئے ان میں سے آج کلیلہ و دمنہ خاصکر قابل ذکر ہیں مگر اس کے بعد ابو صالح شعیب بن جامع نے ایک اور کتاب کا عربی ترجمہ کیا جسے آج کی تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ یہ مہابھارت تھی اس کو ۴۱۲ھ میں ابو الحسن علی بن محمد الجبلی خازن کتب خانہ جرجان نے فارسی میں ترجمہ کیا اور اس فارسی ترجمہ کو مصنف مجمل التواریخ والقصص نے ۵۲۰ھ میں اپنی اس تالیف میں ہندستان کے حالات کے ضمن میں استعمال کیا جو دراصل سنجر سلجوقی کا زمانہ تھا اسی طرح زمانہ مابعد میں جب مسلمان ہندستان پر قابض ہو گئے تو انھوں نے اس طرف مزید توجہ کی اور مغل دور کے ابتدا تک بیشمار کتب مسلمانوں کے عہد میں فارسی میں منتقل ہوئیں جو ہندستان میں مسلمانوں کی درباری زبان تھی جس پر ایک ایک مقالہ لکھا جا سکتا ہے چونکہ ہمیں یہاں پر بالخصوص عہد اکبری کے متعلق بیان کرنا مقصود ہے اس لئے اصل موضوع سے دور نہیں جانا چاہئے۔

اکبر ۹۶۳ھ میں تخت نشین ہوا جبکہ وہ قریب پندرہ سال کی عمر کا تھا مگر اس کے آبا و اجداد بابر و ہمایوں جنھوں نے دراصل ہندستان میں سلطنت مغلیہ کی داغ بیل ڈالی ان کو کوئی ایسا موقع نہیں ملا حالانکہ وہ علم و صداقت کے نہایت اعلیٰ پایہ کے قدردان ضرور تھے۔ اکبر کے متعلق بے بنیاد وجوہات کی بنا پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ بالکل ناخواندہ تھا اور پڑھ لکھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن اب ثابت ہو چکا ہے کہ ایسا نہیں تھا ہاں یہ ضرور ہے وہ دیگر علما و ماہرین کے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا اور قدرت نے اس کو نہایت قوی حافظہ عطا کیا تھا جس سے اس نے خوب فائدہ اٹھایا۔ یعنی جو علوم و فنون انسان مطالعہ کر کے پیدا کرتا ہے اس نے اکثر محض سن کر حاصل کئے اور اسی مطلب کے لئے اس کے دربار میں لوگ مقرر تھے جو شب کو اس کے سونے سے پیشتر یہ فرائض ادا کرتے تھے اور قصہ خوانی کرتے تھے۔ ان میں دربار خان بن سلطان خان جو قبل ازیں شاہ طہماسپ کا قصہ خواں تھا۔ اسکندر خاں

جو بعد میں جہانگیر کے ہاں بھی معزز ہوگیا تھا جسے عام طور پر شیریں زبان بھی کہتے تھے اور ہاشم خاں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں یہی وجہ ہے اکبر نے صرف سُن سُنا کر علوم مذاہب و تاریخ تمدن میں بہت کچھ حاصل کرلیا تھا۔

مختلف مذاہب کے لوگ اس کے ہاں آتے اور وہ اُن سے مختلف مسائل پر گفتگو کرتا اور یہاں تک کہ اس نے ایک فتحپور سیکری میں عبادت خانہ بنایا جہاں یہ عام بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ اسی چیز نے اس کو جرأت دلائی تو اس نے ایک دار الترجمہ قائم کیا جس میں ماہرینِ لسانیات نوکر رکھے گئے ان لوگوں نے عربی۔ فارسی۔ یونانی۔ سنسکرت (ہندی) کتب کا ترجمہ کیا چونکہ ہندستان میں مقابلۃً ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی اس لئے ان کے علوم و مذہب کی کتب کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔

مہابھارت۔ جو ہندستان کی قدیم تاریخ کورو پانڈو کے واقعات پر مشتمل ہے۔ نقیب خاں۔ ملا عبدالقادر بدایونی اور شیخ سلطان تھانیسری کو حکم دیا گیا کہ اس کا ترجمہ کیا جائے جنھوں نے اس کا ترجمہ کیا جس کے ایک لاکھ اشعار ہیں جب ترجمہ ختم ہوا تو اس کا نام "رزم نامہ"[۲] قرار پایا۔

چونکہ عبدالقادر بدایونی ان میں شامل تھا اس نے ایک مفصل[۳] بیان اس کے متعلق اپنی منتخب التواریخ میں دیا ہے کہ ۹۹۰ھ میں اکبر نے اس کا حکم دیا۔ اور اکبر نے خود اس میں اسقدر دلچسپی لی کہ لائق پنڈتوں کو ان مسلمان علماء کو مدد دینے کے لئے ہدایت کی اور خود کئی راتیں نقیب کو مہابھارت کی شرح کرنے میں مدد دیتے ہوئے صرف کیں تاکہ وہ اس کا مطلب فارسی میں تیار کرے ملا و حصہ ترجمے کرنے کے بعد کسی اور کام میں معروف ہوگیا اس کے بعد ملا شیری نے حصہ لیا یعنی نقیب خاں اور ملا شیری نے ایک حصہ ختم کیا اور ایک حصہ سلطان حاجی تھانیسری نے ختم کیا شیخ فیضی اس ترجمہ یا خلاصہ مہابھارت کی عبارت آرائی پر مامور ہوئے۔ فیضی نے مشکل سے دو حصے نظم و نثر میں کئے

قلمی فارسی رزم نامہ پر یہ لکھا[۴] ملتا ہے کہ نقیب خاں نے ۹۹۲ھ میں اس ترجمہ کو ختم کردیا حالانکہ بدایونی کے حساب کے مطابق نقیب خاں کے بعد سلطان حاجی نے چار سال میں ختم کیا۔

اس ترجمہ پر شیخ ابوالفضل نے ایک مقدمہ بھی ۹۹۵ھ میں لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ اس لئے اختیار کیا گیا کہ ہندو مسلمانوں میں باہمی عمدہ تعلقات پیدا کئے جائیں ممکن ہے کہ دیگر اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہو ورنہ خاص خود زبان سنسکرت کا کمال تھا جس نے ابتدا سے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا اور اکبر سے پیشتر بھی کافی تراجم ہوئے جب یہ ترجمہ ختم ہوا تو فرمان صادر ہوا کہ اسے مصور کیا جائے۔ اتفاق حسنہ سے جے پور کے پوتھی خانہ (کتب خانہ) میں اکبر کا وہ نسخہ موجود ہے جس میں ایک سو چھیاسٹھ تصاویر ہیں اور یہ نسخہ خواجہ محمد شریف امین خواجہ عبدالصمد کی زیر نگرانی مصور

---

[۱] طبقات اکبری۔ ص ۵۱۰

[۲] آئین اکبری۔ ج۔ ص ۱۰۳-۵

[۳] منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۱۹

[۴] فہرست مخطوطات فارسی۔ برٹش میوزیم لنڈن۔ ص

ہوا جو خود اعلیٰ درجہ کا مصور اور خطاط تھا۔ اسکو مرید در چہار مرتبہ اخلاص لکھا ہے یعنے اکبر کے دین الٰہی میں وہ اونچا درجہ رکھتا تھا۔ بدایونی کے بیان کے مطابق اور نسخے بھی تیار ہوئے ہونگے کیونکہ اکبر نے فرمان دے دیا تھا کہ تمام امراء اس کے نسخے لیکر نقول حاصل کریں راقم کی نظر سے دو اور معتبر نسخے آئے جو اکبری عہد کے مصور ہیں۔

راماین۔ انھیں متذکرہ فضلا نے راماین کا ترجمہ بھی کیا جس کے لئے ۹۹۶ھ میں فرمان ہوا[1] اور یہ کتاب بقول بدایونی مہابھارت سے زیادہ بلند مرتبہ ہے جسے اس نے ۹۹۹ھ[2] میں ختم کیا اور اسی پر یہ شعر لکھ کر خدمت شاہی میں پیش کیا

ما قصۂ نوشتیم بہ سلطاں کہ رساند
جاں سوختہ کردیم بہ جاناں کہ رساند

اس کا ایک مصور نسخہ جو عہد اکبری کے مصوروں کا کام ہے۔ کرنل ھنا کے مجموعہ لنڈن میں موجود ہے جس کے اندر ایک سو انتیس[129] تصاویر ہیں۔ جہانگیر کے عہد میں از سر نو ملا شیخ سعد اللہ مسیح پانی پتی نے فارسی نظم میں ترجمہ کیا۔

اتھروید۔ اسی طرح اکبر نے ملا بدایونی کو اتھروید کے ترجمہ کے لئے کہا مگر آئین اکبری میں ملتا ہے کہ اس کا ترجمہ حاجی ابراہیم سرہندی نے کیا اور یہ کتاب ہندوؤں کی چار الہامی کتابوں میں سے ایک ہے اس میں بدایونی کو بہت سی مشکلات پیش آئیں جن کو اس کا مددگار شیخ بھاون نو مسلم دکنی بھی حل نہ کر سکا جب اس نے یہ امر اکبر کے گوش گزار کیا تو اس نے حاجی ابراہیم اور فیضی کو ترجمہ کے لئے حکم دیا غالباً اسی وجہ سے آئین اکبری میں یہ ترجمہ حاجی ابراہیم کی طرف منسوب ہے۔

ہربنس۔ جو محض حیات کرشن پر مشتمل ہے ملا شیری نے ترجمہ کی[3]۔

جوگ باشسشت۔ جو در اصل[4] والمیکی کی تصنیف ہے اور اس میں رامچندر جی کے نصائح وغیرہ ہیں۔ ترجمہ ہوئی جسے بعض نے فیضی کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ جو مصور ہے دربار اکبر کے مصورین کے کام کا بہترین نمونہ ہے وہ لندن میں مسٹر چسٹر بیٹی کے مجموعہ میں ہے اس کے مقدمہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس کا ترجمہ فرمولی نے کیا (نسبت بہ قریہ "فرمول") اکبر کے عہد کا یہی ترجمہ جوگ باشسشت دارا شکوہ نے ایجاز کر کے از سر نو کرایا دارا شکوہ کے اس ترجمہ کے ابتدا میں مترجم کا نام تو نہیں ہے مگر منشی سبحان رائے سنالوی نے اپنی تالیف خلاصۃ التواریخ کے بعد میں لکھا ہے کہ یہ ترجمہ شیخ احمد کا کیا ہوا ہے۔

بھگوت گیتا۔ تاریخ کے اوراق سے یہ کم پتہ چلتا ہے کہ اس کا ترجمہ کس نے کیا مگر اس کے جو نسخے جو عام ملتے ہیں ان میں فیضی کا نام بھی آتا ہے۔ اور یہ ترجمہ فیضی فارسی نظم میں طبع بھی ہو چکا ہے اس کے اندر سات سو پینتالیس اشعار ہیں۔

---

[1] بدایونی ص ۳۶۶/۲ وخطبہ ڈاکٹر تارا چند۔ انڈین ہسٹری کانگرس اجلاس کلکتہ۔ ص ۹۱۴
[2] بدایونی ایضاً
[3] آئین اکبری۔ ایضاً
[4] فہرست کتب خانہ مسٹر چیسٹر بیٹی۔ وخلاصۃ التواریخ ص ۷

یہ بھگوت گیتا دراصل مہابھارت کا ایک حصہ ہے اس لئے ہندوؤں نے بھی اس میں کافی دلچسپی لی ہے اور عام طور پر سنسکرت
تاب کے اندر سات سو بیس اشعار ملتے تھے مگر حال ہی میں پنڈت راجا ویدجیو کالیداس نے ایک نسخہ بھگوت سنسکرت
شائع کیا ہے جس کے اندر وہی تعداد سات سو پینتالیس جو فیضی کے ترجمہ میں ہے موجود ہے۔ لہٰذا فیضی نے صحیح دراصل نسخہ کا
ترجمہ کیا تھا

نلدمن۔ اکبر نے فیضی کو خاص طور پر فرمان دیا کہ ہندی (سنسکرت) میں جو قصہ نل دمن[12] ہے فارسی نظم میں ترجمہ
کرو جسے فیضی نے لیلیٰ مجنوں کی بحر میں لکھا اور اس کے بعد مشہور خاص و عام ہوا۔

لیلاوتی۔ جو قدیم سنسکرت مجلّد ریاضیات میں ہے فیضی نے اس کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اس سے پیشتر یہ کتاب
ریاضیات لیلاوتی مصنفہ بھاسکراچارج گمنامی کے پردہ میں تھی۔

سنگاسن بتیسی۔ بدایونی کے بیان کے مطابق ۹۹۲ھ میں جب اکبر شیر گڑھ میں مقیم تھا (جس سرزمین کو
قنوج کہتے ہیں) سنگاسن بتیسی جو بتیس قصص پر مشتمل ہے۔ جس میں راجہ بکرماجیت (مالوہ) کے واقعات بیان کئے گئے
ہیں اور اپنے طرز بیان میں طوطی نامہ کے مشابہ ہیں۔ ملّا بدایونی نے اکبر کے حکم سے نظم و نثر میں ترجمہ کیا اور اس ترجمہ کا
نام "نامہ خرد افزا" رکھا۔ جو دراصل سنگاسن بتیسی کے ترجمہ کی تکمیل ہے۔ اکبر نے اسے پسند فرمایا اور اپنے کتب خانہ میں
رکھا۔ غرضکہ یہ کتاب نامۂ خرد افزا کے تاریخی نام سے مشہور ہوئی۔

کشن جوشی
گنگا دھر　} مطابق آئین اکبری[13] ان کا ترجمہ فارسی ابوالفضل کی طرف منسوب ہے۔
مہیش مہانند

تاجک۔ جو فلکیات[14] کے موضوع پر ہے اکبر کے حکم سے محمد خان گجراتی نے ترجمہ کی۔

طب فیل۔ میر علاؤ الدولہ[15] نے اپنے تذکرہ میں اکبر کے حالات کے تحت لکھا ہے کہ اسے ہاتھیوں کا بہت شوق
تھا۔ اسی سے اس نے ملّا شیری سے ایک سنسکرت رسالہ طب فیل میں ترجمہ کرایا تھا جسے ملّا شیری نے فارسی
نظم میں منتقل کیا۔

کتھا سرت ساگر۔ بدایونی[19] نے لکھا ہے کہ مجھے حکم ہوا کہ ان حکایات کا ترجمہ مکمل کروں جن کا ایک قصہ
سلطان زین العابدین کشمیری کے حکم سے ترجمہ ہوا تھا اور اس کا نام بحر الاسمار رکھا گیا تھا مگر بدایونی نے اپنی تاریخ

---

[12] آئین اکبری فہرست کتب خانہ مسٹر چیسٹر بیٹی۔ و خلاصۃ التواریخ صفحہ
[13] ایضاً　ایضاً
[14] بدایونی صفحہ ۱۹۶
[15] آئین اکبری　ایضاً
[17] ایضاً
[18] دربار اکبری۔ مطبوعہ لاہور صفحہ
[19] وولزلے ولیم۔ صفحہ ۵-۲۴۹　ڈاکٹر مسوری و بدایونی صفحہ ۲-۱۰۱ ترجمہ انگریزی۔

میں اس کا اصل سنسکرت نام نہیں دیا جس کے لئے ملا کو پچاسی ہزار تنکہ انعام بھی ملا مگر حال ہی میں ڈاکٹر سٹوری نے ثابت کیا ہے کہ یہ ترجمہ کتھا سرت ساگر کا ہے جسے ابتداء میں سنسکرت زبان میں کشمیری براہمن سوم دیو نے تصنیف کیا تھا اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے جسے فیضی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سٹوری کے سامنے اس کو بدایونی کی طرف منسوب کرنے کیلئے تین وجوہات ہیں۔ ایک تو اس کا موضوع بحرالاسمار کے مترادف ہے۔ یہ ترجمہ اکبر کے عہد کا ہے اور اس کا اصل مصنف کشمیری پنڈت سوم دیو تھا۔

عیار دانش - جو کبھی سنسکرت سے کلیلہ دمنہ کے نام پر عربی میں ترجمہ ہوئی تھی ابوالفضل نے از سر نو عیار دانش کے نام پر فارسی کا جامہ پہنایا۔

اتنے تراجم کے بعد ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ مسلمان فضلا واقعی سنسکرت کے بہت بڑے علامہ تھے۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ لوگ زبان سے ضرور کسی قدر واقف تھے۔ مگر یہ کہنا کہ وہ اس پر پوری طرح حاوی ہوں گے نا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ نقیب خاں کے اپنے بیان کے مطابق مہابھارت کے ترجمہ میں اس کی مدد سرودیو، ستوابن، مادھو سودھن۔ اور چتر بھوج نے کی بلکہ بدایونی نے خود بیان کیا ہے کہ اکبر نے پنڈتوں کو جمع کرکے ان کو ان مترجمین کی مدد کے لئے متعین کیا۔ اور اس نے خود ایک نو مسلم دکنی شیخ بھاون سے مدد لی۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ تراجم کوئی لفظ بلفظ تراجم نہ تھے بلکہ ان سنسکرت کتب کے صحیح مطالب یا خلاصہ کے طور پر تھے۔

بہرحال اخیر میں ایک امر ضرور واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی اس کوشش کا جو نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے کہ یہ تراجم عوام کے لئے مہیا ہو گئے مگر اس کے علاوہ یہ ایک زبردست فائدہ ہوا کہ اکبر کی اس کوشش سے سنسکرت کتابوں کے متن زیادہ محفوظ ہو گئے کیونکہ جب اس کی توجہ سے یہ ترجمہ کے لئے استعمال ہوئی تو یہ لازمی تھا کہ ان کے متنوں کی طرف بھی خاص توجہ ہوئی۔ مزید برآں یہ کہ ہندوؤں کو فارسی زبان پڑھنے کا موقع ملا اور ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ہندو فضلا فارسی دانی میں بڑے بڑے مسلمان فضلا سے سبقت لے گئے۔ غرضکہ یہ سنسکرت کی مقدس کتابیں مطالعہ کے لئے عام ہو گئیں اور یہ تھا صحیح معنی میں ایک ملک کے کلچر کا پورا پورا تحفظ جو مسلمانوں نے اس ملک میں کیا اور آج یہ چیزیں اوراق پریشاں ہونے سے محفوظ ہیں۔

۱؎ مطبوعات فہرست برٹش میوزیم صفحہ ۱۰۱-۲ ترجمہ انگریزی

مولانا شبلی نعمانی

از :۔۔۔۔۔۔ ریاست علی ندوی

یہ مقالہ علامہ شبلی مرحوم کی برسی کے موقع پر ۱۸ر نومبر ۴۳ء کو شبلی انٹرکالج اعظم گڑھ میں پڑھا گیا۔ اور جسے علامہ مرحوم کے جانشین مولانا ڈاکٹر سید سلیمان ندوی (ڈی لٹ) کی ایک ہزار صفحوں کی مفصل تصنیف "حیات شبلی" کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ اور اشاعت کے لئے "نئی زندگی" میں بھیجا گیا۔

(ایڈیٹر)

مولانا شبلی مرحوم نے اس دیار میں آنکھیں کھولی تھیں جس کو شاہجہاں نے "شیراز ماست" کے لقب سے یاد کیا ہے ہندستان کو خراسان۔ ماوراء النہر عراق و عجم کے تیغ آزماؤں نے فتح کیا تھا۔ قطار در قطار علماء ان ملکوں سے ہندستان آئے اور اسلام کے دارالسلطنت دلی میں آکر ٹھہر گئے۔ یہی زمانہ تھا جب دلی میں علم و دین کے ایک ہزار مدرسے قائم تھے۔

پھر اسلام کے علم و فضل کا قدم پورب کی سمت میں بڑھتا گیا۔ دلی سے نکلا تو پہلی منزل بدایوں ہوئی پھر گنگا کے دہانے پر صوبہ اودھ۔ پھر آگے بڑھ کر جونپور۔ ظفرآباد علم کے مرکز بنے۔ یہاں تک کے ایک خطۂ ارض کا نام "ملک پورب" پڑا جس کی وسعت میں قنوج بہرائچ اور الہ آباد سے لے کر بہار اور ترہٹ تک کا علاقہ داخل تھا۔ دلی پر جب جب خزاں آئی۔ پورب میں بہار کا دور آیا۔ پورب میں علمی ترقی کے چار دور ہیں۔ ایک سلطنت شرقی کا عہد۔ دوسرا لودیوں کا۔ تیسرا تیموری سلاطین میں شاہجہاں اور عالمگیر کا زمانہ۔ اور چوتھا اودھ کی نوابی کا اختتام۔

آخری زمانہ میں دلی میں جب تیموریوں کا چراغ گل ہو رہا تھا اس زمانہ میں پورب میں نئے مدرسوں کی [illegible] اور حنفی و اہل حدیث سلسلے میں مدتوں مناظرہ کا بازار گرم رہا۔ یہی وہ مذہبی ماحول تھا جس میں مولانا شبلی مرحوم کی تربیت کا [illegible]

اعظم گڈھ۔ ایک نئی آبادی ہے۔ مگر اس کے مردم خیز قصبات پرانے ہیں۔ اور اس کے مشاہیر باہر کی دنیا میں پرنوری ہوکر رونما ہوئے۔ اعظم گڈھ کے مردم خیز قصبہ بندول میں ہی وہ مسلم خاندان آباد ہے۔ جس میں مولانا شبلی مرحوم کی پیدائش ہوئی۔ اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی "کیا عجیب بات ہے کہ ایک ہندی نژاد آگے چل کر اس قابل ہوا کہ رسول مطلبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مدارج سے دنیا کو آشنا کرے۔ فاروق اعظم کی سطوت وعظمت کا دلوں میں سکہ بٹھائے"۔

ولادت نام، تعلیم وتربیت

مولانا مرحوم کی ولادت ماہ ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق مئی ۱۸۵۷ء میں عین اس ہنگامہ خیز زمانہ میں ہوئی جو عام طور سے "غدر" کے نام سے مشہور ہے۔ اور ٹھیک اس دن ولادت ہوئی جب شہر اعظم گڈھ میں باغیوں نے ڈسٹرکٹ جیل کے پھاٹک کو توڑا۔ والدین نے بچہ کا نام شبلی بغدادی کے معروف نام پر محمد شبلی رکھا۔ ابتدائی تحریروں میں اپنا نام وہ محمد شبلی لکھتے تھے۔ بعد کو صرف شبلی کر دیا۔ پھر استاد نے اپنی عقیدت کے غلو سے اپنے شاگرد کو نعمانی کہہ کر پکارا جو بعد کو شاگرد کے نام کا جزو بن گیا۔

مولانا کی والدہ مذہبی تھیں۔ مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ بھی اس زمانہ تک نئے زمانہ کی آب وہوا سے ناآشنا تھے۔ مولانا نے ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ پھر اعظم گڈھ کے مدرسہ عربیہ میں داخل کئے گئے۔ جس کے بانیوں میں مولانا مرحوم کے والد بھی تھے۔ اس کے بعد مرکز علم جونپور کا رُخ کیا۔ اس کے بعد مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی سے حصول فیض کا دور آیا۔ جو ان دنوں رئیسِ غازی پور میں مدرس تھے۔ استاد و شاگرد میں معنوی ربط بڑھا۔ بالآخر شاگرد کی کشش استاد کو اعظم گڈھ کھینچ لائی۔ مولانا شبلی جیسا طباع تلمیذ اور مولانا فاروق کا سا متبحر استاد! فیض تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اسی زمانہ میں مولانا فاروق اکثر فخریہ کہا کرتے "انا اسد وانت شبلی" یعنی میں شیر ہوں اور تو بچۂ شیر۔

درسیات کی تکمیل کے بعد مولانا دوسرے خرمنوں سے خوشہ چینی کے لئے ہندستان کے مختلف گوشوں میں پھرتے رہے۔ چنانچہ رام پور پہنچ کر مولانا ارشاد علی رامپوری سے فقہ کی تحصیل کی۔ مولانا فیض الحسن اورنٹیل کالج لاہور سے وابستہ تھے۔ کالج کے بعد جو وقت بچتا وہ بقیہ دوسرا وقت بھی خالی نہ تھا۔ لیکن مولانا شبلی کے عزم راسخ اور مولانا فیض الحسن کے ذوق افاضہ نے طے پایا کہ مکان سے کالج تک کی مسافت طے کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اس میں مولانا ادبیات کا درس لیا کریں۔ مولانا میں صحیح عربی ادب کا ذوق اسی تعلیم اسی درس کا ایک نقشہ تھا۔

اسی زمانہ کا دستور تھا کہ طلبہ ہر قسم کے علوم وفنون سے فراغت پالینے کے بعد حدیث پڑھتے تھے۔ اسی اصول پر مولانا نے حدیث پر توجہ کی اور اس کے لئے نامور محدث مولانا احمد علی سہارنپوری کا انتخاب کیا جو اپنے زمانہ میں علم حدیث کے امام مانے جاتے تھے۔ اسی اثناء میں ان کے والد بزرگوار نے حج کا ارادہ کیا۔ مولانا کو بھی اس مبارک سفر کا شوق دامنگیر ہوا۔ اور سہارنپور سے بمبئی کو روانہ ہوئے۔

اس وقت مولانا کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔ طالب علمی کا پورا زمانہ ۱۴ برس رہا۔ یعنی ۱۲۷۹ھ ۱۸۶۲ء سے تعلیم شروع اور ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء میں تمام ہوئی۔

سفرِ حج اور عملی زندگی کا آغاز

حج کی سعادت کے علاوہ مدینہ منورہ کے کتب خانوں کی سیر کرنے سے سفرِ حج اور عملی زندگی نے مولانا کی نگاہ میں کچھ اور وسعت پیدا ہوئی۔ چنانچہ جب واپس آکر دُنیا کی عملی زندگی میں قدم رکھا تو سب سے پہلا قومی کام ۱۸۷۷ء میں اپنے شہر اعظم گڑھ میں انجام دیا۔ علامہ جمال الدین افغانی کی تحریکِ اتحادِ اسلامی (PAN ISLAMIC) کا اُن دنوں شباب تھا روس و روم کی جنگ اُسی سال شروع ہوئی۔ مولانا نے ترکوں کی حمایت میں تقریریں کیں اور اعظم گڑھ سے دو ہزار چھ سو روپے وصول کرکے ترکی سفیر بمبئی کے ذریعہ ترکی بھیجا۔ اس زمانہ میں مولانا ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۲ء تک اعظم گڑھ میں مقیم رہے۔ درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ دوسرا شغل شعر و شاعری تھا۔ ان دنوں ان اطراف میں تقلید و عدمِ تقلید کے مباحث کا شور مچ گیا تھا۔ مولانا شبلی نے بھی مناظرے کئے اور غیر مقلدین کے خلاف چند رسالے لکھے پھر اُردو شعر و ادب کے ذوق نے اس زمانہ کے ممتاز جرائد اودھ پنچ اور پیامِ یار سے دلچسپی لیتے رہے۔ اور کتابوں کے مطالعہ کا سلسلہ جاری رہا۔

اسی زمانہ میں مولانا کے والد بزرگوار کے سامنے مولانا کے کسبِ معاش کا سوال آیا۔ انھوں نے وکالت کے پیشہ کو موزوں سمجھا اور مولانا نے حکم کی تعمیل کے لئے امتحان دیا۔ کامیاب ہوئے اور ۱۸۸۱ء میں اعظم گڑھ میں . . . عارضی طور پر سرکاری ملازمت اور نیل کی تجارت کرنے کے بعد بالآخر بستی میں وکالت کرنے لگے۔ لیکن اسے افتادِ طبع کے خلاف محسوس کرتے ہوئے علی گڑھ کا سفر کیا سرسید سے ملاقات ہوئی۔ اور کالج میں مشرقی زبانوں کی معلمی پر اُن کا تقرر ہوگیا۔ اب یہاں سے مولانا کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔

مولانا اور علی گڑھ

سرسید نے اس جوہرِ قابل کو پرکھا۔ اور اپنے قریب کھینچ بلایا۔ ایک دوسرے کی قدر پہچاننے لگے۔ مولانا کو سرسید کے کتب خانہ سے محبت تھی۔ اور سرسید کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو علمی مسائل کی گرہ کشائی میں اُن کی مدد دے سکے۔ اب دونوں کی روزانہ ملاقات ضروری ہوگئی۔ تعلیم و تدریس کے علاوہ علی گڑھ میں مولانا کے ابتدائی مشاغل شعر و شاعری تک محدود تھے لیکن اُن کے اس مشغلے سے اب کالج اُن کے شعر و سخن کے چرچوں سے چہکنے لگا۔ نظم ایک ضروری چیز ہوگئی نئے خیالات نئے جذبات اور زمانہ کے نئے اثرات قدیم و جدید کی آمیزش کے نئے انقلابات مولانا کے گرد و پیش تھے۔ مولانا کی غیر معمولی بصیرت اُن کے فرق و امتیاز کو بھی دیکھ رہی تھی۔ چنانچہ جدید تعلیم پر انھوں نے جو پہلا تبصرہ کیا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ نئی تعلیم کی ظاہری چمک دمک سے اُن کی نگاہیں خیرہ نہیں ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے تحریک کے مفید اثرات کو قبول کیا چنانچہ ملت کی بربادی کا درد و احساس اُن کی قومی نظموں کا موضوع بن گیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۸۵ء میں مثنوی صبحِ اُمید لکھی جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی پر درد داستان کی شرح کے بعد نئی تحریک کی کامیابی پر ایک نئی صبحِ اُمید کے طلوع کی خوشخبری سنائی۔ یہ مثنوی بار بار چھپی اور مقبولِ عام ہوئی۔

علی گڑھ تحریک کا دوسرا اثر جو اُن پر ہوا وہ انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس ہے۔ ۲۰ جون ۱۸۸۳ء میں نیشنل سکول کے نام سے اعظم گڑھ میں ایک انگریزی مدرسہ جاری کیا۔ یہی وہ درسگاہ ہے جو آج شبلی انٹر کالج کے نام سے موسوم ہے۔

کالج کے ماحول میں مولانا کی عصری علم تاریخ کا ذوق پیدا ہوا۔ انھیں سرسید کے کتب خانہ میں عربی تاریخ و جغرافیہ

نادر کتابیں جو یورپ مصر و شام و قسطنطنیہ میں چھپی تھیں نظر آئیں۔ تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور یہیں سے اُن کے تاریخ اسلام کے مطالعہ کا نیا دور شروع ہوا۔

یوں تو مولانا میں تصنیفی ذوق پہلے سے تھا مگر سید کے کتب خانہ کے مطالعہ کے بعد تصنیفی ذوق کا محور بدل گیا۔ وہ الماریوں کے سامنے گھنٹوں کھڑے رہتے۔ کبھی تھک کر اُکڑوں بیٹھ جاتے۔ سرسید دیکھتے تو کرسی رکھوا دیتے۔ مولانا نے گبن کی رومن امپائر کا اُردو ترجمہ دیکھا۔ پھر بارکر کی حیات ہارون رشید دیکھی۔ تو اسی طرز پر ایک مکمل اسلامی تاریخ لکھنے کا خیال آیا۔ پھر نامور فرمانروایانِ اسلام کے سلسلے کا ارادہ کیا۔ اس اثنا میں وہ یورپ کی علمی تحقیقات سے آگاہ ہوتے جاتے تھے۔ انگریز پروفیسروں خصوصاً آرنلڈ سے ان کے غیر معمولی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ آرنلڈ ان سے عربی پڑھتا اور یہ اس سے فرانسیسی سیکھتے تھے۔ خصوصاً جدید رنگ اور جدید خیالات سے آگاہ ہوتے جاتے تھے۔ اسی زمانہ میں مصر سے نئی مطبوعات و تصنیفات کا سرمایہ نکلنے لگا۔ مولانا نے مصر سے براہ راست تعلقات قائم کیے اور مصر کے اخبار و رسائل میں ان کے مضامین چھپنے لگے۔ آگے بڑھ کر مولانا کے فضل و کمال کا شہرہ یورپ کے علما تک پہنچا تو انھوں نے بھی مولانا سے تعلقات پیدا کیے۔ اور کتابیں ہدیۃً آنے لگیں۔ مولانا نے کالج میں قرآن اور سیرت نبوی پر تقریروں کا سلسلہ جاری کیا۔ پھر مولانا نے کالج میں بیٹھ کر تالیف و تصنیف کا جو کام انجام دیا۔ اس نے کالج کے ماحول کو سراپا علمی رنگ میں رنگ دیا۔ مولانا محمد علی، مولوی عزیز مرزا۔ خواجہ غلام الثقلین۔ مولوی عبدالحق۔ سید سجاد حیدر یلدرم۔ سید محفوظ علی بدایونی، شیخ محمد عنایت اللہ اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ اس دور کے وہ تلامذہ ہیں جن کی زندگیوں میں علمی و ادبی رنگ نمایاں ہے۔ نیز انھوں نے اس زمانہ کی اپنی تمام تصانیف کالج کی نذر کیں کہ اس کی مالی امداد میں بھی حصہ لیا کہ ان کی کتابوں کے اڈیشن تین تین مہینہ میں ختم ہوتے۔ اور ان کی پوری آمدنی کالج کے نذر ہوتی۔ مولانا کالج یونین میں بھی حصہ لیتے۔ طلبہ میں تقریر کا سلیقہ پیدا کرتے۔ اس یونین میں جمہوری طرز حکومت کی تائید میں مولانا نے تقریر کی وہ کامیاب ہوئی۔ یہ سرسید کے مذاق سیاست کے خلاف تھا۔ انھوں نے اس کے خلاف تقریر کی۔ شبلی و سید کا پہلا ذہنی و فکری اختلاف تھا۔

سنہ ۱۸۹۲ء میں مولانا نے کتب خانہ اسکندریہ اور ۱۸۹۶ء میں الجزیہ پر مضمون لکھا جنھوں نے تحقیق کی دنیا میں ہلچل ڈال دی۔ چنانچہ ایک مجلس بنائی گئی کہ یورپ نے اسلام اور مسلمانوں کی نسبت جو تاریخی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں۔ اُن کی تصحیح کی جائے۔ مولانا اس مجلس کے سکریٹری بنائے گئے۔ پھر انسٹیٹیوٹ گزٹ کے اُردو حصہ کی ادارت سپرد ہوئی۔ [illegible] بھی چھپے۔ ۱۸۹۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنا پڑی۔ اس کے اجلاسوں میں مولانا کی تقریریں اور نظمیں عجیب [illegible] پیدا کرتی گئیں۔

یورپ نے ایک اسلام کی تاریخ کو اس رنگ میں پیش کیا تھا کہ نئی نسل کو خود اپنی قوم سے نفرت ہونے لگے۔ مولانا نے اس چال کو سمجھا اور اپنے قلم کو جنبش دی۔ اسی سلسلہ میں اُن کی پہلی تصنیف مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ہے جو [illegible]ء میں لکھی۔ مسلمانوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے کارناموں کی یہ پہلی آواز تھی۔ سارے ملک میں اس کی دھوم مچ گئی۔ [illegible] طرز کی سوانح عمری المامون بھی اسی سال شائع ہوئی اور بے حد مقبول ہوئی۔ [illegible] ۱۸۹۲ء میں

ریاست رام پور کے سرکاری کتب خانہ کے جائزہ کے لئے بلائے گئے۔ تیسری تصنیف ۱۸۸۹ء میں سیرۃ النعمان شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھی ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ جب ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ کا وفد سرسید کی قیادت میں حیدرآباد جانے لگا تو مولانا اس میں خاص طور پر شریک کئے گئے۔ اور وہاں ایک زبردست اجتماع میں اپنا مشہور فارسی قصیدہ پڑھا۔ اور ایک سماں باندھ دیا اس کے بعد والیہ بھوپال نے علی گڑھ کی طرف مولانا کے توسط سے پہلی مرتبہ توجہ کی۔

۱۸۹۱ء میں مولانا کی صحت خراب ہوئی۔ تو کشمیر کی سیاحت کا خیال پیدا ہوا۔ اور اسی سفر کے تخیل سے روم و شام کے سفر کا خیال پیدا ہوا۔ اسی اثنا میں مسٹر۔ لملذ ولایت جانے لگے مولانا نے رفاقت کا یہ سامان دیکھ کر رخت سفر باندھ لیا۔ اور ۲۶ اپریل ۱۸۹۲ء میں علی گڑھ سے روانہ ہوگئے۔ مولانا کو ٹرکی سے دلی عقیدت تھی۔ مولانا نے اس سفر میں مصر و قسطنطنیہ اور شام کی سیاحت کی کتب خانوں کی دل بھر کے سیر کی۔ الفاروق کے لئے اقتباسات لکھے۔ مدارس کا معاینہ کیا۔ اور ان ملکوں میں قدیم و جدید تعلیم کی آمیزش اور اس کے تاثرات کو قلم بند کیا۔ مولانا کی علمی شہرت ان ملکوں میں پہلے پہنچ چکی تھی۔ مجاہد بلونا عثمان پاشا نے اُن کے ہاتھوں کو چوما۔ اور رخصت کے وقت سلطان کی طرف سے قیمتی اعزاز "تمغہ مجیدی مبارک" اور ایک فرمان عطا کیا گیا۔

مولانا جب اس مبارک سفر سے لوٹے تو کالج کے مختلف حلقوں اور اطراف ملک سے تہنیت کے پیغام آئے۔ ۱۸۸۸ء میں روم و یونان کی جنگ ہوئی۔ جس میں انگریزوں کی ہمدردی یونان کے ساتھ تھی۔ کامیابی ترکوں کو نصیب ہوئی۔ ہندستان کے مسلمانوں نے دھوم دھام سے خوشی منائی۔ مولانا سفرنامہ لکھنا چاہتے تھے۔ مگر کالج کی بہبودی کے خیال سے طے پایا کہ اس سفرنامہ میں شہد ہی شہد رہے گا۔ کوئی زہریلی چیز نہ ہوگی۔ تاہم اس سفرنامہ نے مسلمانوں کے دلوں میں ترکی کی محبت کا بیج بویا۔ اور انگریزوں نے مولانا کے اس گناہ کو کبھی معاف نہیں کیا۔ یہ سفرنامہ ہی وہ پہلی کتاب ہے جس کو مولانا نے کالج کے بجائے اپنی طرف سے ۱۸۹۴ء میں چھپوایا۔

۱۸۹۴ء میں ان کا فارسی کلیات چھپا اور پھر ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۸ء تک کے محققانہ تاریخی مضامین کا مجموعہ رسائل شبلی کے نام سے چھپا۔ ان مضامین نے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کے آئینہ سے اس گرد و غبار کو صاف کیا۔ جو یورپین تعصب کی آندھی نے اُس پر ڈال رکھا تھا۔ اب الفاروق کی تصنیف کا دور آیا۔ اور اس تصنیف کے تخیل سے بھی شبلی و سرسید کے تعلقات کے شیشہ میں بال آگیا سرسید کو گمان ہوا کہ کہیں یہ تصنیف کالج کے ہمدردوں میں سنی و شیعی کا فرق نہ پیدا کر دے۔ سرسید نے بہ ملامت مخالفت کی۔ مگر بقول مولانا کے "اس تصنیف کا غلغلہ اُس کے عالم وجود میں آنے سے پہلے بلند ہو چکا تھا" اس کی اشاعت نے مولانا کی شہرت کے آفتاب کو نصف النہار پر پہنچا دیا۔ سرسید کی طرف سے ایک تحریک ہوئی کہ کسی صورت اس نادرہ روزگار کی انگریزی حکومت قدرشناسی کرے ۱۸۹۴ء میں مولانا کو شمس العلما کا خطاب دینے کا اعلان کیا گیا جو اس وقت تک کسی کو نہیں ملا تھا۔

اس کے بعد ۱۸۹۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی نے مولانا کو اپنی فیکلٹی آف آرٹس (شعبہ فنون) اور بورڈ آف اسٹڈیز (شعبہ تدریس) کا ممبر بنایا۔ اور وہ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں قدیم کتابوں کی اشاعت کی تجویز ملک کے

سامنے پیش کی۔ دائرۃ المعارف حیدرآباد کو اس کا پروگرام بنا کر دیا۔ ایک علمی مجلس "احیاء المعارف النعمانیہ" بعض مخلصوں کے ہاتھوں عالم وجود میں آئی۔ ان دونوں مجلسوں کے خدمات آج بھی جاری ہیں۔

اب مولانا علی گڑھ کی کشمکش سے گھبرا کر یکسوئی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں حیدرآباد تشریف لے گئے اور اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں نے از راہ قدردانی سو روپئے ماہانہ کا وظیفہ منظور فرمایا۔ تمام عہدہ داروں اور اکابرین و علماء نے پاس خاطر پیش کیا۔ میر عثمان علی خاں نے اس وظیفہ میں دو سو کا اضافہ کر کے تین سو کر دئے۔ جو آج بھی دار المصنفین کے نام جاری ہے۔

اگرچہ مولانا کو شمس العلماء کا خطاب مل چکا تھا۔ مگر انگریزوں کی بدگمانی اُن سے دور نہیں ہوئی تھی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں کالج کے ایک جلسہ میں مولانا نے ایک قصیدہ پڑھا جس کا ایک شعر یہ تھا۔

نوجوانو! یہ حریفوں کو دکھا دینا ہے + اپنی قوت کو کیا قوم نے یکجا لیا

اس شعر کو پڑھتے وقت حریفوں کے لفظ پر بے اختیار انگلی انگریزوں کی طرف اُٹھ گئی۔ جو جلسہ میں بیٹھے تھے۔ نیز ان کی سیاسی رائیں کئی دفعہ یونین کے جلسوں میں ظاہر ہو چکی تھیں۔ اسی اثنا میں کانگریس کا غلغلہ بلند ہوا تو وہ اس تحریک کے مداحوں میں نکلے۔ ۱۸۹۳ء میں ندوۃ العلماء کی آواز اُٹھی۔ مولانا اس صدا پر لبیک کہنے والوں میں بھی سب سے آگے تھے۔ اسباب اکٹھا ہوئے۔ اور یہی واقعات آگے چل کر مولانا کے کالج چھوڑنے کے چند اسباب بن گئے کالج کے ارکان نے لفٹننٹ گورنر سے شکوک دور کرنے چاہئے۔ مگر وہ بدستور قائم رہے۔ ۱۹۱۱ء میں شملہ میں چیف سکرٹری نے برملا یہ شکوک ظاہر کئے۔ اسی زمانہ میں مولانا کیساتھ خفیہ جاسوس بھی لگائے گئے۔ اور مولانا پر انگریزوں کی بدگمانی بڑھتی رہی۔

شبلی و سرسید میں اختلاف

بہرحال اب سید و شبلی میں وہ اگلا سا ارتباط نہیں رہا۔ سرسید میں ساری خوبیوں کے ساتھ ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنے ہمنشینوں کا اختلاف رائے برداشت نہیں کر سکتے تھے سرسید پر مولانا نے سب سے پہلی تنقید اپنی سب سے پہلی تصنیف "گذشتہ تعلیم" میں کی۔ دوسرا سبب مذہبی اختلاف تھا۔ سرسید کی تفسیری تاویلات کو انھوں نے پسند نہیں کیا۔ اسی طرح بعض فقہی مسائل پر سرسید سے انھیں اختلاف تھا۔ سرسید نے اپنی تفسیر کا عربی میں ترجمہ کرانا چاہا۔ مگر مولانا نے اپنی مصروفیتوں کا عذر کیا۔ پھر الفاروق کی تصنیف سے سرسید کا اختلاف بھی کچھ کم اہم نہ تھا۔ پھر انگریزی طور و طریق کے اختیار کرنے کے سلسلہ میں مولانا کا زاویہ نگاہ سرسید سے مختلف تھا۔ پھر خود سرسید کی سوانح عمری لکھنے کا مسئلہ بھی ایک اختلافی مسئلہ بن گیا۔ پھر عربی تعلیم کی ترقی و اصلاح کے مسئلہ میں دونوں کے جداگانہ نقطۂ نظر ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء کی صدا پر مولانا کا لبیک کہنا اچھی نظروں سے نہیں دیکھا گیا۔ اور پھر سیاسی اختلاف مذاق نے تو ایک دوسرے سے بالکل ہی الگ کر دیا۔ تاہم کالج سے ان کی وابستگی قائم رہی اور ادھر ندوۃ العلماء کی تحریک کو کامیاب بنایا۔ اور اس کے سالانہ اجلاسوں میں ولولہ انگیز تقریریں کیں۔ اور پُرجوش نظمیں پڑھیں۔ ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۶ء تک کا زمانہ انہی تحریکات میں بسر ہوا۔ اس اثنا میں کالج کے طرز سیاست سے دلبرداشتگی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ کالج سے ایک سال یعنی دسمبر ۱۸۹۶ء سے نومبر ۱۸۹۷ء تک کی رخصت لی اور اعظم گڑھ چلے آئے۔ پھر فروری مارچ ۱۸۹۸ء میں سرکار بھوپال کی دعوت پر وہاں گئے۔ اور عربی مدارس

کی تنظیم کی۔ مارچ ۱۸۹۸ء میں سرسید نے وفات پائی۔ اب کالج سراسر مسٹر بک پرنسپل اور سید محمود کے ہاتھوں میں آگیا۔ مولانا کے لئے یہاں کی فضا اب کسی طرح بھی سازگار نہ تھی۔ مئی ۱۸۹۸ء سے چھ مہینوں کی رخصت لی۔ پھر استعفا بھیج دیا۔ اس طرح سولہ برس کی ہنگامہ خیز زندگی کے بعد علی گڑھ کو خیرباد کہا۔

اس کے بعد جون ۱۸۹۸ء سے فروری ۱۹۰۱ء تک اُن کا مستقر اعظم گڑھ رہا۔ اس اثنا میں انھوں نے الفاروق مکمل کر کے ۱۸۹۹ء میں شائع کی نیشنل اسکول کی طرف ان دنوں خاص توجہ کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں اورنیٹل کانفرنس دہلی میں شرکت کا ارادہ کیا۔ حصول صحت کے لئے کشمیر گئے۔ واپسی کے بعد سفر ایران کا قصد کیا۔ پھر والد کی وفات کے بعد خانگی مصائب نے گھیر لیا۔ آخر گھبرا کر حیدرآباد کا رُخ کیا اور وہیں کچھ دنوں کے لئے مستقل قیام اختیار کر لیا۔

نظامت سررشتہ علوم فنون حیدرآباد

حیدرآباد میں اُن کے قیام بحیثیت ناظم سررشتہ علوم و فنون ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک رہا۔ یہاں سکون میسر ہوا تو کئی تصنیفات جن کے خاکے مدت سے اُن کے دماغ میں تھے۔ کاغذ پر اُن کو منتقل کیا۔ سررشتہ میں مولانا کی سب سے پہلی کتاب الغزالی تصنیف ہوئی۔ جو ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ لوگوں نے اُس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پھر علم کلام کی باری آئی اور علم الکلام والکلام ۱۹۰۳ء، ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئیں۔ یہیں سوانح مولانا روم لکھی گئی۔ یہ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ حیدرآباد کی صحبتوں سے طبیعت کی توجہ اُردو شاعری کی طرف مبذول ہوئی۔ اور موازنہ انیس و دبیر میں اُردو ادب کی تنقید کا نمونہ پیش کیا۔ سررشتہ کی طرف سے ان کی نگرانی میں چند اور کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ اس اثنا میں حیدرآباد میں سیاسی کشمکش شروع ہوئی۔ جس سے ان کی طبیعت مکدر ہوئی۔ اور مولانے حیدرآباد سے پر پرواز تولا۔ اِدھر ان کے ہاتھوں ایک دوسری مفید خدمت انجام پا رہی تھی۔ وہ اُردو کی بقا و ترقی کی کوششیں تھیں۔

نظامت انجمن ترقی اُردو

فورٹ ولیم میں ہندی کے نام سے جس نئی زبان کا قالب تیار کیا گیا تھا۔ اُس زمانہ میں اُس کو مختلف صوبوں میں رائج کرنے کی سرکاری کوششیں ہو رہی تھیں۔ سرسید نے اس کے مقابلہ میں اردو کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ پھر محسن الملک نے اس تحریک کو ہاتھ میں لیا۔ آخر جنوری ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اُردو کی بنیاد دہلی میں رکھی گئی۔ مولانا اس کے پہلے سکرٹری مقرر ہوئے۔ مولانا کی وجہ سے اس کا صدر دفتر حیدرآباد قرار پایا۔ اور مولانا نے اس تحریک کے لئے انتھک کوششیں کیں۔ انجمن کا پہلا سال بہت کامیاب رہا۔ اور مولانا کی ہدایت و نگرانی میں ۱۴ بلندپایہ کتابیں [illegible] ترجمہ یا تالیف ہوئیں۔ جدید اصطلاحات چھپوا کر مترجمین کو بھیجی گئیں۔ بعض وجوہ سے مولانا نے حیدرآباد کے ترک قیام کا فیصلہ کیا۔ سررشتہ علوم و فنون کی نظامت سے استعفا دیا۔ اور انجمن ترقی اُردو کو دوسروں کے حوالے کیا۔ اور خود ندوہ کے آستانے پر آ کر بیٹھ گئے۔ اور پھر عمر بھر کہیں اِدھر اُدھر نہ گئے۔

مولانا اور ندوۃ العلماء

[illegible] مولانا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تشریف لے آئے۔ ان کی ہمہ تن توجہ اور رہبری پروگرام کی بدولت ان کی صدائے بازگشت ہندوستان سے نکل کر مصر و شام پہنچی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شکل میں صحیح بنیادوں پر اسلام کی ایک معیاری [illegible] درسگاہ کا نمونہ بن گیا۔ [illegible] ندوہ نے ان کی نگرانی میں مفید اصلاحی خدمات

انجام دیں۔

ندوۃ العلماء کی درسگاہ کے قائم کرنے کا مقصد عربی طریقہ تعلیم کی اصلاح کرنا تھا۔ نیا نصاب تیار کیا۔ ندوۃ میں منظور کرانے کے بعد ملک کو عام مدارس میں اس کے جاری کرنے پر آمادہ کیا۔ ندوہ میں انگریزی تعلیم اتنی ملحق کی کہ علماء بقدر ضرورت انگریزی علوم کو براہ راست حاصل کر سکیں۔ پھر ندوہ میں ہندی و سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کیا۔ نئی عربی جو قدیم عربی سے بالکل الگ ہے ندوہ میں رائج کی عربی تحریر و تقریر کا ذوق پیدا کیا۔ گوشہ گوشہ سے لائق اساتذہ کو منتخب کر کے ندوہ میں بلایا۔ جدید علوم کی تعلیم کا انتظام کیا۔ نئے اسلوب پر قرآن پاک کا درس جاری کیا۔ اور ایک قیمتی کتب خانہ سمیٹ کر اکٹھا کیا۔ پھر الندوہ کے ذریعہ ملک میں اسلامی لٹریچر کی اشاعت کی مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا عبداللہ عمادی۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام اسی کے مضامین سے تحریر و انشاء کی دنیا میں روشناس ہوئے۔ جدید تعلیم و فنون کو اسلام کے مذہبی و علمی کارناموں سے آشنا کیا۔ علماء کو جدید مسائل سے روشناس کیا۔ اسلام اور تاریخ اسلام پر سے اعتراضوں کو دور کیا۔

اب ندوہ کی تحریک کو قبول عام کا شرف حاصل ہوا۔ والیہ بھوپال نے سرپرستی قبول کی۔ اسی سلسلے میں مولانا کو فارسی ادب کی تاریخ و تنقید کے لئے شعر العجم کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس کی داغ بیل ڈالی۔ پھر بمبئی میں کچھ دن قیام کیا۔ "دستہ گل" کی ابتدائی غزلیں اسی موسم بہار کے پھول ہیں۔

ع۔ نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نو را۔ اسی سفر میں بمبئی سے بیٹھ ندوہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر ریاست بڑودہ تشریف لے گئے۔ جس کی بڑی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اُن کے عزیز شاگرد مولانا محمد علی مرحوم نے انہیں دو قابلِ قدر کتابیں لکھنے پر آمادہ کیا۔ ایک عالمگیر پر الزامات کی تحقیق دوسرے پروفیسر مارگولیتھ کے جواب میں سیرۃ النبی کی تالیف، پھر ملک میں ندوہ کی خاطر دورہ کیا۔ اور ۱۹۰۸ء میں ایک تاریخی جلسہ ہوا جس میں اُن کے ہونے والے جانشین سید سلیمان ندوی نے امتیازی اعزاز پایا اور مولانا نے "اسلام اور بے تعصبی" پر تقریر کی۔

اس کے بعد مولانا نے شعر العجم کی تکمیل کے لئے سکون چاہا۔ یہ اعظم گڑھ میں انہیں میسر آسکتا تھا۔ یہاں شعر العجم کی تالیف میں مصروف تھے کہ ۱۰ مئی ۱۹۰۸ء کو پیر کی تکلیف کا افسوسناک حادثہ پیش آیا جس کی تلافی کسی طور نہ ہو سکی۔ ندوۃ العلماء کے متعلق سرکاری حلقوں کی بدگمانیاں دور ہوئیں۔ پانسو روپیہ ماہانہ کی سرکاری امداد غیر مشروط منظور ہوئی۔ ۳۲ بیگھہ آراضی ملی۔ اس کے بعد ہی والیان ریاست کی طرف سے ندوہ پر سیم و زر کی بارش شروع ہوئی۔ اور مولانا کو ندوہ کی شاندار عمارت کی تعمیر کا موقعہ ملا۔ مولانا نے ندوہ کے چند اہم جلسے بھی کئے جس میں دلی کے اجلاس ۱۹۱۰ء اور لکھنؤ کے اجلاس ۱۹۱۲ء نے ملک کی تمام توجہ کو ندوہ کی طرف مبذول کر دیا۔ اس آخری اجلاس کی صدارت کے لئے مولانا نے مصر کے نامور عالم علامہ سید رشید رضا کو بلایا۔ اور مولانا نے ندوہ کے ذریعہ اسلامی دنیا میں تعلقات مضبوط کئے۔ علامہ رشید رضا نے اسی نمونہ پر مصر میں ایک درسگاہ قائم کی اور عراق میں بھی اس کی صدائے بازگشت اٹھی۔

چند دیگر تعلیمی و قومی خدمات ۔ ندوہ سے متعلق ہوتے ہوئے بھی دوسری خدمات انجام دیتے رہے۔ حیدرآباد کی جامعہ عثمانیہ

کا خاکہ مولانا نے ۱۹۰۰ء میں کھینچا تھا اور انھیں کے انتخاب سے مولانا حمید الدین اس کے پہلے پرنسپل ہوئے۔ اسی طرح مشرقی آسام و بنگال میں ۱۹۰۹ء میں اصلاح مدارس کی تجویز تیار کی۔ ۱۹۱۰ء میں سرکاری مشرقی کمیٹی شملہ میں حصہ لیا۔ جس کے خاکے کے مطابق عالم و فاضل وغیرہ کے امتحانات جاری ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں سرکاری ڈھاکہ یونیورسٹی کی تاسیس میں عملی حصہ لیا۔ اسی سال اردو کو ناگری سے بچانے کے لئے سرکاری دربار اسکیم میں کامیاب قدم اٹھایا۔ شرکت کی پھر تاریخی غلطیوں کی اصلاح کا صیغہ قائم کیا۔ پھر ۱۹۱۲ء ہی میں عربی مدارس کی تنظیم کی تحریک اٹھائی۔ ۱۹۱۳ء میں مدینہ یونیورسٹی کی تحریک اٹھی نیز ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۲ء تک مسلم یونیورسٹی کی تخلیق وتاسیس میں گرم عملی حصہ لیا۔

مسئلہ وقف علی الاولاد کو مذہبی مسئلہ کی حیثیت سے اٹھایا، ملک کے سر برآوردہ لوگوں کو ہم نوا کیا، جسٹس امیر علی سر علی امام، مسٹر مظہر الحق، سر شفیع، نواب وقار الملک، سر تیج بہادر سپرو، سچدا نند سنہا اور مسٹر محمد علی جناح کی خدمات حاصل کیں اور بڑی جد و جہد سے اس کو قانون کی شکل میں منظور کرایا۔ اوقاف اسلامی کی تحریک بھی اپنی زندگی کے اخیر سال میں انھی نے اٹھائی، جو کسی نہ کسی شکل میں جاری رہ کر کچھ نہ کچھ اب کامیاب ہو چکی ہے۔ اس طرح ہندوستان میں صدر الصدوری کے منصب کو زندہ کرنے کی کوشش کی تھی، جس کو اب جمعیۃ علمائے ہند نے اپنے نظام عمل میں داخل کر لیا ہے، اسی طرح انھوں نے ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۳ء تک اشاعت اسلام کی تحریک کو عالمگیر پیمانہ پر اٹھایا تھا اور ملک کے چپہ چپہ میں اس کی کامیابی کے لئے سفرا بھیجے، نیز اسی زمانہ میں جو دوسرے مفید خدمات انجام پاسکے وہ جرجی زیدان کی تمدن اسلامی کا رد، قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ کی تحریک، علم کلام کی مجلس کی تجویز ہے، اب ملک میں مولانا کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جہاں جاتے، استقبال کے لئے اک اژدہام ہوتا، اور طلبہ ذوق و شوق کے عالم میں گاڑی کے گھوڑے الگ کرکے اپنے ہاتھوں سے گاڑی کھینچ کر سجاتے، اور جلوس کی شکل میں فرودگاہ تک پہنچاتے،

مولانا اور سیاسیات

انھیں ترکوں سے عشق تھا اور اسی راہ سے سیاست کے میدان میں آئے، طرابلس و بلقان کی جنگوں کے زمانہ میں مسلمانوں کی سیاسی تحریک کی آزادانہ رہنمائی جن لوگوں نے کی، اُن میں مولانا بھی تھے، پھر ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کے ہنگامہ میں ان کی نظموں نے اسلامی جوش و خروش کے رجز کا کام کیا، ہندوستان کی سیاسیات میں وہ ہمیشہ آزاد تھے اور آزاد رہے، سرسید سے ان کا سیاسی اختلاف اسی مسئلہ میں ہوا، پہلا آزاد مسلم اخبار "مسلم گزٹ" ۱۹۱۲ء میں مولانا ہی کی تحریک سے جاری ہوا، مولانا کا مشہور سیاسی مضمون "مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ" اس میں شائع ہوا جس نے مسلمانوں کی سیاسیات کا رُخ ایک سمت سے دوسری سمت میں پھیر دیا، قدیم مسلم لیگ کی اصلاح و ترقی کے لئے انھوں نے مسلم لیگی عناصر کی آنکھیں کھول دیں، چنانچہ ۱۹۱۲ء کے لیگ کے اجلاس میں کچھ نظام بدلا، اور نصب العین کچھ اونچا کیا گیا، لیکن مولانا لیگ کی اس روش سے مطمئن نہ ہو سکے، پھر لیگ و کانگرس کے اتحاد کی کوششیں ہوئیں اور احرار کی تعداد بڑھنے لگی، ابوالکلام محمد علی شوکت علی، ظفر علی، حسرت موہانی، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر محمود۔ اسی دور میں آگے بڑھے، نیز اپنے ساتھ بوڑھوں حکیم اجمل خاں، نواب حسن سید حسن، راجہ محمود آباد کو اپنے ساتھ لائے۔ مسٹر مظہر الحق اور مسٹر محمد علی جناح نے احرار لیگ کے اس مشترکہ اقدام کی رہبری کی لیگ اور کانگرس کے اتحاد کی جو تحریک اس زمانہ میں اٹھی، وہ مولانا کی وفات کے بعد

۱۹۱۶ء میں لکھنؤ پیکٹ"کی شکل میں وقتی طور پر کامیاب ہوئی۔

ندوہ کی خدمات سے سبکدوشی

ندوہ پر مولانا کے اقتدار نے ان کے بعض حریفوں میں رشک و حسد کے جراثیم پیدا کر دیئے اور وہ ان ہنگامہ آرائیوں سے ایسے بددل ہوئے کہ دارالعلوم کی معتمدی سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کیا، اور جولائی ۱۹۱۳ء میں بمبئی سے اپنا استعفا بھیج دیا، اور باوجود تمام ملک کے اصرار کے انھوں نے استعفا واپس نہیں لیا۔ طلبا میں بائیکاٹ کی تحریک پھیلی اصلاح ندوہ کی کوششیں شروع ہوئیں، دلّی کے اجلاس میں مولانا نے عملی حصہ لیا، لوگوں نے مولانا کی تکفیر کا ہتھیار اُٹھایا، ابھی یہ ہماہمی جاری تھی کہ حادثۂ وفات پیش آیا۔

وطن میں قیام اور زندگی کے چند سفری کام

دارالمصنفین کی تجویز مولانا کے ذہن میں پہلی مرتبہ ۱۹۱۰ء میں آئی (اور عجب کیا کہ ندوہ میں اگر اختلافات پیش نہ آتے تو آج دارالمصنفین اعظم گڑھ کے بجائے ندوہ کے احاطہ میں لکھنؤ میں نظر آتا) ۱۹۱۴ء میں الہلال کلکتہ کے ذریعہ سے اس تجویز کو عام طور پر ملک کے سامنے پیش کیا، اس کے مرکز کے انتخاب کا سوال سامنے آیا لیکن جب بھائی کی وفات کے بعد مولانا اعظم گڑھ آ گئے، تو اس شہر کو اپنے مقاصد کا مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا، اور یہاں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالنی چاہی، اور اپنا ذاتی باغ اور بنگلہ وقف کرنا چاہا، رفقاء کے وظائف کا انتظام کرنا چاہا، دارالمصنفین کے لئے تعلیمی خاکہ تیار کیا، لیکن ابھی یہی منزل تھی، کہ مولانا نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور ان کی پیش گوئی پوری ہوئی کہ "شاید یہی میرا مدفن بھی ہو" دارالمصنفین ان کے لائق شاگردوں مولانا حمیدالدین، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کے ہاتھوں قائم ہوا۔ جس کے ذریعہ سے مولانا کی زندگی کا سب سے اہم مقصد سیرۃ النبی کی تالیف کا کام انجام دیا، ۱۹۱۲ء میں بمبئی میں بیٹھ کر مولانا کے قلم نے سیرۃ النبی کی پہلی سطریں لکھیں، اس کے خلاف بھی فتنہ اُٹھا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ سیرت کے ناتمام رہنے کا انھیں سخت افسوس رہا لیکن اس کی تکمیل قدرت نے سید سلیمان ندوی کے ہاتھوں کے مقرر کی۔ جب انھیں اپنی صحت سے مایوسی ہوئی تو تیمارداروں کو وصیت کی کہ یہ مسودے حمیدالدین اور سید سلیمان کے سپرد کئے جائیں، وفات سے دو تین دن پہلے مولانا حمیدالدین، سید سلیمان ندوی، ابو الکلام آزاد کو بلوایا اور ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۸ر ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو داغ مفارقت دے گئے، عصر کے وقت لاش شبلی منزل کے ایک گوشہ میں جہاں آٹھ برس پہلے شکستہ پاؤں کے ریزے دفن کیے گئے تھے، سپرد خاک کی گئی، ملک کے گوشے گوشے میں اس یگانۂ عصر ادیب و محقق کا ماتم منایا گیا۔

یادگاریں

خدا کرے کہ مولانا مرحوم کی زندہ یادگاریں تصنیفات شبلی، دارالمصنفین، دارالعلوم ندوۃ العلماء، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اور شبلی انٹر کالج اعظم گڑھ رہتی دنیا تک قائم رہیں، اور ان سے ملت کی بے شمار خدمات انجام پاتی رہیں۔

یونان میں آزادی کا جنم

از :—— ڈاکٹر تاراچند

یورپ کے جنوب مشرقی کونے میں بلقان کا علاقہ ہے۔ جسے قدرت نے عجیب ڈھنگ پر گھڑا ہے۔ اس کے تین طرف پانی ہے اور بیچ میں پہاڑ کی پسلیاں اُبھری ہوئی ہیں۔ سمندر کی لمبی لمبی باہوں نے اسے گھیر رکھا ہے۔ پہاڑیوں کے بیچ میں تنگ وادیاں ہیں۔ جن کی چوڑائی کہیں بھی چالیس میل سے زیادہ نہیں۔ اور سمندر اس علاقے میں اندر گھسا ہوا ہے کہ کوئی جگہ اس سے پچاس میل سے زیادہ پرے نہیں۔ پہاڑ سمندر میں انوکھے طرز سے ہوتے ہوئے ہیں۔ ان کے سلسلے سمندر کے کنارے تک پہنچے ہیں۔ اور جہاں کنارہ سمندر میں ڈوب گیا ہے۔ کنارے کنارے سے تھوڑی تھوڑی دوری پر پہاڑی سلسلوں نے اپنی چوٹیاں پانی سے اوپر نکال دی ہیں۔ اور بلقان اور ایشیا کے بیچ میں جزیروں کی لڑیاں پرو دی ہیں۔ کھاری سمندر کی لہروں اور پتھریلے میدانوں کی ہمواری پر اس کے جینے کا سہارا ہے۔ اس کی کڑی زمین اس کے باشندوں سے سخت محنت چاہتی ہے۔ اور پیداوار کی کمی انہیں سمندروں کی آندھیوں اور طوفان کے مقابلہ کے لئے للکارتی ہے۔ پہاڑی وادیوں میں کھیتی ہوتی ہے اور میدانوں اور ڈھالوں پر پھلوں کے باغ ہیں۔ جن میں انگور۔ انجیر۔ شہتوت اور زیتون کثرت سے لگتے ہیں۔ اس دیس کا موسم نہ بہت گرم ہے نہ بہت ٹھنڈا۔ گرمیوں میں اُتر سے ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ اور گرمیوں کے ہونے پر دکھن سے گرم ہوا آتی ہے۔ یہاں آسمان کھلا اور صاف رہتا ہے۔ سورج اور رات کو تارے بڑی آب و تاب سے چمکتے ہیں۔

معلوم نہیں پرانے زمانے سے اس علاقہ میں آدمیوں کی بستیاں بستی چلی گئیں یہ کہنا مشکل ہے کہ یہاں

[illegible] آزادی [illegible] متعلق کوئی تحریر ہندوستان میں ہوسکے تھے [illegible] یونان کی آزادی پر ڈاکٹر صاحب موصوف نے لکھا ہے۔

ڈھانچہ تیار ہوا۔ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کم ملتی ہے۔ راج اور رعیت کا جیسا گھنا اور گہرا ساتھ یہاں دکھائی دیتا ہے۔ ویسا کہیں نظر نہیں آتا۔ پرجا کی جتنی ضرورتیں ہوسکتی ہیں۔ راج ان سب کا نباہ کرتا تھا گھربار۔ ہاٹ بازار میلہ ٹھیلہ کھیل کود۔ پڑھنا لکھنا اور پوجا پاٹ سب ہی کا آسرا راج پر تھا۔

ان سماجوں کے سامنے دو سوال تھے۔ یا یوں کہئے کہ ایک سوال تھا جس کے دو پہلو تھے۔ سوال تھا۔ سماج کے جینے اور زندہ رہنے کا۔ جینا بھی ایسا نہیں کہ جس کا مقصد صرف پیٹ پالنا۔ بچوں کا رکھنا۔ باہری اور بھیتری خطروں سے بچاؤ کرنا ہو۔ بلکہ ایسا جینا جو آدمی کی آدمیت کے لائق ہو۔ ایسا چلن جس سے آدمی سچا اطمینان حاصل کرسکے۔ یہ بڑا اونچا خیال تھا۔ بڑا پاک منصوبہ تھا۔

اس خیال کا یہ مطلب تھا۔ کہ ایک طرف تو آدمی قدرت کی ان طاقتوں پر قابو حاصل کرے۔ جن سے وہ پھل پیدا ہوتے ہیں۔ جن پر ہمارے بدن کے دکھ سکھ کا آسرا ہے۔ اور دوسری طرف اپنے نفس یا آتما کو عقل کے ذریعہ ایسا سیدھا کرے۔ کہ جس سے اپنا اور سماج کا کلیان ہو۔ اس منصوبے میں کامیاب ہونے اور اس دیہرے سوال کے حل کرنے کے ایک ہی معنے تھے۔ یعنی قدرت اور خودی کے جنگل سے چھٹکارا پانا۔ آزاد ہو جانا۔

اچھے اور آزاد جینے کا مسئلہ آزادی کے ساتھ حل نہ ہوسکتا تھا۔ یونانیوں کا دیس ان لوگوں کے لئے نہ تھا۔ جنھیں آرام کی عادت ہے۔ کاہلی پسند ہیں۔ یہاں کی زمین پانی اور ہوا۔ محنت اور پھرتی چاہتے ہیں۔ قدرت نے یہاں کسی چیز کی افراط نہیں دی۔ سب چیزوں کو حدوں میں جکڑ دیا ہے۔ جب تک آدمی اپنے بل کو نہ جانے اپنے آپ کو نہ پہچانے۔ قدرت نے جو سامان دیا ہے۔ اس کی پوری پوری قدر نہ کرے۔ تب تک وہ اس کے لئے اپنے منصوبے تک پہنچنا کٹھن ہی نہیں ناممکن سا ہے۔ یہی نہیں۔ ہیلن کی اولاد کے سامنے ایک اور کٹھنائی تھی۔ ان کی سماجیں بڑی ملی جلی تھیں۔ ان میں کئی نسلوں کا پٹ تھا۔ جب یہ سماجیں اپنی اپنی نگروں میں راج جما رہی تھیں۔ انھیں پرانی سماجیوں سے کڑی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ ان لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ پرانی تہذیبیں مٹ گئیں۔ مدتوں کے بنے ہوئے انتظام بگڑ گئے۔ اور نئی سماجوں کو پھر نئے سرے سے تہذیب اور انتظام کی داغ بیل ڈالنی پڑی۔ اس بگاڑ اور سنوار کا حال تاریخ کے دھندلکے میں چھپا ہے۔

لیکن کئی صدیوں کے بعد زمانہ آتا ہے۔ اس پر یونانی تاریخ لکھنے والے روشنی ڈالتے ہیں۔ علم کی پو پھٹتی ہے۔ اور دنیا اچرج کے ساتھ آزادی کے تڑکے کا نظارہ کرتی ہے۔ پہلا منظر جو ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس وقت کا ہے۔ جب یونانی سماجوں میں انتظام کی باگ راجاؤں کے ہاتھ میں تھی۔ راجہ فوج کے سپہ سالار۔ عدالت کے حاکم۔ اور پردیسیوں کے چودھری ہوتے تھے۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ کہ ان کا اختیار بے روک ٹوک تھا۔ امیر گھرانوں کے بڑے بوڑھوں کی مجلس ہوتی تھی۔ جس کی صلاح اور مشورے کے بغیر

کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ رعایا بھی راج میں حصہ لیتی تھی۔ سماج کے ممبر۔ راجہ کے فیصلوں اور مجلس کے مسودوں پر رائے ظاہر کرنے کے لئے سبھا کرتے تھے۔ اور ہاں یا نہیں کے بنا کوئی ضروری کام یا قانون طے نہیں ہو پاتا تھا۔ یہ آزاد مرد شہر کے میدان میں اکٹھا ہوتے تھے۔ کان سے اونچے نیزے ہاتھوں میں لئے رہتے تھے۔ انھیں سر سے اونچا اٹھا کر۔ یا زمین پر گرا کر یا نعرے لگا کر اپنا مت بناتے تھے۔ یہی پرجا سبھا وہ سوتا ہے۔ جس سے یونان کی آزادی کا دریا بہہ نکلتا ہے۔

زمانہ بدلا۔ راجاؤں کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ امیروں کی مجلسوں نے راج کاج سنبھالا۔ لیکن ان سے انتظام بہت دن نہ چلا۔ امیروں کے بنائے ہوئے۔ قانون اپنے لئے اچھے ہوں۔ پھر نہ رعایا کو ان کی خبر ہوتی تھی۔ نہ رعایا ان پر عمل کرنے سے خوش تھی۔ رعایا میں ہل چل مچی۔ یہ مانگ اٹھی کہ قانون سماج کو معلوم ہونے چاہئیں۔ قانونوں کو لکھنے اور سب کو بتانے کے لئے قانون بنانے والے مقرر ہوئے۔ اب قانون سامنے آئے۔ تو ان کی سختی سب پر ظاہر ہو گئی۔ ناراضگی بڑھی۔ امیری راج کے امیروں میں ہی دشمن نکل آئے۔ امیر راجوں کو ٹھکانے لگا۔ ان سرداروں نے خود سری حکومتیں قائم کر دیں۔ لیکن سرداروں نے یہ ضرور کیا کہ رعایا کی بھلائی کی طرح طرح سے کوشش کی۔ بیوپار اور دھندے بڑھائے۔ کاریگری کو ترقی دی۔ محل اور مندر تعمیر کرائے۔ تعلیم کا انتظام کیا۔ لیکن جب اختیار ہاتھ میں آتا ہے۔ تو گھمنڈ سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ سماج نے سرداروں کا ساتھ اس لئے دیا تھا۔ کہ امیر حکومت سے چھٹکارا ملے۔ لیکن وہی سردار جنھیں اپنا سمجھا تھا۔ پرانے بن گئے۔ اس سے بڑھ کر کیا بیوفائی ہو سکتی تھی۔ اور رعیت اسے کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ سرداروں کے خلاف چاروں طرف شور اٹھا۔ ایتھنز میں دو جوانوں نے جو ایک دوسرے کے متوالے اور آزادی پر جان دینے والے تھے۔ اپنے جابر سرداروں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ اور خود بھی شہید ہو گئے۔ سرداری راج کی منزل پوری ہو چکی تھی۔ زمانہ آزادی کے راستہ پر بڑھنے کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔

سولن سری کے قانون بنانے والوں نے پرانے سماجی ڈھانچوں کو بدلنے اور نئے پرجا راج قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جب تک سرداری حکومت ختم نہ ہوئی۔ سماج کے سدھار کا کام پوری طور پر شروع نہ ہوا۔ ایتھنز اور دوسرے نگروں میں نئے دستور جاری ہوئے۔ نئے ڈھنگ سے راج بنے۔ کلایس تھینیز نے ایتھنز کی سماج کو نئے سانچے میں ڈھالا۔ پرانی سماج کی نیو رشتے ناتے پر پڑی تھی۔ یہ فرقہ بندی کے جال میں پھنسی تھی۔ کلایس تھینیز نے برادریوں اور قبیلوں کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ ایتھنز کی عملداری کو تین علاقوں میں بانٹا۔ اور کل آبادی کے دس جرگے بنا دیئے۔ ہر جرگے میں تینوں علاقوں کا ایک ایک گروہ شامل کیا۔ ان جرگوں کی ایک مجلس بنائی۔ جس کے پانچ سو ممبر تھے۔ اس میں ہر جرگہ پچاس نمائندے بھیجتا تھا۔ اس مجلس کے سپرد سارا انتظام تھا۔ اس لئے ساری پرجا انتظام کی ذمہ دار تھی۔ ہر قانون بنانے کا

اختیار پرجا کی سبھا کے ہاتھوں میں تھا۔ جس میں ایتھنز کا ہر باشندہ حصّہ لے سکتا تھا۔ کلائس تھینز نے فوج کا نظام بھی بدلا ہر جرگے کا یہ فرض ہوا کہ پیادوں کی رجمنٹیں اور سواروں کے دستے بھرتی کرے۔ اور ان کے کمانداروں کو جرگے کی ووٹ سے چنے۔ . . . . . جرگے کی ووٹ سے چنے۔ یہی دس کمانداروں کی کمیٹی قومی معاملوں میں سیاہ سفید کی مالک ہوئی۔ ان سدھاروں سے ازادی کا چشمہ چل نکلا۔

مشت ایزد ہوا تھی۔ کہ آزادی کی جانچ کا وقت آن پہنچا۔ ایشیا میں ایران کی طاقت دن دونی رات چوگنی بڑھ رہی تھی۔ ایرانیوں نے سندھ سے میڈیٹرینین تک سارے علاقے کو روند ڈالا تھا۔ دارا نے درّہ دانیال کو پار کر یورپ پر حملہ کر دیا۔ اس کے سپہ سالاروں نے اتری بلقان میں تھریس پر اور مقدونیہ پر قبضہ کر لیا۔ اب کیا تھا۔ یونانی آزادی اور ایرانی شہنشاہیت کا آمنا سامنا ہوا۔ ان ہاتھوں کے میدان میں سمندر کے کنارے پہلی مٹھ بھیڑ ہوئی۔ آزادی نے شہنشاہیت کو نیچا دکھایا۔ دارا اپنا سا منہ لے کر واپس گیا۔ پر اس کے جانشین کے خسرو نے بدلہ لینے کی ٹھانی۔

ایرانیوں کے دل بادل امنڈ امنڈ کر یونان پر آ گرجے۔ یونانیوں نے اپنی آزادی کو بچانے کے لئے جان پر کھیل جانا اچھا سمجھا۔ انھوں نے اپنی فوج کی کمان سپارٹا کے جنرل لیونی داس کے ہاتھ میں سونپی۔ اس نے تین سو سورماؤں کے ساتھ تھرما پلی کی گھاٹی میں پڑاؤ جمایا۔ کیخسرو کے لشکر نے ان پر حملہ کیا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ لیونی داس تو پہلے ہی کام آیا۔ پر اس کے سپاہی سارا دن اس کی لاش کے گرد بہادری کے جوہر دکھاتے رہے۔ آخر میدان ایرانیوں کے ہاتھ رہا۔ لیکن تھرما پلی کی ہار جیت سے بڑھ کر ثابت ہوئی۔ اس نے یونانیوں کے جوش کو ابھارا۔ ایتھنز والوں نے شہر خالی کر دیا۔ اور سمندر کا آسرا لیا۔ سمندر کی گود میں تو یہ پلے ہی تھے۔ سمندری لڑائی میں کون ان سے پار پا سکتا تھا۔ سلامس کا جزیرہ ایتھنز کی بندرگاہ کی دربانی کرتا ہے۔ وہیں انھوں نے ایرانی بیڑے کو للکارا۔ ایرانی بھی اپنے شہنشاہ کے لئے جان توڑ کر لڑے۔ پر ان کے کچھ جہاز تو سمندر میں ڈوب گئے اور کچھ تتر بتر ہو گئے۔ بیڑے کی ہار نے فوجوں کا دل توڑ دیا۔ اب جو مقابلہ ہوا۔ تو پلیٹیا کے میدان میں آزادی کی قسمت کا فیصلہ ہوا۔ ایرانی سپاہ ہار کر بھاگی۔ اور ایرانی سپہ سالار مارا گیا۔ ایرانی شہنشاہیت کے یونانی ازادی کو کچل کر دنیا پر قبضہ جمانے کے سنہرے خواب جھوٹے ہوئے۔ یونانیوں نے "آزادی کا تہوار" (ایلو تھیریا) قائم کیا۔ جو ہر چوتھے برس منایا جاتا تھا۔

ایرانی روک کا ہٹنا تھا۔ کہ آزادی میں باڑھ آئی امیری حکومت کے بچے کھچے کھنڈر صاف ہو گئے۔ پرجا راج کی عمارت شاندار برجیوں اور آسمان سے باتیں کرنے والے گنبدوں سے سجائی گئی۔ کل اونچے عہدے غریب اور امیر ہر ایک کے لئے کھول دئے گئے۔ پرجا سبھا ہر کام کا فیصلہ کرنے۔ ہر قانون کے

چلانے میں مختار ہوگئی۔ عدالتی کارروائیوں میں پرجا ہی کا حکم سب سے اوپر ماناگیا۔ افسروں کے مقرر کرنے کیلیئے چناؤ کا طریقہ جاری ہوا۔ اور سبھا اور عدالت کے کام کرنے کے لئے تنخواہ دی جانے لگی۔ ایتھنز کا ہرنواسی .. .. ہر عہدے پر پہنچ سکتا تھا۔ جو آج مونجھ کی رسّی بٹنے والا تھا۔ وہ کل فوج کا کمانڈر ہوسکتا تھا۔ جو کل تک سڑکوں پر لیمپ جلاتا پھرتا تھا۔ وہی دوسرے دن شہر کا مجسٹریٹ بن سکتا تھا۔ آخر وہ دن آپہنچا۔ جب ہر آدمی اطمینان کے ساتھ ہر اس اچھے سے اچھے اور اونچے کام کو پورا کرنے کے لائق سمجھا جانے۔ جو آدمیت کے لئے زیبا ہو۔ آدمی نیک چلن اور عقل کے لئے مناسب ہو۔ آخر یونان نے اس آزادی کو پالیا۔ جس کے آگے کوئی سماج آج تک نہیں جاسکی۔

آئیے آزادی کی بنیادوں کی جانچ کریں۔ دیکھیں وہ کتنی گہری کتنی مضبوط ہیں۔ جن کے سہارے آزادی کا انوکھا محل کھڑا ہوا۔ یونانی سبھاؤں یونانی چلن یونانی ذہن تھا لیکن۔ اور اس آزادی کی بھید کی تہ تک پہنچیں۔ پہلی بات جو ان کے ذہن میں خاص طور پر دکھائی دیتی ہے۔ وہ ان کی سادگی ہے۔ ان کے ہاں نہ بناوٹ ہے نہ اُتار چڑھاؤ۔ جو چیز جیسی ہے۔ اُن کا ذہن ان کا ویسا ہی عکس اُتارتا ہے۔ وہ قدرت کے نظاروں کو دیکھتے ہیں۔ مگر آنکھوں پر رنگین عینکیں چڑھا کر نہیں۔ وہ پریم کے بھاؤوں میں مست ہوتے ہیں لیکن نہ تو ان کے پیچھے جانوروں کی طرح کیچڑ میں لوٹتے ہیں۔ نہ دیوتاؤں کی طرح آسمان میں اُڑتے ہیں۔ وہ موت سے آنکھ ملاتے ہیں۔ ان کے ظلموں کو سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے طمانچوں سے منہ نہیں موڑتے۔ وہ تے دھو نے میں بے فائدہ وقت نہیں کھوتے۔ ان کے سبھاؤ کی سادگی انھیں سچائی کی پاٹھ پڑھاتی ہے۔ ان کے ذہن کی دوسری خاصیت بھی بڑی انوکھی ہے۔ اُن کی ہر بات نپی تلی ہوتی ہے۔ ان کے سوچ بچار میں چلن میں حد کا اندازہ ہے۔ موزونیت کا خیال ہے۔ اس لئے وہ آدمی بدن میں سڈول پن چاہتے ہیں۔ رہنے کے مکانوں میں۔ کام میں لانے کے سامانوں میں۔ برتن بھانڈوں میں۔ پہننے کے کپڑوں میں سلیقہ برتتے ہیں۔ اُن کے نزدیک دولت اِس حد تک ٹھیک ہے کہ آدمی نہ ہو تو تنگ حال رہے۔ نہ عیش میں ڈوبا رہے۔ کیونکہ حدوں سے گھٹ بڑھ جانے سے آدمی نیک چلن نہیں رہ سکتا۔ وہ نیکیوں میں سب سے اونچی جگہ انصاف کو دیتے ہیں۔ آتما کی ترازو کے پلڑے برابر اور اُس کی ڈنڈی سیدھی رہنی چاہیئے۔ جہاں ڈنڈی ٹیڑھی ہوئی۔ اور آدمی کا دل بگڑا۔ اور بدچلنی کی شروعات ہوئی۔ اسی لئے سب سے بڑا عیب افراتفری ہے۔ آدمی کی ضرورتیں کئی طرح کی ہیں۔ ایک جن کا تعلق اس کے بدن سے ہے۔ اور دوسری جن کا تعلق روح یا آتما سے ہے۔ دونوں ہی کو پورا کرنا چاہیئے۔ لیکن اس طرح کہ درجے کا خیال رہے۔ مرتبے کا پاس رہے۔ یہ خاصیت یونانیوں کی گھٹی میں پڑی تھی۔ خوبصورتی کا بھاؤ اُن کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ اس سے تصویریں بنانے۔ مورتیں گھڑنے۔ مکان تعمیر کرنے میں اُنھوں نے جو کمال حاصل کیا۔ وہ شاید ہی کسی اور قوم کو نصیب ہوا۔ یونانیوں

نے سائنس اور فلسفہ علم اور ادب میں ایسی ترقی کی۔ کہ آج تک دُنیا حیرت میں ہے۔ یونان یورپ کی تہذیب کا گہوارہ ہے۔ اس کے فلاسفر۔ شاعر۔ ناٹک لکھنے والے۔ تاریخ جاننے والے آج بھی یونان کا احسان مانتے ہیں۔

ایک آخری بات جو غور کرنے کے قابل ہے وہ یونانیوں کا آدمی اور خدا کا رشتہ ہے۔ آدمی کی ان کے ہاں بڑی قدر اور قیمت تھی۔ کم سے کم یونانی نسل کے آدمی کو وہ ہیچ اور بیچارہ ماننے کو تیار نہیں تھے۔ یہی نہیں۔ وہ ہر یونانی کو حقیقت میں ایک دوسرے کے برابر سمجھتے تھے۔ اسی لئے ہر ایک کو اس کا موقع دیتے تھے کہ وہ اپنی لیاقت کے مطابق اپنی سمجھ سے جیسا پیشہ جیسی زندگی چاہے اختیار کرے۔ ہر ایک کو اپنی رائے ظاہر کرنے کی آزادی تھی۔ ہر ایک کے ساتھ برابر کا برتاؤ تھا۔ ہر ایک کے لئے ایک سے قانون تھے۔ یہ ایسا پکا اور گہرا بچار تھا۔ کہ وہ دیوی دیوتاؤں کو بھی آدمی سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں کوئی خاص پاک کتاب نہیں تھی۔ جسے وہ دیوتاؤں کی طرف سے بھیجی ہوئی مانتے ہوں۔ دیوتاؤں کی کتھائیں نظموں میں بندھی ہوئی تھیں۔ اور ان میں دیوتاؤں کی ایسی ہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ جیسی معمولی آدمیوں کی۔ اسی لئے ان کا مذہب ان کی عقل کو ایمان کی زنجیروں میں قید نہیں رکھتا تھا۔ وہ دیوتاؤں کو بھی اسی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ جس پر دُنیا کی اور سب چیزوں کو ان کی تاریخ میں بہت کم مثالیں ملیں گی۔ کہ جب دھرم کے لئے اُنھوں نے کسی کو ستایا ہو۔ اُن کا دھرم اُنھیں یہ نہیں سکھاتا تھا۔ کہ دنیا کو دھوکا سمجھو۔ پرلوک کو جسے نہ دیکھا ہے نہ سُنا۔ جہاں تک پہنچنے میں عقل کے پَر جلتے ہیں۔ سچّا سمجھو۔ وہ تو اسی لوک کو آدمی کی روحانی اور جسمانی کھینچ تان کے کام میں ہار جیت کا میدان سمجھتے تھے۔ آدمی کو آدمی کی مدد سے ایسا بنانا چاہتے تھے۔ کہ اس کی آتما کی دبی ہوئی طاقتیں پوری طرح سے اُبھر آئیں۔ چھپی ہوئی جوتی سورج کی طرح جگمگا اُٹھے۔ آدمی اور سماج میں ایسا میل ہو کہ بَیر اور پھوٹ کا کھٹکا بند ہو جائے۔ آدمیت کی بانسری سے من موہنے والا سُر نکلے۔ دنیا بہشت کا نمونہ بن جائے۔ یہی اُن کی آزادی کا سچّا سپنا تھا۔

حالی کی غزل گوئی

از: رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

یہ مضمون جناب فراق گورکھپوری کی تازہ تصنیف "انداز ے" کا آخری باب ہے۔ پوری کتاب کی اہمیت کا اندازہ اِس مضمون سے ہو جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کتاب اُردو کے تنقید میں ایک ایسا اضافہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اِس کتاب کا ہر بیان پڑھنے والے کو اپنے ادبی احساسات کا جائزہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔

(ایڈیٹر)

حالی کی غزل گوئی پر مجموعی حیثیت سے ہم کیا رائے قائم کریں؟ جب ۵۷ء میں غدر ہوا اُس وقت حالی کی عمر اٹھارہ برس کی تھی ایک انحطاط پذیر اور تیزی سے بربادیوں کی آندھی میں اُکھڑ جانے والی اور اُڑ جانے والی مُغل سلطنت اور جاگیردارانہ نظام کی فضا میں حالی نے آنکھیں کھولی تھیں۔ نوجوانی کے حساس زمانے میں حالی نے یہ کایا پلٹ دیکھی تھی اور ان کے پیر ملت سر سیّد نے بھی۔ جب ہندوستان نے ذرا سنبھالا لیا تو سر سیّد و حالی اور اس گروپ کے دیگر افراد کو از سر نو قوم کی فکر ہوئی۔ اُجڑی ہوئی دُنیا پھر سے بسانے کی تمنا ہوئی۔ یہ لوگ چاہتے کیا تھے۔ جیسے یہ لوگ بخیال خود اسلامی حکومت سمجھ بیٹھے تھے وہ تو اب واپس آنے والی چیز نہ تھی۔ شاہی خاندان تو قتل و برباد ہو چکا تھا۔ پھر یہ لوگ کہاں پناہ لیں؟ انگریزی حکومت کی نئی دنیا میں پُرانی دنیا کے یہ ماتم دار کیا کریں۔ جاگیر دارانہ نظام کے بچے کھچے آثار ابھی باقی تھے لیکن متوسط طبقے کے لاکھوں مسلمان خاندانوں کا گذارہ اب جاگیروں سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اب کیا کرو؟ یہ کرو کہ انگریزی پڑھو اور ملازمت کرو۔ کم انگریزی پڑھو، زیادہ انگریزی پڑھو، چھوٹی ملازمت کرو، بڑی ملازمت کرو۔ اس کے علاوہ عقائد و رسوم

ہیں کچھ اصلاحیں جو اب بالکل سطحی چیزیں معلوم ہوتی ہیں لیکن جو اس وقت بہت اہم معلوم ہوتی تھیں اور یاد ماضی کا سہارا لے کر اپنا مستقبل بنانا یہی لے دے کے نئی تحریک کا کل سرمایہ تھا۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ کون جانے دیکھا جائے گا۔ کم سے کم نئی دنیا میں ہمیں جگہ تو مل جائے گی۔ اسی جذبے کو لے کر سرسید اور ان کے نقیب حالی آگے بڑھے یہی جذبہ ان کی تحریک اصلاح کی روح رواں تھا۔ اس وقت اگر اُن سے کوئی کہتا کہ سو فی صدی مسلمانوں کا تعلیم یافتہ ہونا، خوشحال ہونا، دولت و ثروت میں برابر ہونا، مشقت پیشوں کے نمایندوں کی حکومت ہونا قومی تحریک کا مقصد ہونا چاہئے تو اُن کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی۔ ان کی قومی تحریک کا مقصد تو پانچ سات فی صدی مسلمانوں کی حالت سدھارنا تھا۔ غدر کے بعد میں یہ ہندوستان کیا دنیا کے کسی حصے میں اشتراکی تہذیب کا تصور ذرا قبل از وقت تھا۔ متوسط طبقے سے آگے اس وقت بلکہ نصف لیصدی بعد تک بیدار مغزوں کے بھی خیالات نہیں جا سکتے تھے۔ اقبال تک کے لئے جب یہ تصور غیر مانوس تھا تو ہم حالی کو اس غفلت یا کمی کے لئے کیسے الزام دے سکتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کیا ۱۹۱۷ء کی دنیا بھی ۱۹۴۲ء کی دنیا نہیں تھی۔ اس لئے حالی کے ترقی پسند ادیب ہونے سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ مگر اتنا ہوا کہ اجتماعی زندگی کا تصور خواہ وہ اجتماعی زندگی متوسط طبقے کی ہی زندگی ہو شعوری کار فرما ہونے لگا۔ غالب، ذوق، مومن، شیفتہ، داغ، امیر، آسی غازیپوری، شاد عظیم آبادی یا اس زمانہ کے کسی اور غزل گو کی غزلوں میں اجتماعی زندگی کا یہ محدود تصور بھی نہیں ہے۔ اُردو ادب کی تاریخ میں حالی پہلا شخص ہے جس نے غزل کو سماجی اور اجتماعی زندگی سے متعلق مسائل و خیالات کے اظہار کا آلہ بنایا۔ دربار اور درباری ماحول، محض انفرادی زندگی و جذبات، جاگیردارانہ نظام کی فضا و نفسیات کو حالی کی غزل خیرباد کہہ رہی ہے۔ نیا جگ آئے یا نہ آئے پرانا جگ بیت چکا تب حالی نے غزل گوئی شروع کی:-

حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزم شعر میں   باری جب ان کی آئی تو گل ہو گئے چراغ

مگر کوئی سورج نہیں چراغ گل ہو گئے تو رات بھی کٹ چلی ہے۔ صبح کاذب کے دھندلکے میں دھیمے سروں سے حالی کی غزل نے اپنی بھیرویں چھیڑی —— جو زمانہ ہندوستان میں حالی کا زمانہ تھا وہی زمانہ انگلستان میں میتھو آرنلڈ کا زمانہ تھا۔ ایک ہی وقت میں ایک قوم کا عروج اور دوسری قوم کے زوال کے باوجود ایک زمانہ ایک ہی زمانہ رہتا ہے اور خوش نصیب و بدنصیب پر یکساں اثر انداز ہوتا ہے۔ فاتح و مفتوح سمیت۔ پھولے پھلے اور لہلہاتے ہوئے انگلستان کے بارے میں میتھو آرنلڈ کہتا ہے کہ ہم دو دنیاؤں کے درمیان جی رہے ہیں۔ ایک دنیا مر چکی ہے اور دوسری دنیا میں بیدار ہونے کی سکت نہیں ہے۔ بے بسی کا یہی احساس حالی کی غزلوں میں بھی ہمیں ملتا ہے۔ اُردو کے کسی دوسرے غزل گو میں بے بسی کا احساس اس طرح ہمیں نہیں ملتا، جس طرح حالی کی غزلوں میں ملتا ہے۔ حالی بے بسی کا شاعر ہے۔ بے بسی کا لیکن بے دلی کا نہیں۔ لیکن یہ احساس مغلوبیت و مجبولیت کا مرادف نہیں ہے۔ حالی کی بے بسی میں ایک دبی دبی سی تڑکی تڑکی سی تلملاہٹ ہے۔ ہاتھ پاؤں مارنے کی کچھ بےچینی ہے۔ اس کی گھبراہٹ میں درماندگی، پس ماندگی کے باوجود قدم مارنے کی کچھ ٹھنک ہے۔

یاران تیزگام نے منزل کو جا لیا　　ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

حالی اور میتھو آرنلڈ کی متوازنت (PARALLELISM) اور لحاظوں سے بھی قابلِ توجہ ہے۔ جو انتقادی وضاحت (CRITIC CLEARANESS) اور سفاکلیس کی طرح روح کی جو مغموم تابندگی و شفافی (A SAD LUCIDITY OF SOUL) آرنلڈ کے یہاں ملتی ہے وہی ہمیں حالی کے یہاں بھی ملتی ہے۔ میر اور میر کے ہم نوا دوسرے شاعروں کو جن معنوں میں ہم درد و الم کا شاعر کہتے ہیں اس سے مختلف معنوں میں ہم حالی کو ہندوستان کی اُداسی کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ حالی کی غزلوں میں اُداسی کی فضا انفرادی یا عشقیہ ناکامی کے ماتم کی فضا نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی اُداسی کی فضا ہے۔ دونوں اُداسیوں میں وہی فرق ہے جو غمِ عشق و غمِ روزگار میں ہے۔ حالی کے ہاتھوں اُردو غزل غمِ دوراں کی منزلوں میں قدم رکھ رہی ہے۔ آرنلڈ اور حالی کی یہ مشابہت بھی کم قابلِ توجہ نہیں کہ دونوں اپنے اپنے ملک کے ادب میں نئی وسعتیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ آرنلڈ یورپ کے کلچر سے انگریزی ادب کو ہم آہنگ کرنا چاہتا تھا اور تنگ نظری (PHITISTINISM) سے اپنے اہلِ وطن کو آزاد کرنا چاہتا تھا۔ حالی بھی یہی کہتے ہیں "حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں"۔ حالی اور آرنلڈ دونوں شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صحیح تنقیدیں لکھتے ہیں۔ ادب و شاعری کے اصول مرتب کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ آرنلڈ کا کلچر حالی سے بہت وسیع ہے اور اس کی فکر بھی بلیغ ہے۔ آرنلڈ کی قوتِ اظہار بھی حالی سے بہت زیادہ ہے۔ لیکن ہم حالی کی غزلوں اور نظموں پر کھلی ہوئی آنکھیں ڈالیں تو ماننا پڑے گا کہ اپنے ہم عصر اُردو شاعروں میں حالی کی قوتِ اظہار و صلاحیتِ اظہار مختلف موضوعات و مسائل پر سب سے آگے بڑھی ہوئی ہے۔ امیر و داغ اپنے اُستادوں کا نوحہ لکھتے۔ . . . . . قوم کی تاریخ کا مسدس لکھتے۔ حبِ وطن پر کہاوت یا مناجات بیوہ لکھتے اور حالی کی کہی زمینوں میں غزلیں لکھتے تو شاید ہی عہدہ برآ ہو سکتے۔

آرنلڈ کی شاعری بھی حسین اور خوشگوار فریبوں یا دھوکوں (ILLUSIONS) سے مبرا ہے اور حالی کی شاعری بھی ٹھیٹھ عقلیت و واقعیت کی شاعری ہے۔ دونوں کو رومانیت سے وحشت اور کلاسکیت سے ہم آہنگی ہے۔ دونوں کی شاعری ہماری سوجھ بوجھ کو اُکساتی ہے اور جذبات کو چونکاتی ہے اور دونوں کی شاعری سے متاثر ہوتے ہوئے بھی ہم ان میں کسی چیز کی کمی محسوس کرتے ہیں۔ حالی کی غزلوں میں جس کمی کو ہم محسوس کرتے ہیں اُس کا پتہ دینے کی کوشش میں آگے چل کر کروں گا۔

ہاں تو حالی نے غزل میں ہمیں سچ بولنا سکھایا۔ عشقیہ غزلوں میں اور اخلاقی غزلوں میں بھی۔ حالی سے پہلے اور بعد اُردو کا کوئی مشہور غزل گو ایسا نہیں ہے جس نے کہ دو ٹوک باتیں کہنے کا، دو اور دو چار کہنے کا آلہ اور فن بنایا ہو۔ ایسا کرتے ہوئے بھی حالی اپنی واعظانہ و ناصحانہ غزل کو خشک و بے کیف ہونے سے بچاتے جاتے ہیں۔ حالی کی ان غزلوں کی چلبلی نثریت، اُن کی رُکی رُکی سی تلملاہٹ، ان کا احساسِ خلوص، ہلکی سی طنز و تلخی سے لیے

اِن کا تیور بے اختیارانہ ملوث ہو جانے غیر خوددارانہ للچاہٹ ترپاہٹ اور گھگھیاہٹ زندگی اور واقعاتِ زندگی سے اِن کا قرب ان میں اصلیت کا عنصر، ان کا اعتدال و توازن عقل کے ناخن سے شعورِ انسانی کو چھیڑنا۔ کبھی کبھی ان میں ایک اکھڑپن اور کھردراپن عموماً ان کا نرم اور دبا دبا ترنم یعنی ان میں تحت اللفظی کی صنعت، ان کی متین و مہذب بذلہ سنجی، ان کی روک تھام اور لئے دئے ہوئے انداز میں کہنے کی بات کہہ گزرنا۔ عشق کا پاکیزہ معیار، جذبات کا انضباط (DISCIPLINE) حسین سے حسین جھوٹ سے ان کا احتراز، رال ٹپکانے والی محبت سے اُس جنسیت زدگی سے جسے شدید شعریت رچ اور سنوار ضرور دیتی ہے لیکن جو رہتی ہے پھر بھی فساد اعصاب کی حامل اِس چھچھورے پن سے جسے فن کارانہ شوخی و طراری سے دلکش بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کا پاک و صاف ہونا یہ حالی کے تغزل کے وہ صفات ہیں جو اُسے چوٹی کے متغزلین میں جگہ دیں یا نہ دیں لیکن جو حالی کو ایسا غزل گو ضرور بنا دیتے ہیں کہ چوٹی کے غزل گو اس کی عزت کریں اور اس سے بڑے غزل گو ہوتے ہوئے بھی اس کے اشعار پر للچائیں۔ حالی نے اُردو غزل کو ایک ضمیر دی۔ حالی نے غزل کو نئی ذمہ داریوں سے روشناس کیا۔ حالی نے غزل کو احساسِ عمل دیا۔ حالی کی غزلوں میں ہمیں نئی فہرست مضامین ملتی ہے۔ روائتی تمثیلوں کے لئے پہلو نمایاں ہوتے ہیں، غزل کی صوتیات میں وطن کی زندگی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ غزل میں پہلے پہل ایک سماجی مافیہ (SOCIAL CONTENT) داخل ہوتا ہے۔ حالی نے غزل میں افادیت کے عناصر شامل کئے۔ حالی نے غزل خوانی کو صدی خوانی بنایا۔

حالی کی تقلید اپنی غزلوں میں مولوی اسمٰعیل نے بھی کی لیکن مولوی اسمٰعیل کی طبیعت کو غزل سے مناسبت نہ تھی۔ غزل میں حالی کے تتبع اور تقلید کا پورا پورا حق اگر ادا ہو سکا تو حالی کے شاگرد آزاد انصاری سے اور میرے والد مرحوم حضرت عبرت گورکھپوری سے۔ بیاں یزداں میرٹھی، نادر کاکوروی، تلوک چند محروم اور کچھ اور لوگوں نے بھی اپنی نظموں میں تو حالی سے کامیاب استفادہ کیا لیکن غزلوں میں ان حضرات سے حالی کا رنگ بنھ نہ سکا۔ کہیں کہیں اکبر الہ آبادی کی غزلیں حالی کی یاد دلا دیتی ہیں بے ردیف کی غزلوں کو حالی نے اپنے دیوان میں رواج دیا۔ بہت دنوں بعد اقبال نے بال جبریل اور ضرب کلیم میں غیر مرادف غزلوں کے نئے امکانات پیش کئے۔ صرف طریق کار یا تکنیک کے لحاظ سے نہیں بلکہ مقصد و معنی کے لحاظ سے بھی اقبال کی ان غزلوں کا سلسلہ حالی کی غیر مرادف غزلوں سے ملتا ہے۔ اگرچہ حالی کے بعد کی غزل گوئی، عزیز، حسرت، اصغر، فانی، یگانہ اور جگر کی غزل گوئی حالی سے بہت مختلف ہے۔ لیکن اصلیت اور سچائی، خلوص جذبات و شرافت جذبات کا جو عنصر ہم بیسویں صدی کی غزل میں پاتے ہیں کیا حالی کا اس میں کوئی حصہ نہیں!

حالی کا موازنہ کبھی کبھی نظیر اکبر آبادی سے کیا جاتا ہے۔ نظیر کے بعد (مثنوی، قطعہ قصیدہ اور مرثیہ کو اگر ہم نظر انداز کر دیں) مسلسل اُردو نظم ایک صدی تک سوئی رہی اور پھر حالی کے جگانے سے جاگی۔ حالی اور نظیر

دونوں سچائی واقعیت اور عقلیت کے شاعر ہیں۔ دونوں کی شاعری میں ایک ٹھوس پن ہے۔ کچھ لوگ کہہ دیں گے کہ دونوں کی شاعری میں ایک ٹھس پن بھی ہے۔ لیکن جس شیفتہ نے نظیر کی زبان کو ناقابل اعتبار بتایا وہ حالی کے ادبی رفیق تھے اور حالی کی زبان کو سند جانتے تھے۔ ادب کی تاریخ میں بھی ایسا بہت ہوتا ہے کہ مدعی سست گواہ چست، پرستاران غالب و مومن، ذوق کو جس ہیچ سمجھتے و بتاتے ہیں کیا غالب و مومن بھی ذوق کو اسی طرح خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اور تو اور داغ کے شاگرد اپنے استاد کے استاد ذوق کا ذکر بسا اوقات ایک مضحکہ آمیز سرپرستانہ لہجہ میں کرتے ہیں اور ذوق کو داغ کے لئے محض ایک تبرک سمجھتے ہیں۔ امیر اور داغ کے ہزارہا شاگرد اور معتقد حالی کو سرے سے شاعر ہی نہیں مانتے۔ یہ حضرات یہ نہیں سوچتے کہ غالب و مومن و شیفتہ و داغ و مجروح کا مقتدر ہم نشین ایسا گیا گذرا شاعر نہ ہوگا جیسا اپنے مذاق سے مغلوب ہو کر انھوں نے اسے سمجھ لیا ہے۔ خود داغ و امیر حالی کے رنگ کو اپنے رنگ سے بالکل مختلف پاتے ہوئے بھی حالی کو نظر انداز نہیں کرتے تھے اور نہیں کر سکتے تھے۔ حالی کے زمانہ میں قدامت پرست سے قدامت پرست چوٹی کے شاعر و ادیب حالی کو باتیں آنکھ سے دیکھ ضرور لیتے تھے۔ کوئی ناقابل توجہ شاعر اپنے لئے یہ نہیں کہہ سکتے۔

اعتراضوں کا زمانے کے ہے حالی پہ نچوڑ
شاعر اس ساری خدائی میں ہے گیا ایک ہی شخص

حالی پر اعتراض کرنا حالی کا لوہا ماننا ہے۔ ہاں تو بات تھی حالی اور نظیر کی۔ کئی باتوں میں مشابہت کے باوجود حالی اور نظیر ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ دونوں شاعری اور زندگی کو یکساں طور پر ایک ہی نظر یا نظریے سے نہیں دیکھتے تھے۔ نظیر صحیح معنوں میں جمہور اور عوام کا شاعر ہے۔ حالی متوسط طبقے یا جاگیریں کھو بیٹھنے والے طبقے یا بگڑے ہوئے رئیسوں یا حسب نسب والوں کے شاعر ہیں۔ دونوں کی وطنیت اور سماجیت میں فرق ہے۔ قوم کے جو معنی نظیر کے یہاں ہیں وہ معنی حالی کے یہاں نہیں ہیں۔ حال ہی میں نظیر کی بہت سی غزلیں ملی ہیں۔ اگرچہ ان غزلوں میں کسی سماجی مقصد کی ترجمانی نہیں ہے لیکن ان غزلوں میں وہ زندگی ہے جس کی اسپرٹ حالی کی غزلوں کی اسپرٹ سے وسیع ہے۔ نظیر کی شخصیت حالی کی شخصیت سے زیادہ بھرپور ہے۔ نظیر حالی سے بہت بڑا اور حالی سے بہتر انسان تھا —— اور حالی سے بہت بڑا شاعر بھی تھا۔ لیکن حالی و نظیر دونوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے بہ حیثیت شاعر —— وہی کہا جو بحیثیت انسان محسوس کیا۔ نظیر کی عظمت کا احساس کرتے ہوئے بھی حالی کی جو قدر و قیمت میرے دل میں ہے وہ کم نہیں ہوتی۔ آخر خلوص بھی کوئی چیز ہے۔ حالی نہ معمولی ادیب تھا نہ معمولی نظم نگار۔ نہ معمولی غزل گو اور نہ اس کی شخصیت خلوص سے خالی تھی۔ کوئی نقاد ادب ہو کر کسی کا گمر لے گا؟

حالی کا دیوانِ غزلیات بہت مختصر ہے۔ ان کے اس مختصر دیوان کو دیکھ کر خواجہ میر درد کے دیوان کی یاد آتی

ہے۔ اعتدال اختصار لئے دئے پن دونوں کے یہاں ہے ۔لیکن درد کے یہاں انسان اور دیوتا کا ایسا امتیاز ملتا ہے، درد کے یہاں انسانیت میں روحانیت کی ایسی جھلک ملتی ہے جو حالی کے یہاں مفقود ہے ۔حالی کا رکھ رکھاؤ پن نہیں ہے، حالی کا پاکیزہ اور پاکیزہ سے زیادہ مہذب معیار عشق نہ اسی معیاری نیکی کا پتہ دیتا ہے ۔نہ اس سپردگی و خلوص کا، نہ اس طہارت قلب کا جس کا آئینہ دار درد کا کلام ہے ۔حالی کی شخصیت و شعور کی ہیر یا بطن (CORE) میں کوئی سخت حصہ یا عنصر تھا جو حل ہونے سے رہ گیا تھا۔ اور اسی امر میں ہم اس کمی، اس عدم تکمیل، اس ناآسودگی کا راز پا سکتے ہیں۔ جس کا احساس حالی کی شاعری میں ہم کو ہوتا ہے۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ حالی نے غزل کو احساس عمل دیا۔ لیکن عملیت زندگی میں خواہ خلوص کی پٹ بھی دے دی جائے رہتی ہے کچھ چھوٹی اور سستی سی چیز۔ حالی کی غزلوں میں عمل کی جو تحریک و ترغیب ہمیں ملتی ہے واقفیت و اصلیت و عقلیت کا جو عنصر ہمیں ملتا ہے ان میں اس چیز کی کمی ہے جس کا ذکر بھی میں کر چکا ہوں یعنی کسی کشف یا روحانیت یا رویا (VISION) کی کمی ۔ اسی سبب سے ان کے پیام و آواز میں ایک سکرن آجاتی ہے ۔ حالی عمل میں وہ جمال و جلال نہیں پیدا کر سکتے ۔ بیداری میں خواب و محویت کے وہ اجزا شامل نہیں کر سکتے عمل کو عظمت کے وہ عناصر نہیں دے سکتے جن کے لئے انسان کی روح پیاسی رہتی ہے ۔ واقعیت و اصلیت برحق لیکن بغیر اس عینیت (IDIALISM) کے واقعیت و اصلیت بھی اٹک کے رہ جاتی ہے ۔ اس گھاؤ کا یہی احساس حالی کے کلام میں ہمیں ملتا ہے ۔ خاص کر ان کی غزلوں میں شاعر کا پاؤں ضرور زمین پر جما رہنا چاہئے لیکن انگلیوں سے کبھی کبھی اسے ستاروں کو بھی چھیڑ دینا چاہئے ۔ اعتدال کے باوجود زندگی و شاعری دونوں میں ایک انتہاپسندی کی ضرورت ہے ۔ لامحدود کا احساس عمل کے علمبردار ہوتے ہوئے تقدیر انسانی کا کوئی بلند و موثر تخیل یا احساس حالی کے پاس نہیں تھا، نہ سرسید احمد کے پاس تھا۔ گویا حالی کا لاشعور ان کی اس کمی پر انہیں ملامت کر رہا ہے اور اسی سے اُن کی آواز میں ایک ہچکچاہٹ پیدا ہو جاتی ہے! اصلاحی شاعری عمل کو بھی بلند نہیں بنا سکتی ۔ ایسی شاعری میں عمل چالاکی اور نیکی مصلحت وقت ہو کر رہ جاتی ہے ۔ حالی کی پُرخلوص تلملاہٹ ان کے پیام عمل کو بالکل بے کیف ہونے سے بچا ضرور لیتی ہے ۔ حالی کی رُکی رُکی آواز میں جو رل کشی ہے ۔ اُس کی طرف کئی بار اشارہ ہو چکا ہے لیکن یہ رُکاؤ کچھ تو اس اُلجھن کی وجہ سے ہے جو ۵۷ء کے غدر کے بعد ناگزیر تھی اور چونکہ حالی اپنے زمانہ کے نمایندہ تھے اس لئے ان کے شعور میں یہ اُلجھن پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ اور رہبرانہ کی شخصیت کی اس محتاط سنجیدگی کی وجہ سے بھی ہے ۔اس لاأبالی پن اور بیباکی کے فقدان کی وجہ سے ہی جو کچھ نفسیاتی گتھیوں کا پتہ دیتا ہے۔ حالی کی شخصیت، شعور و وجدان کی یہی خصوصیتیں حالی کی عشقیہ غزلوں اور عشقیہ اشعار میں بھی کارگر ہیں ۔ ان کے عشقیہ اشعار میں ایک دلکش چٹیلا پن، ایک حساس متانت، ایک نغمگی ضرور ہے لیکن حالی کے یہاں ان عناصر کا فقدان ہے جو عمل یا عشق کی شاعری کی ماورائیت و عظمت دے سکیں ۔کھل کے نہ بول سکنا اس امر کی چغلی کھاتا ہے کہ دل میں چور ہے۔ حالی اپنے عشقیہ جذبات سے خود کچھ ڈرے ڈرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

پھر دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

یہی سبب ہے کہ سینکڑوں خوبیوں اور لذتوں کے حامل ہوتے ہوئے۔ بھی حالی کے عشقیہ اشعار میرؔ، غالبؔ، آتشؔ ومومنؔ بلکہ داغؔ وامیرؔ کے بھی عشقیہ اشعار کچھ دب جاتے ہیں۔ شدت خواہش نہ ہونا تو خیر ایک بات ہے (حالانکہ کیا یہ بھی ایک طرح کی "نامردی" نہیں ہے؟) لیکن شدت تخیل وشدت تصور نہ ہونا، وہ سپردگی وگم شدگی نہ ہونا، وہ ماورائی معصومیت نہ ہونا ایک کمی ضرور ہے جس کے سبب سے عشقیہ شاعری میں خواہ اور بہت سے محاسن جمع ہو جائیں لیکن عظمت نہ آسکے گی۔ ان کی غزلیں پڑھتے ہوئے یہ خیال دبے پاؤں دل میں آئے بغیر نہیں رہتا کہ حالیؔ کا دل حسن عمل یا حسن صورت پر ٹوٹ کر کیوں نہیں آتا؟ شاعری میں ہوش وبصیرت کی جتنی ضرورت ہے اتنی ہی جوش وسرمستی کی بھی ضرورت ہے۔ ہم جو کچھ بھی کہیں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ انتہا اور شدت شاعری کے جز ولاینفک ہیں۔ واقعیت واصلیت بھی شاعری میں پرواز خیال سے ہی پروان چڑھتی ہیں اور یہی پرواز خیال حالیؔ کے یہاں نہیں ہے۔ حالیؔ واقعیت کو معجزہ نہیں بنا پاتے۔ اسی سے ان کی شاعری بھی ساحری نہیں ہونے پاتی۔ احتیاط حالی کی خوبی بھی ہے اور کمزوری بھی۔ لیکن یہ احتیاط بالکل ناقابل قبول اس لئے نہیں ہے کہ وہ حساس ہے اور حالیؔ کی نفسیات کی ایک کش مکش کا پتہ دیتی ہے۔ یہی وہ اسباب ہیں جن سے حالیؔ کی غزل میں ہمیں کسی چیز کی کمی کا احساس ہوتا ہے اور جو حالی کی شاعری کو عظمت کے قریب سے کترا کے نکال لے جاتے ہیں۔

لیکن جب ہماری روحیں تھکی ماندی ہوتی ہیں جب ہم جانگداز شاعری، بڑے بول والی شاعری، یا اپنی رنگینیوں اور جلوہ سامانیوں سے چکاچوند سی پیدا کر دینے والی شاعری، زلزلہ ساماں شاعری، تیز آنچ کی شاعری، جذبات پر زور ڈالنے والی شاعری، برداشت کرنے کی سکت اپنے اندر نہیں پاتے، جب ہم کچھ دبے ہوئے ہوتے ہیں، اُس وقت ہم دیوان حالی کو ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں اور اُس کی نرم کسک، ہلکی ہلکی تلملاہٹ، کہیں کہیں اُس کے رچاؤ بسے "تازگی" پیدا کر دینے والی سادگی اور سچائی اس کا سنجیدہ شمول، اور اُس کی آواز کی آہستگی، خیالات کی استواری کچھ دیر کے لئے اچھی لگنے والی اس کی بے رنگی، اس کی قدرے ناموخراش سامعہ نوازی، اُس کے دھیمے سُر، اُس کی گنگناہٹ، اس کی معصومیت، اس کی متوجہ کر لینے والی بزدلی، اور جھجک، سوز وساز کی ٹمٹماہٹ، اُس کے اعتدال وتوازن کا کچھ دیر کے لئے سہارا لے لیتے ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جو چوٹی کے غزل گو شعراء کو بھی حالیؔ کی طرف متوجہ کر دیتی ہیں اور جو بہت دنوں تک حالیؔ کی غزلوں کو بھلائے جانے سے محفوظ رکھیں گی۔

مرہٹی زبان پر فارسی کے اثرات

ڈاکٹر[1] پی۔ام۔جوشی۔

دکن پر مسلمان بادشاہوں کی حکومت کا ایک فطری نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دکنی زبانوں پر حکمراں طبقہ کی زبان کا اثر پڑنے لگا اس زمانہ میں ہندوؤں اور حکمراں مسلمانوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم تھے۔ اور حکومت کے امور میں بے شمار ہندو شامل تھے، پھر سلطنت کے کاغذات بھی مقامی زبان میں تیار ہوتے تھے اور مسلمان بادشاہ ایک عام غیر جانب داری کی پالیسی پر کاربند تھے۔ ان تمام باتوں نے مل کر فارسی اور مرہٹی دونوں زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹی زبان میں بہت سے فارسی الفاظ و محاورات داخل ہوگئے جو اب اس کا جزو بن کر رہ گئے ہیں۔ مسٹر راجوادی اپنی تصنیف "تاریخی پر ستاونا" میں لکھتے ہیں کہ سترھویں صدی عیسوی میں مرہٹی زبان بولنے والوں کے اعلیٰ طبقہ میں چالیس فی صدی الفاظ فارسی کے مستعمل تھے آج بھی بہت سے فارسی کے الفاظ اور محاورات مرہٹی زبان میں شامل ہیں اور بہت سے ایسے محاورے رائج ہیں جو فارسی سے ماخوذ ہیں۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرہٹی زبان، فارسی سے ربط قائم کر کے بہت گہرے طور پر متاثر ہوئی اور وہ اثرات اب تک قائم ہیں بحیثیت مجموعی مرہٹی زبان کو فارسی کے ان اثرات سے بہت فائدہ پہنچا ہے اس لئے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ اس کا ذخیرۂ الفاظ بڑھ گیا ہے بلکہ اس میں پُرخلوص جذبات کے اظہار اور نفاست و تہذیب برتنے کے کچھ ایسے الفاظ و طریقۂ اظہار شامل ہوگئے ہیں جو فارسی سے میل جول بڑھانے سے پہلے مرہٹی زبان میں نہیں تھے۔ چنانچہ مرہٹی پر فارسی کے اثرات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) ذخیرۂ الفاظ، (۲) محاورے، (۳) ترتیبِ الفاظ

[1] صفحہ ۲۰

یا جملے کی ساخت۔ میں نے ذیل میں ان تینوں اثرات کی مثالیں پیش کی ہیں جن سے میرا نکتہ واضح ہو جائے گا۔

مرہٹی زبان میں فارسی کے ہوبہو یا کچھ بگڑے ہوئے الفاظ اتنی کثرت سے موجود ہیں کہ یہاں پر اُن کی ایک مکمل فہرست نہیں پیش کی جا سکتی۔ یہ الفاظ اب مرہٹی زبان میں ایک دم سے گھل مل گئے ہیں اس لئے آج مرہٹی زبان بولنے والے ایک عام مرد یا عورت کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ یہ الفاظ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے مرہٹی زبان میں رائج نہیں تھے۔ اس قسم کے الفاظ میں سے کچھ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ قرض، گنبد، دفتر، قیاس، غلام، داخل، شمع، آسمان، گذشتہ، دام، وزن، عجب، عرق، زبانی، روانہ، عقل، خالی، جانور، فریاد۔

یہ الفاظ روزمرہ کی بول چال میں کثرت سے مستعمل ہیں یہ بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ مرہٹی زبان کے دس فیصدی الفاظ فارسی زبان کے یا تو ہو بہو الفاظ ہیں یا ان کی بدلی ہوئی شکل۔ مرہٹی زبان میں فارسی جملہ محاوروں کے استعمال کی سب سے نمایاں مثال خط کے آداب القاب میں ملتی ہے۔ लक्ष्मी प्रसन्न गज मान्य राजश्री परोपकार मूर्ति

یہ الفاظ دراصل "دام دولتہ مقبول دولت صاحب گنج شاہاں کا ترجمہ ہیں۔ اسی طرح ایک پر تکلف مرہٹی مکتوب کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے۔ बहुत काय लिहिणे तरी मृदु आसा یا बहुत काय लिहिणे हे विनंती

جو زیادہ چہ نویسم شما خود عاقل ہستند یا زیادہ چہ نویسم حد ادب کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح مرہٹی زبان کے عدالتی کاغذات میں کئی ایسے جملے مستعمل ہیں جو فارسی کا لفظ بلفظ ترجمہ ہیں۔ مثلاً راجी खुशी नेव अक्कल हुशारीने

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مرہٹی زبان میں جملوں کی ترتیب اور طرز ادا پر فارسی کا کتنا گہرا اثر ہے۔ مرہٹی زبان میں عدالتی کاغذات میں ہر قدم پر اس قسم کے جملے ملتے ہیں:- किल्ले, मौजे, परगणे

خالص مرہٹی میں اس کو یوں ہونا چاہئے تھا किल्ला, परगणा

بہت سے عام الفاظ مثلاً "हाय खाणे" اور "हाक मारणे" اصل قسم خوردن اور بانگ زدن کا براہ راست ترجمہ ہیں۔

اس کے علاوہ فارسی کے بہت سے اسم صفت اور "صفت افعال" وغیرہ بھی مرہٹی زبان میں رائج ہیں۔ مثلاً हरएक बेदिल, गैर राहा बागफूक وغیرہ

اور بہت سے الفاظ اصل مرہٹی کے ایسے ہیں جن کے آخر میں فارسی کے مطابق ردّ و بدل کر لیا گیا ہے۔ مثلاً दफ्तरदार, कानेदार, अंग्रेजिरी وغیرہ

اس قسم کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن اوپر کی مثالوں سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ مرہٹی زبان کے لفظوں، محاوروں اور اصطلاحات و الفاظ پر فارسی کا گہرا اثر ہے[1]۔

---

[1] اس سلسلہ میں اس بات کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ مرہٹی زبان انگریزی سے بھی متاثر ہوئی ہے اور کچھ ایسے الفاظ پیدا ہو گئے ہیں جو انگریزی الفاظ کا ترجمہ ہیں۔ انگریزی نے ایک حد تک مرہٹی زبان کے محاوروں اور جملوں کی ترتیب پر بھی اثر ڈالا ہے

دکن میں اسلامی حکومت نے مرہٹوں کے لباس و تراش پر بھی اثر ڈالا۔ اعلیٰ طبقہ کے مرہٹوں نے مسلمانوں کا پورا لباس اختیار کر لیا اور چست پائجامہ، اچکن اور مغل طرز کا جوتا پہننا شروع کر دیا۔ لیکن مسلم حکومت نے مرہٹوں کی زبان کو جس قدر متاثر کیا اتنا اُن کے لباس کو نہیں کر سکا۔ مرہٹوں نے اب مغلوں کے لباس کو تو ترک کر دیا ہے لیکن ان کی زبان پر فارسی کے اثرات اس وقت تک رہیں گے جب تک اُن کی زبان زندہ ہے۔

عادل شاہی عہد حکومت کو بجا طور پر یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے ہندستان کے گذشتہ تمدن کے نشو و نما میں کافی حصہ لیا ہے۔ بیجاپور کے بادشاہوں نے دکن کو ہندستان کی دو مشہور ترین عمارتیں عطا کیں، ابراہیم روضہ اور گول گنبد۔ پھر فرشتہ کی مشہور و معروف تواریخ اور ظہوری کے ادبی کارنامے بھی اسی عہد سے وابستہ ہیں۔

لیکن جہاں تک دکن کا تعلق ہے عہد عادل شاہی کے تہذیبی کارناموں میں سب سے اہم حیثیت جس چیز کو حاصل ہے وہ دکن کی زبان پر عادل شاہی دربار اور عدالت کا اثر یعنی مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر۔

نئی تنظیم اور اعلیٰ تعلیم

از: ——— ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

یہ غیر معمولی واقعہ انسانوں کے احساسات کو تیز کرنے اور اُن کی توجہ کو اپنی گذشتہ موجودہ اور آیندہ حالات کا جائزہ لینے کی طرف منعطف کرتا ہے۔ جنگ اور وہ بھی اِس زمانہ کی جنگ جس طرح عالمگیر ہوتی ہے اسی طرح وہ دنیا کے تمام باشندوں کو پیش بندی کی طرف مائل کرتی ہے کیونکہ اس حقیقت سے شاید ہی کسی سمجھدار شخص کو انکار ہوگا کہ اگرچہ جنگ کے لیے تیاری کرنا بہت مُشکل کام ہے لیکن امن اور حقیقی امن کے لئے تیاری اس سے بھی زیادہ مُشکل ہے۔ جنگ میں تو دشمن پر فتح پانیکا مقصد بالکل متعین ہوتا ہے اور ساری تیاریاں اسی مقصد کے تحت کی جاتی ہیں۔ لیکن امن کی تیاری میں سب سے پہلے منزل مقصود ہی کے متعلق اختلاف رائے سے سابقہ پڑتا ہے اور مختلف افراد اور گروہ مختلف سیاسی۔ اقتصادی اور عمرانی نظریئے اور نصب العین پیش کرتے ہیں ——— — ——— اگر خوش قسمتی سے کسی ایک نصب العین پر اتفاق رائے حاصل بھی ہو جائے تو پھر اس کے حصول کے لئے طریق کار میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ غرض یہ واقعہ ہے کہ امن کے لئے تیار ہونا جنگ کے لئے تیاری کرنے سے زیادہ مُشکل اور پیچیدہ کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ممالک اور اکثر جماعتیں بعد جنگ کے لئے اصلاحی اور تنظیمی تجویزیں مرتب کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کر رہی ہیں تاکہ جنگ ختم ہوتے ہی ان تجویزوں پر عمل شروع کر دیا جائے۔

یوں تو معمولی زمانہ میں بھی سوسائٹی کے لئے تعلیم و تربیت کو سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے لیکن ایک بڑے انقلاب کے بعد اور تنظیم جدید کے وقت اس مسئلہ کی اہمیت غیر معمولی ہو جاتی ہے اور جب تک اس کو صحیح طریقہ پر حل نہ کیا جائے نئی تنظیم کی بنیادیں نہیں رکھی جا سکتیں۔ نئی تنظیم کے موقع پر فرد اور جماعت کی دوگونہ ضروریات کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ ایک وہ ضروریات ہیں جو زندگی کو باقی رکھنے کے لئے ناگزیر ہیں اور دوسری وہ جو تمدن اور تہذیب کی حفاظت اور اُس کو فروغ دینے کے لئے لازمی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہماری نئی نسلوں کی

تعلیم اور تربیت ابھی ہو رہی ہے کہ وہ جماعت کی ان دونوں یا کسی ایک قسم کی ضروریات کو مہیا کرنے کے کام آئیں گے۔ کسی ملک کی ترقی کے لئے میکانی قوت اور خام اشیاء کے علاوہ انسانی قوت کی بھی سخت ضرورت ہوتی ہے بلکہ انسانی قوت کے بغیر میکانی قوت اور خام اشیاء کو حاصل کرنا اور ان سے کام لینا ہی ممکن نہیں۔ اس لئے سب سے پہلے انسانی قوت فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ انسانی قوت سے میری مراد باشندوں کی تعداد سے نہیں بلکہ سائنسی علوم و فنون اور میکانیت کے ماہرین اور ماہر عاملین سے ہے۔ ان ماہرین اور ماہر عاملین کے پیدا کرنے کا انحصار اعلیٰ جامعاتی اور ٹیکنیکل تعلیم پر ہے۔ موجودہ اعلیٰ تعلیم کا نتیجہ ظاہر ہی ہے کہ ملک میں شاعر، افسانہ نگار اور لیڈر تو بہت پیدا ہو رہے ہیں جن سے جماعت کو بقائے حیات اور بقائے تمدن کی کشمکش میں مدد لینا تو در کنار خود ان کا وجود ہی جماعت کے لئے بار دوش ہو گیا ہے۔ ملک میں سائنس، انجینئری، صنعت و حرفت، طب اور حفظان صحت کے ماہرین تو کجا معمولی تربیت یافتوں کی بھی بہت قلت ہے اور جب کبھی کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو بیرون ملک سے لوگوں کو بلانا پڑتا ہے۔ لیکن اب تو یہ بھی ممکن نہیں رہا کہ سمندر پار سے ماہرین آ کر ہماری مدد کر سکیں اور ہمارے مسائل حل کر سکیں۔ جنگ کے ختم پر بھی ماہرین کو درآمد کرنے کے امکانات بہت کم رہیں گے کیونکہ ہر ملک کو خود اپنے لئے ان ماہرین کی ضرورت ہو گی اور ایک عرصہ دراز تک کوئی ملک اس کے لئے تیار نہیں ہو گا کہ اپنی ضروریات کو نظر انداز کر کے ماہرین کو غیر ممالک روانہ کیا جائے۔

اس لئے ہم کو چار و ناچار اپنی مدد آپ کرنی پڑے گی اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ ابھی اور اسی وقت تیاری شروع کر دی جائے تاکہ ختم جنگ تک یا اس کے بعد جلد سے جلد ماہرین کی ایک معقول تعداد ملک کے صنعتی مسائل کو حل کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ سالہا سال تک ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اگر نوجوانوں یا ان کے سرپرستوں کو تعلیم کی نوعیت کے انتخاب میں آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ عام طور پر ایسے مضمون انتخاب کرتے ہیں جن سے امتحانوں کو کامیاب کرنے میں سہولت تو ہو جاتی ہے یا جن سے معمولی درجہ کی دفتری ملازمت حاصل کرنا ممکن ہو جاتا ہے لیکن ملک اور قوم کے صنعتی اور سیاسی مسائل کا حل نہیں ہوتا۔ اس لئے جب تک تمام افراد قوم میں تعلیم کے مسئلہ کو اجتماعی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا رجحان پیدا نہ ہو، حکومت یا جماعت کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ قانون سازی یا رائے عامہ کے ذریعہ نوجوانوں کو ان علوم و فنون یعنی سائنس، ٹکنالوجی، زراعت، صنعت و حرفت وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب بلکہ مجبور کرے جن کی اس وقت شدید ضرورت ہے۔ انفرادی آزادی بے شک ہر انسان کا پیدائشی حق ہے لیکن اس زمانہ میں ہر فرد بشر اپنی زندگی علیٰحدہ طور پر تمام دوسرے انسانوں سے بے تعلق ہو کر بسر نہیں کر سکتا بلکہ وہ ایک جماعت اور بڑی جماعت کے ساتھ مل کر رہنے سہنے پر مجبور ہے تاکہ اپنے جسمانی، ذہنی اور روحانی قوتوں کو اطمینان کے ساتھ ترقی دے سکے۔ اس لئے لازم ہے کہ اس عبوری دور میں تعلیم و تربیت کو قومی اور اجتماعی حیثیت سے دیکھا جائے تاکہ جماعت اور ملک کی حالت استوار اور ترقی پذیر ہو سکے۔

حاصل کلام یہ کہ تنظیم جدید میں تعلیم و تربیت کو (NATIONALIZE) کیا جائے جس طرح کہ بیرونی حملہ آوروں کے خطرے کے زمانے میں فوجی تیاری اور تربیت کو قومی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے اپنی کتاب "تعلیم کا مسئلہ" میں لکھا ہے ـــ

"افراد کی طرح اقوام کی زندگی کا بھی یہ قابل انکار اصول ہے کہ پہلے ضروریات زندگی کی تکمیل کی جائے اور جب ضروریات کے تمام سامان مہیا ہو جائیں تو پھر عیش و عشرت کے سامان کی فراہمی کی طرف رجوع کرنا جائز ہے۔ اس وقت شعر و سخن ہمارے لئے ذہنی تعیش سے زیادہ نہیں۔ سوائے ان صورتوں کے جن میں شاعری سے پیغمبری کا کام لیا جائے۔ ہمارے بقائے تحفظ اور ترقی کے لئے سائنس اور ٹکنا

فوری ضروریات میں داخل ہیں؟" غرض کہ اس وقت یونیورسٹی میں اکثر نوجوانوں کا شعر و شاعری، زبان و ادب اور اسی قسم کے مضامین کی تعلیم حاصل کرنا صرف ان کا انفرادی نقصان ہے بلکہ قومی نقصان بھی ہے۔ انفرادی نقصان اس طرح کہ جو معلومات وہ خود اپنے طور پر فرصت کے اوقات میں حاصل کر سکتے تھے وہی انھوں نے یونیورسٹی میں حاصل کیں حالانکہ اس قدر میں وہ یونیورسٹی میں سائنس یا ٹکنالوجی بہ آسانی حاصل کر سکتے تھے جو خانگی طور پر حاصل نہیں ہو سکتی۔ قومی نقصان اس طرح کہ اگر یہی نوجوان یونیورسٹی میں سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کرتے جو خانگی طور پر محال ہے تو ان میں سے کئی ایک انفرادی ایجادوں سے ملک و قوم اور بنی نوع انسان کو فائدہ ہوتا۔"

ہر اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کو اپنی فرصت کے اوقات میں شعر و سخن، زبان و ادب، تاریخ و فلسفہ وغیرہ مضامین کی بنیادی معلومات حاصل کرنی چاہئیں جو ایک متمدن انسان اور مہذب شہری کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن یونیورسٹی میں تو معدودے چند افراد کے سوا باقی سب کو سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنی ضروری ہے۔ چند لوگ جو زبان و ادب، تاریخ و فلسفہ وغیرہ سے حقیقی شغف رکھتے ہیں اور ان میں تحقیقی کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ جامعات میں ضرور ان مضامین کی طرف رجوع ہوں لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوگی اور استادوں، والدین اور حکومت کو لازم ہونا چاہئے کہ ذہنی آزمائشوں وغیرہ کے ذریعہ ان مضامین سے حقیقی دلچسپی رکھنے اور ان میں تحقیقی کام کر سکنے کی صلاحیت رکھنے والوں کی شناخت کے طریقے معلوم کریں اور سوائے ایسے چند طالب علموں کے باقی سب نوجوانوں کو سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب بلکہ مجبور کریں۔

ممکن ہے یہاں یہ اعتراض کیا جائے کہ بہت سے طلباء میں سائنس پڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور نہ وہ سائنس سے دلچسپی رکھتے ہیں پھر انھیں کس طرح سائنس کے مضامین پڑھنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ یہ خیال بھی ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اوّل تو ثانوی جماعتوں میں سائنس پڑھائی ہی نہیں جاتی یا اگر پڑھائی بھی جاتی ہے تو یہ تعلیم بالکل ابتدائی باتوں تک محدود رہتی ہے پھر کیسے قیاس کر لیا گیا کہ عام طلباء کو سائنس سے دلچسپی نہیں ہوتی؟ کیا کسی علم کی مبادیات بھی کہیں دلچسپ ہوتی ہیں؟ خود اپنی مادری زبان کو لیجئے۔ ہم نے آج تک ایک انسان بھی ایسا نہیں دیکھا جس پر الف بے سیکھتے وقت یا گردانیں یاد کرتے وقت ذوق و شوق کے مارے جذب و وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہو۔ تو پھر چونکہ قواعد اُردو ہر مبتدی کے لئے غیر دلچسپ ہوتی ہے کیا اسے اپنی زبان سیکھنے سے دست بردار ہو جانا چاہئے؟ یہی حال ابتدائی سائنس کا ہے جو در اصل سائنس کی قواعد ہے۔ اس ابتدائی سائنس میں سے گزرنے کے بعد اعلیٰ سائنس اتنی ہی دلچسپ ہو جاتی ہے جیسی قواعد اُردو میں سے گزرنے کے بعد نذیر احمد اور حالی کی کتابیں۔

غرضکہ ملک کی تنظیم جدید اور ترقی کے لئے ماہرین اور ماہر عاملین کو تیار کرنا سب سے زیادہ اہم ہے۔ لیکن اس کو یاد رکھنا چاہئے کہ کسی علم و فن میں کمال یا مہارت محض بی۔ ایس۔ سی یا ایم۔ ایس۔ سی کی نصابی تعلیم ختم کرنے اور امتحان کامیاب کرنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ایم۔ ایس۔ سی۔ کے بعد ایک طویل مدت تک قابل اور ماہر اساتذہ کے ساتھ تحقیقاتی کام میں منہمک رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے لازمی ہے کہ ایم ایس سی کامیاب کئے ہوئے اور صلاحیت رکھنے والے ہونہار نوجوانوں کو معقول تنخواہیں دے کر سائنس اور فنی مہارت حاصل کرنے اور تحقیقات کرنے کے لئے وقف کر دیا جائے۔ اگر موجودہ سائنٹفک اور ٹکنیکل اداروں میں نوجوانوں کو کافی تعداد میں کماحقہٗ کافی مہارت حاصل کرنے کا موقع نہ ہو تو مرکزی تنظیموں کو خود ایسے ادارے اور تربیت گاہیں مہیا کرنی چاہئیں اور جو پیسہ

عموماً شور و شغب کے لیے یا کانفرنسوں اور انجمنوں میں نام و نمود کی خاطر خرچ کیا جاتا ہے وہ ان سائنٹفک اور ٹکنیکل اداروں پر لگا دینا چاہیے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ نئی تنظیم میں بقائے حیات اور بقائے تمدن کی ضروریات پر سب سے پہلے توجہ کرنی پڑے گی اور ان ضروریات کو مہیا کرنے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے ماہرین اور ماہر عاملین کی ایک کثیر تعداد تیار کی جائے۔ ان ماہرین اور ماہر عاملین کی تیاری کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے ہاں ہر سائنس اور ہر فن کے دو چار ایسے اساتذہ ہوں جو نہایت اعلیٰ قابلیت رکھتے ہوں اور جو اپنے شاگردوں کو کامل تعلیم اور تربیت دے سکیں۔ میری قطعی رائے یہ ہے کہ اس وقت دورانِ جنگ میں اگر ہم نئی تنظیم کے لئے اور کچھ تیاری نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا ضرور کریں کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے ہر اہم مضمون کے لئے ایک یا دو ماہر اساتذہ ایسے تیار کر لیں جو اپنے فن میں کمال رکھتے ہوں اور جو جنگ کے بعد ایک خاص لائحہ عمل کے تحت متعدد ماہرین او. ماہر عاملین تیار کر سکیں۔ اس کے لئے یہ کیا جا سکتا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے جو اعلیٰ تعلیم و تربیت یافتہ لوگ اس وقت ہمارے ہاں موجود ہیں ان میں سے ایک یا دو مناسب اصحاب کا انتخاب کر کے انگلستان، امریکہ یا روس بھیجا جائے تاکہ وہ اپنے فن میں ضروری مہارت اور کمال حاصل کریں اس کے لئے جو کچھ بھی اخراجات ہوں گے اُن کو تنظیم جدید کے موازنے میں محسوب کیا جا سکتا ہے۔

اگر اس وقت کسی کو سمندر پار بھیجنا ہر طرح ناممکن ہے تو پھر خود ہندستان میں جو ادارے موجود ہیں اور جن کی نشان دہی آئندہ سطور میں کی جائے گی اُنھیں سے بہترین فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

اب ہم بقائے حیات اور بقائے تمدن کی مختلف ضروریات پر فرداً فرداً غور کریں گے اور دیکھیں گے کہ ان لوازمات کو کما حقہ مہیا کرنے کے لئے کس قسم کی تعلیم اور تربیت حاصل کئے ہوئے ماہرین کی ضرورت ہے۔

بقائے حیات کے لئے اوّلین اور بہترین لوازمات بالترتیب (۱) غذا (۲) لباس (۳) مکان اور (۴) ادویہ ہیں۔

(۱) غذا۔ —— ہندستان اگرچہ ایک زراعتی ملک کہا گیا ہے۔ درحقیقت یہاں کی تقریباً اسّی فی صدی آبادی زراعت پیشہ ہے لیکن اس کے باوجود بنگال اور دوسرے مقامات کے حالیہ قحط نے ظاہر کر دیا ہے کہ زندگی کی اس سب سے بڑی ضرورت کے معاملے میں بھی ہمارا ملک خود مکتفی نہیں ہے۔ اس کی وجہ قطعی یہ نہیں کہ ملک میں قابل کاشت زمین کی کمی ہے بلکہ یہاں کے کسان اوّل تو بہت غریب ہیں اور دوسرے زراعت کے جدید سائنٹفک طریقوں سے ناواقف ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فی ایکر جس قدر پیداوار دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتی ہے اس کا عشر عشیر بھی ہمارے یہاں نہیں ہوتی ملک کی قابل کاشت زمین کا ایک تہائی حصہ یعنی تقریباً پندرہ کروڑ ایکر اب بھی بیکار پڑا ہوا ہے۔ اور اس میں کوئی کاشت نہیں کی جاتی۔ اس کے علاوہ جس قدر زمین بھی زیر کاشت ہے اُس کے صرف ۲۰ فی صد حصہ میں آب پاشی ہوتی ہے، باقی حصہ پانی سے بالکل محروم ہے کسانوں کے ہل اور دوسرے زراعتی آلات اب بھی وہی ہیں جو ہزاروں برس قبل استعمال ہوتے تھے۔ متواتر کاشت کئے جانے اور کھاد سے محروم ہونے کی وجہ سے زمین بے حد کمزور ہوتی ہے۔ جو قدرتی کھاد مویشیوں کے فضلے سے حاصل ہوتا ہے ان کو زمین کے لئے کھاد کی طور پر استعمال کرنے کے بجائے غربت اور جہالت کی وجہ سے ان کو جلانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

(Scholars)

ہماری غذا کے متعلق ان مسئلوں کو حل کرنے کے لئے مختلف قسم کے ماہرین کی ضرورت ہوگی سب سے پہلے تو علم نباتیات کے طیلسانیوں کی ضرورت ہے جو علم زراعت کے ایم۔ ایس۔ سی پاس کرنے کے بعد پوسا یا دہلی کے امپیریل انسٹی ٹیوٹ میں زراعت کے مختلف مسائل کی اعلیٰ تربیت اور تحقیقاتی مہارت حاصل کرنے میں تین چار سال تک منہمک رہنا چاہیے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ ہمارے ہاں زیر کاشت زمین کا بہت بڑا حصہ پانی سے محروم ہے اس زمین کو پانی پہنچانے کے لئے آب پاشی کے ماہر انجینیروں کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں انجینیری کی جو تعلیم دی جاتی ہے اس سے زیادہ تر (civil) سول انجینیر پیدا ہوتے ہیں جو مکانوں سڑکوں کی تعمیر سے تو کم و بیش واقف ہوتے ہیں۔ لیکن آب پاشی کی کچھ زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انجینیری کے طیلسانیوں کی ایک معقول تعداد کو کئی سال تک آب پاشی کی ماہرانہ تعلیم و تربیت دی جائے۔

پیشۂ زراعت کو سائنٹفک طریقوں پر انجام دینے کے لئے جدید زراعتی آلات کی شدید ضرورت ہے کیونکہ یہ آلات ملک میں تقریباً ناپید ہیں۔ ابتدا ایسے آلات سے کی جا سکتی ہے جن کو جانوروں کے ذریعہ سے استعمال کیا جا سکے اور پھر رفتہ رفتہ دخانی یا برقی آلات کے استعمال سے کسانوں کو واقف کرایا جا سکتا ہے ان آلات کی ساخت اور تیاری کے لئے فلزیات (METALLURGY) اور مشین ٹکنالوجی کے ماہر انجینیروں کی ضرورت ہوگی۔ انجینیروں کے طیلسانیوں کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس بنگلور میں یا ٹاٹا کمپنی جمشید پور کے تحقیقاتی معمل میں (لیباریٹری) ان مضامین کی تربیت اور مہارت حاصل کرنی چاہیے۔

زیر کاشت زمین کو زرخیز بنانے کے لئے مختلف قسم کے نباتی حیوانی یا کیمیائی کھادوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے لئے نباتیات، حیوانیات اور کیمیا کے ماہرین کی ضرورت ہے جنھوں نے ان مضامین میں ایم۔ ایس۔ سی کے بعد کئی سال تک زراعتی کھادوں کے نقطۂ نظر سے اعلیٰ تربیت اور مہارت حاصل کی ہو۔

ابھی ایک عرصۂ دراز تک جب تک کہ کوئلہ، برق، تیل یا پٹرول کی مدد سے چلنے والے زراعتی آلات کا استعمال ملک میں عام طور پر نہ ہونے لگے کسانوں کا سب سے بڑا اور واحد ذریعہ مویشی ہوں گے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں مویشیوں کی تعداد اتنی بڑھ رہی ہے جو کل دنیا کی تعداد کا ایک تہائی ہے لیکن یہ مویشی اس قدر کمزور اور فاقہ زدہ ہوتے ہیں کہ ان سے کما حقہٗ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اس نقص کو رفع کرنے کے لئے حیوانیات اور علاج حیوانیات کے ماہرین کی ضرورت ہے جنھوں نے خاص طور پر افزائش نسل مویشی کی تربیت حاصل کی ہو۔

(۲) لباس:—— بقائے حیات کے لوازمات میں غذا کے بعد دوسرا نمبر لباس کا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جس کے ایک بہت بڑے حصہ میں سال کے تقریباً نو (۹) مہینے کافی گرمی رہتی ہے۔ اونی یا ریشمی کپڑوں کے مقابلہ میں سوتی کپڑوں کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ روئی کی پیداوار کے لحاظ سے ہندوستان ممالک متحدہ امریکہ کے مقابلہ میں دوسرے نمبر پر ہے لیکن یہ روئی کچھ زیادہ عمدہ قسم کی نہیں ہوتی اور اچھے کپڑوں کے لئے اب بھی امریکہ اور مصر سے روئی کی کثیر مقدار درآمد کرنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ روئی کو ڈھنکنے صاف کرنے اور کاتنے اور پھر اس سوت سے کپڑا بنانے کی مشینیں کلیتاً باہر سے منگوانی پڑتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے اس زمانہ میں جنگ کی ضروریات اور ذرائع حمل و نقل کی دشواریوں کی وجہ سے عمدہ قسم کی روئی یا کپڑا

بنانے کی مشینوں وغیرہ کا سمندر پار سے منگوانا ممکن ہے اس وجہ سے ہم کو اپنے ہاں ان چیزوں کے پیدا کرنے یا تیار کرنے کی سبیل کرنی چاہیے۔ اس کام کے لئے طبیعیات اور زراعت کے ماہرین کی ضرورت ہے جو مختلف قسم کے سوت کی مضبوطی کی آزمائش کریں اور پھر اس کے لئے عمدہ روئی کی کاشت کے امکانات کو بروئے عمل لا سکیں۔ حکومت ہند نے روئی کے لئے ایک مرکزی کمیٹی مقرر کی ہے جس کے تحت ایک تحقیقاتی لیبوریٹری بمبئی میں قائم ہے۔ طبیعیات اور زراعت کے ایم۔ ایس۔ سی یہاں جا کر روئی کے متعلق تربیت اور مہارت حاصل کر سکتے ہیں۔

اسی کے ساتھ کپڑا بنانے کی مشینوں کے لئے میکانیکل انجینروں کی بھی ضرورت ہے۔ ہماری جامعات اور ٹکنیکل کالجوں سے میکانیکل انجینری کی ڈگری حاصل کرنے والوں کو انگلستان، امریکا، یا روس بھیجنا چاہیے تاکہ وہ وہاں کے بڑے کارخانوں میں مشین بنانے کی اعلیٰ تربیت اور مہارت حاصل کر سکیں۔ ہندستان میں ایسی تربیت اور مہارت حاصل کرنے کے امکانات بہت کم ہیں۔ پھر بھی بنگلور اور جمشید پور میں ایسی تربیت کا جو کچھ موقع میسر ہے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔

(۳) مکان: —— بقائے حیات کے لئے غذا اور لباس کے بعد تیسرا درجہ مکان کا ہے جہاں انسان دھوپ، ہوا، پانی اور درندوں وغیرہ سے محفوظ رہ کر اپنی زندگی بسر کر سکے ——

—— ابتدائی انسان پہاڑ کے دروں یا غاروں وغیرہ میں بسر کرتے تھے اور پھر انھوں نے اپنے لئے گھاس پھوس یا مٹی کے جھونپڑے بنانا سیکھا۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ مکانوں کی مضبوطی وسعت اور آرائش میں بے حد ترقی ہوئی۔ جن کی جدید ترین مثالیں امریکہ کی بیسیوں منزلوں والی عمارتیں ہیں۔ ہندوستان کے صرف معدودے چند بڑے شہروں میں پختہ اور جدید وضع کے مکانات پائے جاتے ہیں لیکن اضلاع اور دیہات کی کثیر ترین آبادی اب بھی انھیں گھاس پھوس اور مٹی کے جھونپڑوں میں بسر کرتی ہے اور کروڑہا انسان اب بھی اس طرح اپنی ساری عمر گذارتے ہیں کہ گرمی، سردی یا برسات کسی موسم میں بھی انھیں کوئی آرام نہیں ملتا۔ دیہات اور قریوں کا تو کیا ذکر اکثر چھوٹے بلکہ بڑے شہروں کی بھی کوئی خاص پلاننگ (PLANNING) نہیں ہوتی اور وہاں کے محلے، سڑکیں اور مکانات حفظان صحت یا آسائش کے کسی اصول پر پورے نہیں اترتے۔ نئی تنظیم میں اس کا خیال رکھنا پڑے گا کہ نہ صرف امرا اور متمول طبقے کے لئے بلکہ اوسط طبقے اور مزدوروں اور کسانوں کے لئے بھی مضبوط ہوادار اور آرام دہ مکان مہیا کئے جائیں۔

قصبوں اور شہروں کی سائنٹفک پلاننگ کی جائے، باشندوں کے لئے پانی، روشنی، سڑکوں اور بدرو کا انتظام کیا جائے۔ ہندستان کی تقریباً ۴۰ کروڑ آبادی کے لئے ان تمام لوازمات کی سربراہی کی خاطر مختلف قسم کے ماہرین کی ضرورت ہوگی۔ جن میں فن تعمیر (ARCHITECTURE) کے ماہرین ٹون پلاننگ (TOWN PLANNING) کے ماہرین، سول انجینیر اور ڈرینیج (DRAINAGE) انجینیر وغیرہ شامل ہیں۔ ہمارے انجنیری کے طلبا سائنس بی۔اے کی ڈگری کے بعد ان مختلف فنون میں تخصیص کر سکتے اور پوسٹ گراجویٹ (POST GRADUATE) ڈگریاں حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ مکانوں اور شہروں کی تیاری کے لئے جن لوازمات کی ضرورت ہے۔ جیسے چونا، اینٹ، پتھر، لکڑی، لوہا، اسمنٹ وغیرہ ان کے کثیر مقدار میں حاصل کرنے اور تیار کرنے کے لئے بھی متعدد ماہرین کی ضرورت ہوگی اور ایم۔ ایس۔ سی کامیاب طلباء ان چیزوں کی تخصیص کرسکتے ہیں۔

(۴) ادویہ: ——— ہندستان میں علاج معالجہ کے لئے اس وقت مختلف نظام رائج ہیں، جن میں طب یونانی، آیورویدک اور طب مغربی (ALEO PATHIC) کا رواج زیادہ ہے اور حال حال میں ہومیوپیتھی اور دوسرے قسم کے "نیچرل" علاج بھی رائج ہونے لگے ہیں۔ اس کے باوجود یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ملک میں تربیت یافتہ حکیموں یا ڈاکٹروں کی تعداد آبادی کے تناسب سے بہت کم ہے جو کچھ بھی حکیم اور ڈاکٹر نظر آتے ہیں وہ شہروں میں بستے ہیں، دیہات اور قصبوں میں معالجین کا وجود ہی نہیں اور ملک کی کثیر ترین آبادی غربت اور جہالت کے باعث فاقہ کشی غلاظت اور بیماریوں میں مبتلا رہتی ہے اور قبل از وقت موت کا شکار ہو جاتی ہے چنانچہ یہاں عمر کا اوسط اب بھی نسبتاً بہت کم ہے۔

اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ملک میں عام تربیت یافتہ مستند معالجین کی بہت زیادہ تعداد پیدا ہونی چاہئے اور اس کے علاوہ مختلف امراض کے خصوصی ماہرین بھی کافی تعداد میں موجود ہونے چاہئیں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کامیاب شدہ لوگوں کو کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے طبی اداروں میں اعلیٰ اور خصوصی تربیت حاصل کرنی چاہئے۔ جنگ کے شروع ہوتے ہی وہ دوائیں جو جرمن، اٹلی اور فرانس سے آتی تھیں یک لخت بند ہوگئیں اور دوسری دوائیں جو انگلستان اور امریکہ سے آتی تھیں اُن کی فراہمی میں بھی غیر معمولی دشواریاں پیش آنے لگیں۔ دواؤں کی نایابی کا تجربہ جنگ کے اس طویل دوران میں تقریباً ہر شخص کو ہوا ہوگا۔ اسی کے ساتھ اکثر لوگوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان ادویہ کے لئے جو خام اشیاء درکار ہیں ان میں سے بہت سی خود ملک میں پائی جاتی ہیں اور ان کے علاوہ بھی بہت سی جڑی بوٹی اور دوسری ادویہ ہیں جو چھوٹی بڑی مختلف بیماریوں کے لئے صدیوں سے کامیابی کے ساتھ استعمال کی جا رہی ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ منظم طور پر ملک میں ہر قسم کی دوائیں جدید اصول کے لحاظ سے تیار کی جائیں چنانچہ مختلف مقامات پر اس کام کی ابتدا بھی کردی گئی ہے۔ اس کام کے لئے ایسے ماہرین کی ضرورت ہے جو علم کیمیا، علم طب اور علم الادویہ تینوں کے ماہر ہوں۔ کیمیا کے ایم۔ ایس۔ سی اگر علم طب پڑھیں اور پھر علم الادویہ میں تخصیص کریں تو وہ اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ ایک طویل طیاری ہے جس کے لئے عمر کا ایک بڑا حصہ وقف کرنا پڑے گا لیکن کام کی اہمیت کے لحاظ سے اس کی بہت ضرورت ہے اور اس کا یقین دلایا جاسکتا ہے کہ ایسے ماہرین کی قدر و منزلت بھی اسی تناسب سے بہت زیادہ ہوگی۔

اس کے علاوہ ملک میں صحت عامہ (PUBLIC HEALTH) کے ماہرین کی بھی بہت سخت ضرورت ہے۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ حفظانِ صحت علاج معالجہ سے زیادہ اہم اور مقدم ہے اس کے لئے علم طب کی ڈگری حاصل کئے ہوئے لوگ پبلک ہلتھ (PUBLIC HEALTH) پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما حاصل کرسکتے ہیں۔

یہاں تک ہم نے اس تعلیم و تربیت سے بحث کی ہے جس سے بقائے حیات کے لوازمات کی فراہمی میں مدد ملے۔ اب ہم تمدنی لوازمات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان لوازمات کی فراہمی کے لئے کس قسم کی تعلیم و تربیت حاصل کئے ہوئے ماہرین کی

ضرورت ہے۔ اس موقع پر یہ نکتہ غور طلب ہے کہ جن لوازمات کو ہم تمدنی لوازمات کہتے ہیں وہ بقائے حیات کے ثانوی لوازمات بھی کہے جاسکتے ہیں کیونکہ ان سے زندگی کے باقی رکھنے اور اُس کو استوار کرنے میں مدد ملتی ہے۔

تمدنی لوازمات میں اہم ترین یہ ہیں۔ (۱) ایندھن (۲) لوہا اور دوسری دھاتیں (۳) کیمیائی اشیاء (۴) ذرائع حمل و نقل۔

ایندھن (FUEL) متمدن زندگی میں ایندھن کی ضرورت تین اغراض کے لئے ہوتی ہے (۱) حرارت حاصل کرنے کیلئے۔ (۲) روشنی حاصل کرنے کے لئے اور (۳) مشینوں کے چلانے کے لئے۔ ان تمام اغراض کے لئے لکڑی، کوئلہ، مختلف اقسام کے تیل پٹرول اور ان سے حاصل کی ہوئی اشیاء کام آتی ہیں یا بالآخر برق سے کام لیا جاتا ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے مذکورۂ بالا اشیاء یا قدرتی آبشاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس فہرست کے ملاحظہ سے ظاہر ہوگا کہ ایندھن کے متعلقہ مسئلوں کو حل کرنے کے لئے جنگلات، معدنیات، طبعیات، کیمیاء، الکٹریکل انجینیری، برقابی انجینیری، پٹرولوجی وغیرہ علوم و فنون کے ماہرین کی ضرورت ہے۔ ملک میں بہت سے قدرتی ذرائع موجود ہیں جن کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ یا مصنوعی ذرائع پیدا کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے ابھی جنگ کے دوران میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ دوسرے مقامات سے پٹرول اور مٹی کے تیل کی درآمد بند ہوجانے کی وجہ سے آمد و رفت اور روشنی کے انتظام میں کس قدر خلل واقع ہوا ہے۔ اگر ملک کے موجودہ ذرائع کو فروغ نہیں دیا گیا تو اندیشہ ہے کہ آئندہ بہت سخت دشواریاں پیش آئیں گی۔ ملک میں فن معدنیات، برقابی انجینیری اور الکٹریکل انجینیری کے ماہرین کی تعداد بہت کم ہے اور ان کی ایک معقول تعداد کو فوراً تیار کرنا نہایت ضروری ہے۔ ملک میں اس قسم کی تربیت اور مہارت حاصل کرنے کے کچھ امکانات موجود ہیں بعض مقامات پر برقابی اسکیمیں نہایت کامیابی کے ساتھ تیار کی گئی ہیں اور چالو ہیں۔ قابل اور صلاحیت رکھنے والے نوجوان انجینیروں کو ان مقامات پر بھیج کر تربیت دلائی جاسکتی ہے۔

لوہا اور دوسری دھاتیں ———— یہ مقولہ عام طور پر لوگوں کی زبان پر چڑھا ہوا ہے کہ موجودہ زمانہ لوہے اور فولاد کا زمانہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہماری تمدنی زندگی کا تصور بھی بغیر لوہے اور فولاد کے نہیں کیا جاسکتا۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان سے کل ایک لاکھ ٹن فولاد حاصل کیا گیا تھا حالانکہ اسی سال امریکہ میں تقریباً پانچ کروڑ ٹن، جرمنی میں ڈھائی کروڑ ٹن روس میں دو کروڑ ٹن اور انگلستان میں ڈیڑھ کروڑ ٹن فولاد حاصل ہوا تھا۔ ہندوستان میں فولاد کی اس کمی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہاں لوہے کی کچ دھات کی کمی ہے بلکہ شمالی اور وسطی ہندوستان میں لوہے کے ایسے معدن موجود ہیں جو دنیا کے سب سے بڑے معدنوں میں شمار کئے جاتے ہیں اور جن کے متعلق ماہرین نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ ان سے تقریباً تین ارب ٹن لوہا نکل سکتا ہے۔ ان معدنوں سے ابھی تک بالکل لوہا حاصل نہیں کیا گیا، بلکہ صرف بہار، بنگال اور میسور کے معدنوں ہی سے لوہا حاصل کر کے استعمال کیا جاتا ہے۔ معدنوں کے اس کم استعمال کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ملک میں بھاری صنعتیں موجود نہیں ہیں جن میں فولاد کی زیادہ مقدار میں کھپت ہو سکے۔ اس لئے اگر ملک میں جہاز سازی ریلوے انجن سازی بھاری مشینوں [illegible] کارخانے قائم ہوں تو ایک طرف ملکی [illegible]

اور فولاد کا استعمال زیادہ ہوگا اور دوسری طرف ملک اِن ضروری مشینوں کی تیاری کی حد تک خود مکتفی ہوجائے گا اور باہر سے اِن مشینوں کو درآمد کرنے کی احتیاج نہیں رہے گی۔

معدنیات میں سے لوہا حاصل کرنے، اِس سے فولاد بنانے اور پھر مذکورہ بالا مشینوں اور صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے ماہرین ظروفیات، معدنیات، بحری، انجینری، لوکوموٹیو انجینری، میکانیکل انجینری، الکٹریکل انجینری، آٹوموبیل انجینری وغیرہ مضامین کے متعدد ماہرین کی ضرورت ہوگی اور چونکہ اس قسم کی تربیت اور مہارت کے لئے ملک میں بہت کم مواقع ہیں اِس لئے اس تربیت کی خاطر سمندر پار جانا لازمی ہے۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ موجودہ زمانے میں کوئی ملک محض زراعتی ملک رہ کر ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش اپنی آزاد حیثیت برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے ہندستان کو اب صنعت وحرفت کی طرف پوری توجہ مبذول کرنی چاہئے اور اکثر فرزندان ملک کو اوپر بیان کئے ہوئے علوم وفنون کی کامل مہارت حاصل کرنی چاہئے تاکہ تمام ضروری آلات اور چھوٹی بڑی مشینیں خود ملک میں تیار کئے جاسکیں۔

کیمیاتی اشیاء ——— اکثر صنعتوں کا دارومدار نباتاتی یا غیر نباتاتی کیمیائی اشیا پر ہوتا ہے اور اس لئے تمام صنعتی ممالک کوئلہ اور لوہے کے ساتھ کیمیاتی اشیاء کو حاصل کرنے کی طرف بھی انتہائی توجہ کرتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو یاد ہوگا کہ گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں جب جرمنی سے رنگوں کا آنا بند ہوگیا تھا تو ملک میں کپڑے رنگنے کے لئے بھی اِن چیزوں کا ملنا تقریباً ناممکن ہوگیا تھا بہت سی کیمیاتی اشیاء جیسے رنگ، ادویہ موٹر سپرٹ اور ہلکے تیل وغیرہ کوئلہ سے حاصل ہوتے ہیں اور ہندستان میں کوئلہ کی کمی نہیں ہے اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندستان کے معدنوں میں تقریباً ساٹھ ارب ٹن کوئلہ موجود ہے لیکن سالانہ صرف ڈھائی کروڑ ٹن کوئلہ نکالا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئلہ سے جو ڈائنیر اور دوسرے ضمنی اشیاء حاصل ہوتے ہیں۔ ان سے کوئی مفید کام نہیں لیا جاتا بلکہ اکثر حصہ ضائع ہوجاتا ہے ملک میں ایسے ماہرین کا فقدان ہے جو کوئلہ کے ضمنی اشیاء سے رنگ ادویہ موٹر سپرٹ اور تیل حاصل کرسکیں۔ ہماری جامعات کے کیمیاء کے ایم۔ ایس۔ سی بنگلور، بمبئی یا کلکتہ جاکر صنعتی کیمیا کی اعلیٰ تربیت اور مہارت حاصل کرسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ کیمیائی انجینروں کی بھی شدید ضرورت ہے جو کیمیا کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کیمیائی انجینروں کے خاص مضمون میں کامل دسترس حاصل کریں۔

ذرائع حمل ونقل :——— نئی تنظیم میں ذرائع حمل ونقل کو فروغ دینے کی طرف بھی کچھ توجہ کرنی پڑے گی کیونکہ آبادی اور کاروبار کی زیادتی کے ساتھ ساتھ خود شہروں میں بھی وسعت ہوتی جارہی ہے اور اپنے مکان سے کاروبار کے مقامات ہوجانے کے لئے تیز رفتار سواریوں کی شدید ضرورت محسوس ہورہی ہے ۔ اس کے علاوہ ملک کے مختلف مقامات اور شہروں کے درمیان بھی آمدورفت میں بہت اضافہ ہوگیا ہے اور اکثر لوگوں کو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ کم سے کم وقت میں دور دراز فاصلے طے کریں ۔ ظاہر ہے کہ بیل اور گھوڑوں کی سواری سے موجودہ تمدنی ضروریات کے لئے حمل ونقل کا کام نہیں لیا جاسکتا اگرچہ ایسی سواریاں اب بھی بعض صورتوں میں کام دے سکتی ہیں۔ تیز رفتار سواریوں میں ملک کو بائیسکلوں، موٹر گاڑیوں ریل گاڑیوں،

سمندری جہازوں اور ہوائی جہازوں کی ایک کثیر تعداد میں ضرورت ہے۔ اس زمانے میں اور جنگ کے بعد بھی ان کا سمندر پار سے درآمد کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ تمدنی لوازمات میں سواریوں کا وجود بہت اہم ہے اس لئے ملک کو ان کی حد تک خود مکتفی ہونا چاہیئے۔ ان کی تیاری کے لئے ملک میں ماہر میکانیکل انجینروں، آٹوموبیل انجینروں، لوکوموٹیو انجینروں، بحری انجینروں، اور ایرونائیکل انجینروں کی ایک کثیر تعداد کو تیار کیا جانا چاہیئے۔ ذرائع حمل و نقل کے علاوہ ملک میں ذرائع رسل و رسائل یعنی ٹیلیفون، ٹیلیگراف اور ریڈیو کو بھی ترقی دینے کی بڑی سخت ضرورت ہے کیونکہ ملک کا بہت بڑا حصہ جدید تمدن کے ان لوازمات سے محروم ہے۔ ان کے لئے الکٹریکل انجینروں اور ریڈیو انجینروں کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں ملک میں ان تمام اقسام کی تربیت اور مہارت حاصل کرنے کے امکانات بہت کم ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے انگلستان یا امریکہ سے مشینری اور ماہرین اس وقت مل سکیں تو ملک میں مختلف مقامات پر اعلیٰ تربیتی اور تحقیقاتی ادارے قائم کئے جانے چاہئیں جہاں مجموعی طور پر بقائے حیات اور بقائے تمدن کے تمام لوازمات کے لئے ان مختلف ماہرین کو تیار کیا جاسکے جن کی فہرست گذشتہ صفحات میں دی گئی ہے اگر کسی علم یا فن کے متعلق یہ معلوم ہو کہ باہر سے مشینری یا ماہرین کا فراہم کرنا ممکن نہیں ہے تو ملک کے بہترین قابل اور اعلیٰ تعلیم و تربیت یافتہ لوگوں کو سمندر پار بھیج کر ماہرانہ تربیت حاصل کرنے کا موقع دینا چاہیئے۔ ان مختلف لوازمات کے لئے ماہرین کو فراہم کرنے کی خاطر یہ مناسب ہوگا کہ اسی وقت ایک پانچ سالہ پلان (PLAN) بنایا جائے جس میں تمام ضروریات کو مشخص کرنے کے بعد ماہرین کی تیاری کے مسئلہ کو حل کیا جائے۔ اعلیٰ تعلیم کی نئی تنظیم میں ملک کی سب سے مقدم اور سب سے زیادہ اہم ضرورت میری رائے میں یہی ہے۔

کامیابی کا وہ ستون جس نے ہندستان کے
چالیس کروڑ انسانوں کے دل میں گھر کر لیا
زیر تکمیل :-
مہاجن
حال اور مستقبل کے ہندستان کی ایک درد انگیز داستان
؟ ؟ ؟
اداکار :
پروڈیوسر و ڈائرکٹر :
کاردار
پروڈیوسر - ڈائرکٹر
کاردار
جنہوں نے آپ کو
شاردا
نمستے
قانون
دیا
اب وہ آپ کی خدمت میں
ظرافت و مزاح کا خزانہ
سنجوگ
اس کے بعد
گیت
ڈائرکٹر:- سنی
اور پھر
بہار
ڈائرکٹر:- صادق
پیش کریں گے
اور ان سبھوں کے بعد
دس لاکھ روپئے صرفے سے تیار کیا ہوا شاہکار
شاہجہاں
ڈائرکٹر: عبدالرشید کاردار
کہانی و مکالمے:- کمال امروہی
KARDAR PRODUCTION:- PAREL GOVT. GATE RD. BOMBAY.

مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے تین دور

از : ———— عزیز حسن بقائی

میں مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے تین دور مانتا ہوں اور اس نظریہ کے تحت ان پر بحث کرنی چاہتا ہوں۔ تاکہ نئی زندگی کے پڑھنے والوں کو معلوم ہوسکے کہ مسلمان کس طرح سیاسی اسٹیج پر آئے اور جس دلدل میں سامراج نے ان کو پھنسا دیا ہے۔ اُس سے نکلنے کی صورت کیا ہے؟ (۱) غدر ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۲ء تک (۲) ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۶ء تک (۳) ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک۔

(۱) غدر ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۲ء تک

مغل حکومت کا چراغ ٹمٹمانے لگا، عیاشی، فرائض سے لاپرواہی۔ سازش، تفرقہ پردازی سے جو ابتری کسی طاقتور حکومت میں پیدا ہوتی ہے اور اس سے جو تباہی اقوام و ملل پر آیا کرتی ہے۔ وہ مسلمانوں پر آئی۔ اور کیوں نہ آتی کہ قدرت کا فیصلہ اٹل تھا۔ سنّت الٰہیہ یہی تھی۔ جب تک مغل حکمران ان پر فرائض کی ادائیگی کے ساتھ شمشیر بدست رہے۔ حکومت ان کی لونڈی رہی، جب اُنھوں نے شمشیر کے بجائے چنگ و رباب کو ہاتھ میں لیا، وہی ہوا۔ جو ہونا چاہئے تھا۔ اور جو سب کچھ ہوا۔ لیکن ناانصافی نہ تھی۔

بوڑھا بہادر شاہ جو برطانوی سامراج کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ جب بے کسی کے عالم میں اپنے باپ دادا کے قلعہ میں اپنی قسمت کا آخری فیصلہ سن چکا، تو بدیسی حکومت کے مطلق العنان کارندوں نے وہی کیا جو مفتوح اقوام مشرق سے مغربی تہذیب و تمدن کے پتلے ازراہ حمیت انسانی کیا کرتے ہیں۔

مسلمانوں کی جانب سے یہ آزادی کی پہلی کوشش تھی جو ناکام ہوئی۔ اور اس کا انجام ایک مکمل تباہی، وحشت و بربریت کا کبھی نہ بھولنے والا دور تھا۔ جس سے مسلمان زیادہ سے زیادہ صبر و استقلال سے گذرے۔

اس کے بعد مختلف صورتوں میں مسلمانوں نے برطانوی سامراج سے عدم تعاون کر کے اپنی دلی نفرت کا اظہار کیا۔ جس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ علمائے حق نے انگریزی تعلیم و تہذیب سے مکمل عدم تعاون کیا۔ کیونکہ ان کو اس میں مسلمانوں کی معاشرت اور ایمان کی خیر نظر نہیں آ رہی تھی۔

غیر ملکی حکومت سے یہ عدم تعاون ہندوستان میں پہلی مرتبہ کیا گیا۔ جس کے اخلاص و شدت سے انکار نہیں، لیکن طبیب کامل جس طرح گھبراہٹ میں مریض کے لئے غلط نسخہ تجویز کرتا ہے یہی صورت علمائے حق کے اس نسخہ عدم تعاون کی ہوئی۔

حالات مایوس کن ہو رہے تھے، ہمسایہ قوم جو ہر غیر ملکی تہذیب، زبان، معاشرت کو قبول کرنے کی عادی تھی، مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں پیچھے ڈھکیل رہی تھی کہ سیاسی اسٹیج پر سرسید کا ظہور ہوا۔ انھوں نے مسلمانوں کے لئے انگریزی تعلیم کو ضروری بتایا۔ نئے دَور پرانے خیالات میں ٹکر ہوئی دونوں کے اخلاص میں شبہ کی گنجائش نہ تھی، نیا نسخہ آزمایا گیا، پرانے طبیب تھک کر بیٹھ گئے۔ علی گڑھ اسکول سے کالج بنا۔ یونیورسٹی کے لئے جوش و خروش سے کام شروع ہوا۔ نوجوان میدان میں آ گئے۔ ۱۹۰۶ء میں حکومت کے ایما پر مسلمانوں کا ڈیپوٹیشن شملہ گیا۔ جداگانہ انتخاب کا حق دے کر مسلمانوں کو سیاسی رشوت دی گئی۔ غیر ملکی لوٹ نے ہندستانیوں کی آنکھیں کھول دیں۔ انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی۔ ہندو بیدار ہو چکا تھا مسلمان خواب غفلت میں تھا تاہم مشترکہ مطالبات کے لئے مشترکہ پلیٹ فارم سے آواز بلند ہوئی۔ مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے روکنے کے واسطے تقسیم بنگال کا چارٹر عطا ہوا۔ بنگالیوں نے بم مہادیو سے خیر مقدم کیا۔ اقتدار اور حب وطن کی کشمکش شروع ہوئی۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ کو ناممکن بتایا گیا۔ بہادر بنگالی پتلی دال سے بھات کھانے والے بنگالی نے سر ہتھیلی پر رکھ کر مقابلہ کیا۔ سنگینیں، بندوقیں، لاٹھیاں، جیل خانے، ہتھکڑیاں، بیڑیاں، پھانسی سب ہی کے دَور آئے۔ اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت اس ہڑبونگ سے علیحدہ تھی، لیکن بنگال کا مسلمان اپنے ہمسایہ ہندو بھائی کے دوش بدوش تھا۔

نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا، حکومت کو شکست ہوئی۔ بھوکا بنگالی فاتح ہوا۔ مسلمانوں سے جو وعدے کئے گئے تھے وہ سب نظر انداز کئے گئے۔ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگالہ کی تنسیخ دہلی دربار میں کی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ دار السلطنت کلکتہ کی بجائے دہلی تجویز ہوا۔ جو۔ محکوموں کی فتح کی غیر فانی یادگار ہے۔

مسلمانوں میں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان سیاسی میدان میں آ چکے تھے۔ اس شرمناک وعدہ خلافی اس ذلت انگیز شکست اس نفرت آمیز بزدلی پر ان میں ایک جوش برطانوی سامراج کے خلاف پیدا ہوا۔ کعبہ ٹوڈیت، مرکز وفاداری (علی گڈھ) سے حکومت کو ملامت کی گئی۔ جو غدر کے ڈرے، سہمے مسلمانوں کے لئے نئی بات تھی۔ لیکن ابھی وہ لوگ زندہ تھے۔ جنھوں نے غدر کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اس لئے انھوں نے پرجوش مسلمانوں کی باگیں کھینچیں، مگر اسپ تازہ مجروح ہونے کے باوجود قابو میں نہ آیا۔

یہ تھا مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا پہلا دَور جو ۱۹۱۲ء میں ختم ہوا۔

(۲) ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۰ء تک

یہ دَور اگرچہ طویل ہے، لیکن ہنگامہ پرور ہے۔ جس کی ابتداء ۱۹۱۲ء میں نادر روس کے ایران میں آنے کے طرابلس میں انتہائی

وحشیانہ، سفاکانہ، مظالم سے ہوئی۔ حکومت برطانیہ "تک تک دیدم دم نہ کشیدم" کا مصداق بنی رہی تھی، تب ہونے کیا؟ جو جیالے وطرابلس میں فرزندان توحید کی تڑپتی ہوئی خونچکاں لاشوں کو دیکھا، ظالم کو ظلم سے نہ روکا، مظلوم کی بے بسی میں اعانت نہ کی۔ مسلمانان ہند میں نئی زندگی، زمیندار، ہمدرد، الہلال کے انقلابی مقالات سے پیدا ہو چکی تھی، نوجوان رہنما میدان میں آ چکے تھے، بوڑھے میدان قیادت سے دھکیلے جا چکے تھے، عالمگیر اخوت اسلامی کا جذبہ پیدا کیا جا چکا تھا، حکومت اور اُس کے ایجنٹوں نے بہتیرا روکا۔ مگر جولانیاں تھا سیلاب بند باندھنے سے رکا۔ ایک عام ہیجان پیدا ہوا۔ شریف ہندو سیاست دانوں نے ان مصائب و آلام میں مسلمانوں سے اظہار ہمدردی کیا۔ ہندو مسلمانوں کے تعلقات خوشگوار ہوئے۔ ہندو مسلمان کے پرانے ماری پھر میدان میں لائے گئے۔ آ ... تے تھیلے میں سے رنگ برنگ کی گولیاں نکالی گئیں۔ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے کلیہ کے ماتحت ذرہ، شاہ آباد (بہار) میں قربانی گاؤ کے بہانہ ہندو مسلم فساد برپا کرا دیا گیا۔ نوجوان ہندو مسلمان رہنماؤں نے محبت کے پانی سے فرقہ پرستی کی اس آگ کو بجھایا، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، علی برادران، گاندھی، اُمت کے ناخدا بنے، یوروپین دسیسہ کاروں نے بلقان میں آگ بھڑکائی، بغاوت کے شعلے بھڑکے، مسلمانان ہند میں بے چینی کی آگ پھیل پڑی۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے قریب ہوئے، ترکی حکومت کے خلاف یوروپین حکومتیں متحد ہوئیں۔ قیادت عظمیٰ کا تاج برطانیہ کے سر پر تھا

عالمگیر جنگ شروع ہوئی، ترکی نے برطانیہ کے طرز عمل سے مایوس ہو کر جنگ میں جرمن کے ساتھ شرکت کی۔ مہاتما گاندھی جنوبی افریقہ سے ہندوستان آئے۔ ہنگامہ دار و گیر گرم ہوا، مسلمانوں پر خاص توجہ فرمائی گئی۔ علی برادران، حسرت موہانی، ابوالکلام آزاد جیسے بلند پایہ لیڈر، جو ہر صوبہ میں نظر بند کیے گئے۔ محمود حسن، عبید اللہ سندھی، حسین احمد، سیف الرحمٰن جیسے علماء، ناحق برباد ہوئے۔ ہندوستان سے وعدہ آزادی کے نام پر مدد مانگی گئی۔ مہاتما گاندھی، آنجہانی تلک، داس، نہرو، اجمل خاں وغیرہ اکابرین نے کافی سے زیادہ امداد دی۔ انعام میں رولٹ ایکٹ ملا جس کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے۔ پنجاب میں حکومت کی سخت گیری سے معاملہ حد سے گذرا۔ عوام جوش سے بے قابو ہوئے۔ مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں امرتسر میں نہتے مجمع پر ڈائر کے حکم سے گولی چلائی گئی، فائرنگ اُس وقت تک جاری رہی جب تک آخری گولی ختم نہ ہو گئی۔ پنجاب کے اکثر اضلاع میں مارشل لا جاری ہوا۔ پنجاب کے علاوہ دوسرے صوبوں میں بھی انتہائی سفاکانہ مظالم ہوئے۔ دہلی میں نہتے مجمع پر فائرنگ ہوا، ہندو مسلمانوں کا خون متحدہ مقصد کے لئے ایک ہی زمین پر ایک ہی وقت میں گرا۔ پنجاب میں برطانوی سامراج نے جو وحشیانہ مظالم کئے ان کی نظیر نہیں ملتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب کی پبلک اسپرٹ ختم ہو گئی۔ مہاتما گاندھی اور اُن کے رفقاء گرفتار کر لئے گئے۔ یوپی کا ایک مرد مجاہد دو آنجہانی موتی لال نہرو اپنے عشرت کدہ (آنند بھون) سے، دوسرا بنگال سے، (آنجہانی داس) تیسرا دہلی سے (مرحوم مسیح الملک) چوتھے ڈاکٹر انصاری اُٹھے، خلافت کی بحالی اور مظالم پنجاب کی تحقیقات کے لئے زبردست ایجی ٹیشن شروع کیا۔ پنجاب کے خوف زدہ ہندو مسلمانوں میں ہمت پیدا کی، ان کے زخمیوں کی مرہم پٹی کی۔ گرفتاران بلا کی پیروی کی، نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب پبلک لائف میں دوبارہ تازگی شامل ہوا۔ ہندو مسلم اتحاد کے وہ پاکیزہ نظارے برطانوی سامراج کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے۔ نظر بند اور قید کر دیا گیا۔ مسلمانوں نے آزادی کی منزل پر تیزی سے دوڑنا شروع کیا۔ حکومت نے ہندو کو مسلمان سے علیحدہ کرنے کے لئے "افغانی ہوا" پیدا کیا۔ اتفاق سے

اس زمانہ میں افغانستان میں انقلاب برپا ہوا، بادشاہ افغانستان حبیب اللہ خاں قتل کر دئے گئے۔ ان کے بیٹے امان اللہ خان نے حوصلہ مندی کا ثبوت دیتے ہوئے برطانوی سامراج سے ٹکر لی۔ سرحد پر حملہ کر دیا۔ ہندستان کی سرحدوں میں افغانی فوج ایک طرف سے گھس آئی، دوسری جانب برطانوی فوج نے افغانی حدود کو عبور کیا۔ فرنگی حکومت کے لئے یہ نازک ترین وقت تھا، اندرونی بے چینی بیرونی حملہ میں معاون تھی عدم تعاون کی تحریک زوروں پر تھی ملازمتیں ترک ہو رہی تھیں، خطابات واپس ہو رہے تھے، ہجرت کی تحریک شروع ہوئی۔ جوش میں بھرے ہوئے عوام نے چوری چورا کے مقام پر انتہائی ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے تشدد کے مقابلہ میں تشدد سے کام لیا تھانہ پر حملہ کیا۔ آگ لگا دی، متعدد پولیس افسران زندہ جلا دئے گئے۔ مہاتما گاندھی اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے تحریک واپس لے لی۔

اس پوری تحریک میں، اس ہنگامہ پسندی کے دور میں مسلمانوں نے من حیثیت القوم انتہائی جوش، خودیت، ایثار قربانی کا ثبوت دیا۔ لڑائی کے ہر مورچہ پر وہ آگے تھے، ان کے انتہائی جوش سے حکومت خائف تھی، حتیٰ کہ پشاور کے قصہ خوانی بازار میں پہلا فساد میں خاک و خون میں تڑپنے والے صرف مسلمان تھے، اچانک سوامی شردھانند آنجہانی امرتسر میں گرفتار ہوئے، چار سال کی قید ہوئی، لیکن ایک ہی مہینے میں حیرت انگیز طریقہ سے رہا ہو گئے۔ رہا ہوتے ہی شدھی سنگھٹن کا ناقوس بجایا۔ مذہب سے ناواقف نومسلم اقوام کو مرتد کرنے کا کام انتہائی تیزی سے شروع ہوا مسلمان اس اچانک حملہ سے ششدر رہ گئے۔ فرقہ پرستوں کی بن آئی، علی برادران، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، آصف علی، ڈاکٹر محمود، مولانا آزاد جیسے درجہ اول کے رہنما سامراج کی اس چال کو سمجھ گئے۔ مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لعل نہرو، مسٹر داس جیسے رہنما سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ہندو قوم کا بڑا حصہ پنڈت مدن موہن مالوی، سوامی شردھانند کا اشردھالو ہو گیا۔ اور پچیس سال کی محنت خاک میں مل گئی۔ جو ہندو مسلمان آپس میں بھائی بھائی تھے۔ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ انتہائی سفاکانہ اور وحشیانہ فسادات ہوئے۔ اور انتہائی ناعاقبت اندیشی سے ایک نے دوسرے کا سر پھوڑا۔ سامراج کی بن آئی۔ لیکن رہنمایان ملت نے ہمت نہ ہاری۔ مسلمان رہنماؤں نے پورے جوش سے مسلمانوں کی باگیں اتحاد کی راہ پر موڑیں۔ لیکن فرقہ پرست پوری طرح ملک لا ریب کو تباہ کر چکے تھے، سامراج کے تنخواہ دار ایجنٹوں نے انتہائی مستعدی کا ثبوت دیتے ہوئے ہندو مسلمانوں کو نزدیک نہ ہونے دیا۔ لیکن مسلمان رہنما برابر کام میں مصروف رہے، ٹوٹے ہوئے دل جوڑے۔

بار دولی میں نمک سازی پر ستیہ گرہ شروع ہوا مسلمان کانگریس کے ساتھ تھے۔ تناسب آبادی سے زیادہ لیکن پہلے سے کم گرفتاریاں ہوئیں۔ سامراج کے جڑوں میں تیزاب ڈال دیا گیا۔ مگر حکومت قوم پروروں کے اس حملہ کو برداشت کر گئی۔ لندن کی گول میز کانفرنس میں مہاتما گاندھی اور دوسرے مولانا محمد علی قوم پرور رہنما طلب کئے گئے۔ لیکن سامراج کی ایجنٹ دولت خواہ اور سہا سبھائیوں کی حماقت سے کوئی فیصلہ نمائندگان قوم و وطن نہ کر سکے۔ آنجہانی رامزی میکڈانلڈ وزیر اعظم نے ایسا فیصلہ کیا کہ مسلمان مطمئن نہ ہوسکے۔ ہندو ناخوش رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصلی طاقت سامراج کے ہاتھ میں آئی۔ کانگریس نے اصلاحات کا بائیکاٹ کیا لیکن انتخابات میں حصہ لیا۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے رہنما، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، بشیر الحق۔ مولانا باری۔

استقلال زرا چکے تھے، کچھ بد دل ہو کر گھر بیٹھ رہے، کچھ آزاد، آصف، محمود ثابت قدم رہے لیکن مسلمانوں کا بڑا حصہ پھر بھی کانگریس کو پسند کرتا تھا، صوبوں کے انتخابات میں مسلم لیگ نے مسٹر جناح کی رہنمائی میں حصہ لیا لیکن ہر جگہ ناکامی ہوئی۔ جمعیۃ علماء نے آزادی کے نام پر فریب کھا کر مسلم لیگ کی ہمت افزائی کی، کانگریس کے ایک طبقہ نے آزمائش کے لئے وزارتیں قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ کانگریس وزارتوں کی رہنمائی کے لئے حضرت علامہ آزاد کی صدارت میں ایک بورڈ قائم ہوا جس کی گرفت جتنی سخت ہونی چاہئے نہ تھی۔

اس دور کے اگر اعداد و شمار جمع کئے جائیں۔ تو ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان پھانسی پا کر، گولی کھا کر شہید ہوئے تو ایک کروڑ سے زیادہ نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ کئی لاکھ مسلمان خواتین بیوہ اور بچے یتیم ہوئے۔ خاندان برباد ہو گئے۔ کئی لاکھ ملازمتیں ترک کیں، ٹھیکہ داریوں میں، زمینداریوں میں کروڑ ہا روپے کے نقصانات ہوئے غرضکہ مسلمانوں کا یہ سیاسی دور ان کی آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ شاندار قربانیوں کا دور ہے جن پر ان کو فخر ہے۔

یہ تھا مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا دوسرا شاندار اور قابل عزت دور۔

---

(۳) ۳۷ء سے ۴۴ء تک

کانگریس منسٹریاں قائم ہوئیں، کانگریس ہائی کمانڈ کی حماقت سے صوبوں کی حکومتوں میں مسخ شدہ ذہنیت کے دم گھٹے مہا سبھائی شامل ہوئے۔ جن میں سے اکثر کو اختیارات کی بدہضمی ہوئی۔ لگے رام راج کے خواب دیکھنے، ملازمتوں میں فرقہ داریت کا ثبوت دیا گیا۔ انصاف میں فرقہ پرستی کا مظاہرہ ہوا۔ ٹھیکہ داریوں میں مسلمانوں کو نظر انداز کیا گیا۔ وزارتوں میں چند لیگیوں (نواب اسمٰعیل، خلیق الزماں) کو فراموش کیا گیا۔ ہندی کو جبراً رائج کرنے کی کوشش ہوئی۔ فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں کو نقصان پہونچا۔

اگرچہ یہ حرکتیں انفرادی تھیں، کانگریس کی پالیسی سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا، کانگریس ہائی کمانڈ نے ان شکایتوں کے ازالہ کے لئے انتہائی مستعدی کا ثبوت دیا لیکن مہا سبھائی گروپ کانگریس میں گھس کر پانچویں کالم کا کام کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسری طرف ان حادثات کو جن میں سے اکثر کو بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا تھا مسلم لیگ نے کانگریس سے مسلمانوں کو متنفر کرنے کے واسطے ایسا بے پرد دست پروپگنڈا کیا کہ مسلمانان ہند جو پہلے ہی شدھی سنگٹھن کی تحریک سے سہمے کانگریس کی بے اعتنائی سے کانگریس میں طاقتور مسلمان رہنماؤں کی عدم موجودگی سے متاثر تھے۔ لیگ کے پروپگنڈا کا شکار ہوئے۔ اور اس طرح نادانستگی میں کانگریس کے ایک پست فطرت فرقہ پرست طبقہ نے کانگریس کی پچاس سالہ جد و جہد کانگریس کا جھنڈا ہاتھ میں لے کر کانگریس کے اصول کے خلاف تباہ کر دیا۔ اور مسلم لیگ جو ایک حقیر، ناقابل توجہ، سرمایہ داروں، بساط سیاست کے پٹے ہوئے مہروں، کانگریس منسٹریوں میں وزارت سے مایوس زمینداروں کی ایک بہت معمولی جماعت تھی، ایک طاقتور اور ناقابل فراموش جماعت بن گئی۔ غلطی سے مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ لیگ کے شیران قالین حقیقی معنوں میں دس کروڑ مسلمانوں کے بہی خواہ ہیں۔

مسلم لیگ مسلمانوں کے لئے کچھ نہ کرنے، مسلمانوں کے مفاد کے لئے کوئی پروگرام نہ ہونے پر بھی سیاسیات ملکی میں کانگریس

کی پے در پے غلطیوں سے اس وقت ایسے مقام پر ہے، جہاں اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مسلمانوں کے مطالبات کے سلسلہ میں اگر کانگریسی زعما قوم پرست مسلمانوں کی تنظیم میں اتنی دلچسپی بھی لیتے، جتنی اچھوتوں کے لئے لی گئی۔ کانگریسی مسلمانوں کو مسلمانوں میں کانگریس ذلیل نہ کرتی اور مسلم لیگ سے سمجھوتا کرنے میں انتہائی نادانی کا ثبوت دے کر وقت ضائع کرنے کی بجائے۔ قوم پرور مسلمانوں کو وہ سب کچھ دیدیتی، جو لیگ کا مطالبہ تھا، تو آج کانگریس اور مسلمانوں میں جدا نہ ہوتا۔

کانگریس میں طاقتور مسلمانوں کی کمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جماعتی حیثیت سے تمام وطن پرست اسلامی جماعتیں، احرار، جمیعۃ علمائے ہند، آزاد کانفرنس مومن انصار، کرشک پارٹی وغیرہ سب نہ صرف کانگریس سے مایوس ہو گئیں بلکہ مسلمان قوم میں ذلیل ہوئے۔ اور بڑی حد تک اپنے گھروں میں بیٹھ کر بہتر حالات کا انتظار کرنے لگے۔ اس طرح کانگریس نے لیگ کی حیات ثانیہ میں نادانستگی یا حماقت سے اعانت کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندو مسلم سمجھوتہ کی بجائے اب پاکستان تسلیم کرنے کا مطالبہ لیگ نے اس لئے پیش کیا ہے کہ کسی نوعیت سے بھی سمجھوتہ کا امکان نہ رہے۔ اور اب صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کو "ہندو ہوّا" سے لیگ ڈرا رہی ہے۔ شیطان ایک ہے منہ دو ہیں۔ حالانکہ نہ ہندو ہوّا ہے۔ نہ مسلمان ہوّا ہوا تو صرف ایک ہے جو غیر ملکی حکومت کا ہے جس سے ہندو مسلمانوں کو ڈرنا چاہئے۔

پاکستان مسلمانوں کے لئے من حیث القوم انتہائی مضر، ناممکن العمل، نقصان رساں ہے۔ جس میں ہر کروڑ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کا کوئی حل نہیں ہے۔ پاکستان کے پانچ صوبوں میں سے صرف دو صوبے (سرحد و سندھ) ایسے ہیں، جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ لیکن یہی دونوں صوبے ایسے ہیں جو بغیر مرکزی حکومت کی امداد کے ایک دن زندہ نہیں رہ سکتے۔ صنعت و حرفت کانوں کے اعتبار سے یہ دونوں صوبے قلاش ہیں۔ جو مرکزی حکومت کے رحم پر زندہ ہیں۔ اب رہ گئے تین صوبے (پنجاب، بنگال، آسام)، ان میں مسلمانوں کی بہت ہی حقیر اکثریت ہے۔ دو صوبوں میں (آسام و بنگال) قوت کا توازن انگریز سرمایہ داروں کی اقلیت کے ہاتھ میں ہے۔ تیسرے صوبہ پنجاب میں توازن سکھوں کی اقلیت کے ہاتھ میں ہے، اگر مہا سبھائی ہندو اور انگریز سرمایہ دار ایک دن بھی ان پاکستانی حکومتوں کی سرپرستی نہ فرمائیں۔ تو ایک منٹ بھی لیگی حکومتیں قائم نہیں رہ سکتیں۔

ان تینوں پاکستانی صوبوں میں مسلمانوں کی بھلائی کا کوئی کام اب تک نہیں ہوا۔ ہوشیار ہندوؤں نے کانگریسی حکومتوں کے زمانہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ غریب مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہونچا، مزدور اور کسان کے لئے اتنا کام بھی نہ ہوا، جتنا "دشمن اسلام" کانگریسی منسٹریوں نے کیا تھا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ چند مسلمان ٹھیکہ داروں کی تجوریوں میں روپے رکھنے کی جگہ نہ رہی، جن میں سے اکثر کی سازش وزراء سے بتائی جاتی ہے۔ چند چالاک مسلمان وزیر ہوئے۔ جن کے اعمال نامے جب بھی دنیا کے سامنے آئیں گے یہ مجاہدین اسلام "کافر" کانگریسیوں سے زیادہ اپنی سیاہ اعمالیوں سے دشمن اسلام ثابت ہوں گے۔

۱۹۴۲ء میں کانگریس نے جنگ میں تعاون کی پیش کش کی، محوریوں کے خلاف محاذ قائم کرنا چاہا۔ مقاصد جنگ دریافت کئے گئے۔ جواب میں خاموشی اختیار کی۔ بمبئی میں کانگریس نے ایک اجتماعی تحریک کی تجویز پاس کی۔ لیکن سول نافرمانی شروع کرنے کے اختیارات مہاتما گاندھی کو دیئے گئے۔ جنھوں نے سول نافرمانی شروع کرنے سے پہلے وائسرائے سے ملنے کی درخواست کی۔ یہ درخواست وہ

کچھ ہی رہے تھے کہ حکومت نے نہایت پھرتی سے ان گوران کے رفقاء کو گرفتار کرلیا۔ اور سختی سے کانگریس نظام کو مفلوج کر دیا۔ عوام نے پر جوش مظاہرے کئے۔ حکومت نے بلا ضرورت بھی تشدد کا استعمال کیا۔ جوش میں بھرے ہوئے عوام نے تشدد کا جواب تشدد سے دیا۔ ایک انتہائی سختی کا دور شروع ہوا۔ بہ مشکل ایک سال کی جد وجہد کے بعد حالات پر قابو پانے میں حکومت کامیاب ہوئی۔

مسلمان اس تحریک میں بھی کانگریس کے ساتھ رہے لیکن بہت کم۔ آبادی کے تناسب سے ان کی شاندار تاریخی روایات سے کوئی نسبت نہیں۔

یہ ہے مسلمانوں کا تیسرا سیاسی دور جس پر فخر نہیں کیا جاسکتا۔

اب کیا کرنا چاہئے؟

حالات اگرچہ مایوس کن ہیں، کانگریس ہائی کمانڈ نظر بند ہے۔ اور بظاہر کوئی امکان اس کا نظر نہیں آتا کہ حکومت معقولیت کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے لئے آمادہ ہو۔ مسلم لیگ اور مہا سبھا کے نقارے بج رہے ہیں۔ ملک میں کوئی تحریک نہیں ہے۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ مسلم لیگ کے ساتھ ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے لئے بظاہر حالات ناسازگار ہیں۔

لیکن میری رائے میں حالات اتنے مایوس کن نہیں ہیں، جتنے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں ایک ایک مسلمان اخبار روزانہ یا ہفتہ وار جاری کرنا چاہئے۔ جو مسلم لیگ اور مہا سبھا کو بے نقاب کرے۔ قوم پرور مسلمانوں کا ایک وفد ہندوستان کا دَورہ کرے۔ جو ان غلط فہمیوں کو دور کرے جو لیگ نے پھیلا رکھی ہیں۔ یہ ایک مستقل کام ہے۔ جس کے نتائج فوراً ظاہر نہ ہوں گے، لیکن رائے عامہ ضرور تیار ہوگی جو کانگریس لیگ سمجھوتے کے لئے میدان تیار کرے گی جس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

کانگریس ہائی کمانڈ کی رہائی کے لئے آرگنائزیشن ہندوستان کے ہر حصہ سے شروع ہونا چاہئے۔ تاکہ حکومت مجبور ہو کر ان کو رہا کرے۔ اور جب کانگریس میدان میں آئے۔ تو اس کو فضا سازگار ملے۔

سر دست میرے خیال میں یہی دو طریقے ایسے ہیں۔ جن پر محبانِ وطن کو کام کرنا چاہئے۔ نتائج سے بے پروا ہو کر۔ تاکہ ہندوستان کا تعطل دور ہو۔ مسلمان لیگ کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں سے محفوظ ہوں۔ اور کانگریسی رہنما جب جیل سے باہر آئیں تو ان کو ہندو مسلم اتحاد کے لئے زیادہ کام نہ کرنا پڑے۔
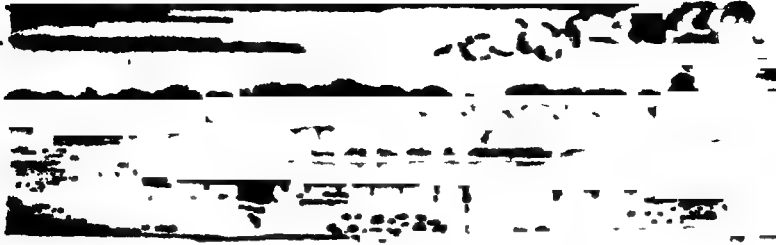
دی ٹاٹا آئیل ملز ٹاٹا پورم کوچین اسٹیٹ

ہندوستان کے صنعتی منصوبوں میں

نصف صدی قبل ٹاٹا کے ایوان سے ہندوستان کے صنعتی منصوبے شروع ہوئے تھے اور آج اُن کے ساتھ ٹاٹا آئیل ملز اپنا فرض ادا کر رہی ہے۔ وہ ان بے شمار چیزوں کی تیاری میں جو ہندوستان کے ہر گھر میں روزمرہ کے استعمال کے لئے نہایت ضروری ہیں، بہت مصروف ہے۔ ۱۹۱۸ء میں کوچین اسٹیٹ میں ایک فیکٹری کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ لیکن اس کی اعلیٰ درجہ کی چیزوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر بمبئی میں بھی ایک نئے کارخانہ کا بنانا ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ آج دونو فیکٹریاں ملک کی بڑھتی رہنے والی مانگوں کو پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ٹاٹا آئیل ملز کا قومی منصوبوں کی آئندہ اسکیموں میں حصہ لینے کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔
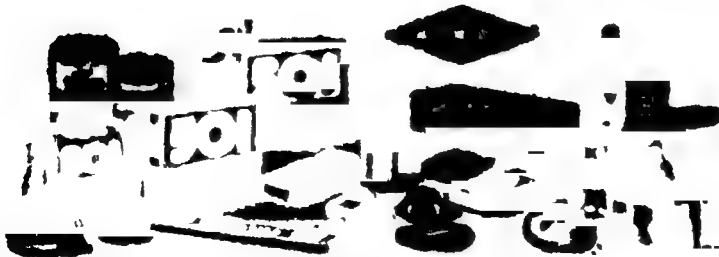
THE TATA OIL MILLS COMPANY LTD. TATAPURAM & BOMBAY.

ہندستانیوں کیلئے ہندستان کی سرزمین تمام کائنات سے زیادہ عزیز ہے
اس مقدس زمین کی خاطر سادہ اور نیک لوگوں کی قربانی کی
ولولہ انگیز تصویر
افسانہ: پنڈت شیو کمار
ہدایات: پنڈت آنند کمار
آنند برادرس کی پیشکش
وہ فلمی ادارہ جس نے ہمیشہ آپ کو ترقی پسند فلمیں دی ہیں
اداکاران
درگا کھوٹے، خورشید، ڈیوڈ، نوین، نذیر، وشواس، خلیل وغیرہ
عنقریب اپنے شہر کے بہترین سینما میں ملاحظہ فرمائیے
تقسیم کنندگان شمالی ہند: سکسینہ اینڈ کو دھلی
مغربی و جنوبی ہند: پیریس پکچرس بمبئی
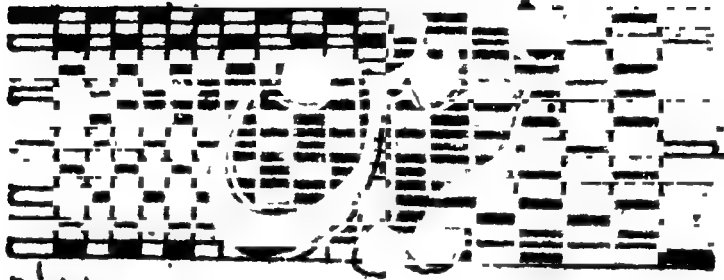
Regt. No.A-41.

CHEMICAL INDUSTRIAL & PHARMACEUTICAL LABORATORIES LTD BOMBAY-8